

سنہری سانپ

PDFBOOKSFREE.PK

1

اقبال کاظمی

وہ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔

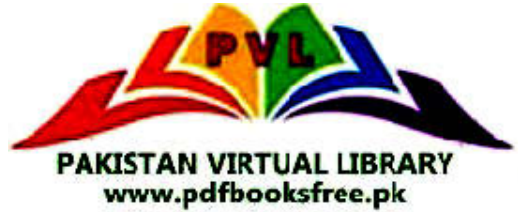
ٹرین جا چکی تھی۔ اس کی عقیبی سرخ جی بھی تارکی میں محسوس ہوتی جا رہی تھی۔ ٹایپ پلٹ فارم پر کھڑی متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس ویران ریلوے اسٹیشن پر صرف ایک آدمی ٹرین سے اڑا تھا۔ وہ کوئی ادیب عمر و زمانہ تھا جو ٹرین کے روانہ ہو جانے کے بعد ریل کی پٹریاں پار کر کے اسٹیشن کے دوسری طرف کیمپوں میں ایک جگہ بٹری پر جا چکا تھا۔ اس طرف بہت دور دینے کی طرح ٹھٹھائی ہوئی ایک بہت مدہم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ شاید وہی اس مسافر کی منزل تھی۔

ٹایپ مڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس جھوٹے ریلوے اسٹیشن پر دن میں صرف دو ٹرینیں رکا کرتی تھیں۔ ایک صبح آٹھ بجے اور دوسری شام چھ بجے اور دونوں ٹرینیں اکثر اپنے شیڈول سے لیت ہوا کرتی تھیں۔ اس ٹرین کو شام چھ بجے یہاں پہنچا تھا لیکن حسب معمول تاخیر سے آئی تھی اور خلاف معمول پانچ گھنٹے لیت ہوئی تھی اور اس ٹرین کا اتنی تاخیر سے پہنچنا ٹایپ کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا تھا۔

یہ ریلوے اسٹیشن چند سال پہلے معرض وجود میں آیا تھا۔ زمین ہموار کر کے پلٹ فارم بنا دیا گیا تھا۔ دونوں سروں پر اسٹیشن کے نام کے ٹکریٹ کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ پلٹ فارم پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پکائین کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ایک دو درختوں کے نیچے مسافروں کے بیٹھنے کے لیے ٹکریٹ کے بچ بھی رکھے ہوئے تھے جو اب بڑی حد تک نوٹ بھٹ پکے تھے لیکن انہیں تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔

پورے پلٹ فارم پر صرف چار لیپ پوسٹ تھے۔ ایک ایک پلٹ فارم کے دونوں سروں پر اور دو وسط میں ایک دوسرے سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر۔ پلٹ فارم کے کناروں والے دونوں اور درمیان میں صرف ایک لیپ پوسٹ پر جی جل رہی تھی۔ ملی

معیاری اور خوبصورت کتابیں
با اہتمام: محمد علی قریشی



جملہ حقوق محفوظ ہیں

مطبع ————— نیر اسد پریس لاہور

سرورق ————— ذاکر

کپڑے ————— نوید بٹ

قیمت ————— 175/- روپے

عمل سیٹ ————— 350/- روپے

وہ چند منٹ سنانا پلٹ فارم پر کھڑی رہی، پھر اپنا ہریف کیس اٹھا کر اسٹیشن کی عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔ وہیں سے باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ ابھی وہ مسافر خانے والے گیٹ کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اسٹیشن ماسٹر والے کمرے سے ایک آدمی برآمد ہوا۔ اس نے چمکدار کپڑے کی دھوئی باندھ رکھی تھی اور سفید بنیان پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں لائین تھی۔ اس شخص کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ ہماری بھرمار دہانے قد کا آدمی تھا۔ ساقوں رنگت اور جسمی مومچیں۔

غایب اس شخص کو دیکھ کر ڈرگمی جبکہ وہ آدمی اسے دیکھ کر ٹھک گیا تھا۔ اس نے غافلانہ غایب کوئین سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔
 ”بی بی۔ آپ ٹرین سے اتری ہیں!“ وہ غایب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بات جاری رکھی۔ ”میں یہاں کا اسٹیشن ماسٹر ہوں، عبدالغنی۔ کہاں جانا ہے آپ کو؟“

”حیر آباد۔“ غایب نے کہتے ہوئے اس شخص کی طرف دیکھا۔ وہ اسٹیشن ماسٹر کے بجائے کوئی بھائی ہی لگتا تھا۔ غایب نے سر جھک دیا۔ برانچ لائنوں کے اسٹیشن ماسٹر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ سو سال سے سال میں ایک آدھ بار کبھی اعلیٰ افسران کے انکسپشن کے موقع پر اسٹیشن ماسٹر وری پن لیتے ہوئے عام حالات میں تو اسی جگہ میں رہتے ہوں گے۔
 ”حیر آباد۔“ اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی بیڑیا۔ ”لیکن حیر آباد تو تقریباً تین کوس کے فاصلے پر ہے اور کوئی آپ کو لینے کے لیے بھی نہیں آیا۔“

”کوئی سواری نہیں مل سکے گی؟ میرا مطلب ہے کوئی ٹانگہ وغیرہ۔“ غایب نے کہا۔
 ”ایک دو آٹنگے ٹرین کے وقت تو یہاں ہوتے ہیں بی بی۔ آج چونکہ ٹرین لیٹ تھی، اس لیے آٹنگے والوں نے بھی انتظار نہیں کیا۔ دے دیے کیا آپ نے اپنے عزیزوں کو اپنے آنے کی پہلے سے اطلاع نہیں دی تھی؟ کسی کو تو یہاں آنا چاہئے تھا آپ کو لینے کے لیے۔“ عبدالغنی کہتے ہوئے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگے۔ غایب نے اس وقت جینز اور جیکے نیلے رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔

”میں نے ایک ہفتہ پہلے خط تو لکھ دیا تھا۔“ غایب نے جواب دیا۔ ”پتہ نہیں وہ خط انہیں ملا ہے یا نہیں۔ اگر خط مل گیا تھا تو کسی نے کسی کو واقعی آنا چاہئے تھا۔“

کے ٹیل کے دیئے تھے جو ان لیپ پوسٹوں پر لگے ہوئے شیشے کے ڈبوں میں رکھے ہوئے تھے۔ ان کی روشنی بھی چند نکت ہی محدود تھی۔

پلٹ فارم کے درمیان میں ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہوئی تھی جس کے ساتھ ایک وسیع برآمدہ بھی تھا۔ یہی برآمدہ مسافر خانہ تھا۔ پلٹ فارم پر آمد و رفت کے لیے کھڑی کے تختوں کا ایک چھوٹا سا گیٹ لگا ہوا تھا۔ برآمدے کی ایک دیوار پر ریلوے ٹائم ٹیبل اور دوسری دیوار پر کرایہ نامہ لکھا ہوا تھا۔ اس کرائے نامے کے ساتھ ہی بنگلہ دیوڑو تھی جس کے اوپر کٹ گھر لکھا ہوا تھا۔

اس عمارت کا دوسرا حصہ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر اور اسٹور وغیرہ پر مشتمل تھا۔ صرف دو کمرے تھے۔ ایک اسٹیشن ماسٹر کا دفتر اور دوسرا اسٹور۔ ان دونوں کمروں کے دروازے پلٹ فارم کی طرف تھے۔ اسٹور والے کمرے کے سامنے ایک چار فٹ اونچا چوتھو ہٹا ہوا تھا جس پر مشعل آپہنٹ کرنے والے لیورز لگے ہوئے تھے۔

اسٹیشن ماسٹر والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے کمرے کے اندر چلنے والی لائین کی مدد سے روشنی نظر آ رہی تھی۔

غایب اس سنانا پلٹ فارم پر کھڑی متوجس لگا ہوں سے اوپر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایک انہماک سا خوف بھی اس کے اعصاب پر طاری ہو رہا تھا۔ اب وہ سمجھتا رہی تھی کہ اس ٹرین سے کیوں آئی تھی لیکن اس میں اس کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ ٹرین ہی لیٹ ہو گئی تھی تو وہ کیا کرتی۔ راستے میں انجن خراب ہو گیا تھا اور ٹرین پانچ گھنٹوں تک دیرانے میں کھڑی رہی تھی۔ ان برانچ لائنوں پر اب بھی ایک صدی پرانے اسٹیم انجن چل رہے تھے جو سڑک کے ددراں اسی طرح خراب ہوتے رہتے تھے اور پریشانی مسافروں کو ہوتی تھی لیکن ریلوے حکام کو اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔

حیر آباد نامی گاؤں اس ریلوے اسٹیشن سے تقریباً تین کوس دور تھا جہاں غایب کو جانا تھا۔ اس نے کئی روز پہلے خط کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع دیدی تھی اور اسے یقین تھا کہ اسے لینے کے لیے کوئی نہ کوئی ضرور آیا ہوگا لیکن اپنے استہمال کے لیے کسی کو نہ پا کر اسے بڑی پاموسی ہوئی تھی۔ گاؤں تک پہنچنے کے لیے اس دیرانے میں کسی سواری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

یہ مختصر سامعین تھا جس کے آگے انگریزی کے حرف اہل شیعہ کا برآمدہ تھا۔ اس برآمدے میں ایک کمرہ ایک طرف تھا اور دو دوسری طرف۔ ان دو میں سے ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور اندر سے لائٹیں یا لیمپ کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ عبدالغنی برآمدے میں اس طرف آ گیا جہاں ایک ہی کمرہ تھا۔ اس نے باہر سے کنڈا ہٹا کر دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی لائٹیں کرے میں پڑی ہوئی ایک چھوٹی میز پر رکھ دی۔

”آؤ بی بی اندر آ جاؤ۔“ اس نے غائب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
غائب سمجھتی ہوئی اندر آ گئی۔ ”آپ کی تنگ کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”میں پہلے ان سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”دراصل میری تنگ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اس وقت سو رہی ہیں۔ میں آپ کو اس سے ملوا دوں گا لیکن پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے کچھ کھایا ہے یا نہیں؟ میرا خیال ہے نین میں تو آپ کو کچھ نہیں ملا ہوگا۔“ عبدالغنی بولا۔

غائب کو بھوک تو لگ رہی تھی لیکن وہ پہلے یہ اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ اس کمرہ میں واقعی کوئی عورت ہے بھی یا یہ محض اسے دھوکے سے یہاں لے آیا ہے۔

”آپ کی تنگ۔۔۔ میرا مطلب ہے انہیں دھمت ہوگی۔“ غائب کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ یہ کمرہ ٹینک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دو تین کرسیاں اور ایک ریگیز کا پرانا سا صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا جس کا ریگیز کئی جگہوں سے ادھرا ہوا تھا۔

”وہ سو رہی ہے۔“ عبدالغنی نے کہا۔ ”میں اسے خود سے نہیں اٹھاؤں گا۔ وہ آوازیں سن کر خود ہی اٹھ جائے گی۔ میں دیکھتا ہوں باورچی خانے میں کچھ ہے یا نہیں۔ کھانے کو کچھ نہ ہوا تو چائے تو بنا ہی لوں گا۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں بی بی۔ یہاں آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

عبدالغنی کمرے سے نکل گیا۔ غائب کچھ دیر تک اپنی جگہ پر کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی، پھر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے اب اس محض پر شبہ ہونے لگا تھا۔ وہ اسے کہہ کر لایا تھا کہ گھر میں اس کی بیوی ”ودودہ“ ہے لیکن اب وہ بہانہ بنا کر اسے ٹال رہا تھا۔ غائب سوچ رہی تھی کہ اگر اس محض نے کسی قسم کی بدتمیزی کی کو کشش کی تو وہ اس کا ایسا مشرکے

”اس وقت تو بہر حال آپ ہیر آباد نہیں جا سکیں گی۔“ اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صبح آٹھ بجے ٹرین کے وقت ایک دو تانگے یہاں آجائیں گے۔ آپ چاہیں تو رات میرے کوارٹر میں گزار سکتی ہیں۔“

”آپ کا کوارٹر؟“ غائب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”میں ایک شریف آدمی ہوں۔“ اسٹیشن ماسٹر بولا۔ ”گھر میں میری بیوی موجود ہے۔ آپ کو پریشانی نہیں ہوگی۔“

غائب نے گردن ہٹا کر دائیں طرف دیکھا۔ اسٹیشن کی عمارت سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر چار پانچ کوارٹر نظر آ رہے تھے۔ ایک کوارٹر دوسرے ہوا تھا۔ اس کے آگے وسیع رتبے کو جھاڑیوں کی باڑھ سے گھیر لیا گیا۔ دوسرے کوارٹروں کے سامنے بھی اسی طرح جھاڑیوں کی باڑھ لگا کر محض بنائے گئے تھے۔ وہ دوسرے الگ تھلک پیدا کوارٹر غالباً اسٹیشن ماسٹر کا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ آئیے، میرے ساتھ چلیے۔“ اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔
غائب نے ایک لمحہ کو کچھ سوچا اور پھر اس کے ساتھ چل پڑی۔ اس کی دیکھش قبول کر لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ رات بھر یہاں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی اور نہ ہی آدھی رات کو دیر سے اسے اکیلا اتنی دور جا سکتی تھی۔

اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی اس سے دو قدم آگے چل رہا تھا۔ غائب چلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ٹیلی سی جانسی میں ادھر گرد کا جھول پڑا پر اسرار لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے اسٹیشن ماسٹر کے گھر میں شب بھری کی دیکھش قبول تو کر لی ہے لیکن کوئی گزبوند ہو جائے۔

باڑھ کے راستے سے گزر کر عبدالغنی کوارٹر کے دروازے کے سامنے رک گیا اور مڑ کر غائب کی طرف دیکھنے لگا جو بریف کیس ہاتھ میں جھلاتی ہوئی اپنے تلے قدم اٹھاتی ہوئی آ رہی تھی۔

دروازے کے باہر ذخیرہ والا کنڈا لگا ہوا تھا۔ عبدالغنی نے کنڈا کھینچ کر دروازہ کھول دیا اور غائب کو اندر داخل ہونے کے لیے راستہ دیا۔ غائب سمجھتی ہوئی اندر آ گئی۔ عبدالغنی نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈا لگایا تو غائب کے دل کی دھڑکن میز ہو گئی۔

وہ دونوں اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آگئے۔ چاہنائی پر ایک عورت لیٹی ہوئی تھی جس نے پورے جسم پر سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اوپر سرخ رنگ کا دھندلا اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ بھی پوری طرح چھپ گیا تھا۔

”راشدہ۔“ عبدالغنی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ خاتون پیر آباد جانے کے لیے نہیں سے اتری تھی۔ اسے لینے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ مبینہ پانچ گھنٹے لیٹ تھی۔ ہو سکتا ہے کوئی آکر دائیں چلا گیا ہو۔ بھاری اکیلی ہے۔ مسافر خانے میں کیسے بیٹھی رہتی؟ میں اسے گھر لے آیا ہوں۔ رات یہاں گزار کر صبح واپس چلی جائے گی۔“

”چھانچا کیا تم نے۔“ راشدہ نے جواب دیا۔ اس کی آواز خراہٹ سے ملتی جلتی تھی اور وہ غالباً دوپٹے میں سے راشدہ کو دیکھ بھی رہی تھی۔ ”اے جوان اور خوبصورت عورت کا رات کو گھر سے باہر رہنا مناسب نہیں ہے۔ بیٹھو لی۔ بی۔ تم کڑی کیوں ہو؟“

غائب چاہنائی کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”میں اسٹیشن پر کسی کو نہ پا کر واقعی پریٹن ہو گئی تھی۔“ وہ راشدہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے سینڈوئچ نکال آئی ہیں۔ یہ.....“

”پیر آباد میں کس کے گھر جانا ہے لی بی؟“ راشدہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”چودھری امانت علی کے گھر۔“ غائب نے جواب دیا۔

”اوہ۔“ راشدہ بولی۔ ”چاکیردار سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ اس کی رشتہ دار ہو یا دیے ہی جاگیر کی سر کرنے آئی ہو؟“

”میں چودھری امانت علی کی بہو ہوں۔“ غائب نے جواب دیا۔ ”میرے شوہر کو دو سال پہلے چاکیر پر ہی قتل کر دیا گیا تھا، میں ان دنوں شرم میں تھی۔ شوہر کے قتل کے بعد سرسرا نہیں آئی کیونکہ فوراً ہی جائیداد کا بھڑا شروع ہو گیا تھا۔ اب چودھری امانت علی نے پیغام بھیج کر مجھے بلوایا ہے۔ بھڑے کا تفتیشی کرنے کے لیے، کچھ بڑے لوگ بیچ میں پڑے ہیں۔ میں نے آنے سے پہلے ایک ہفتہ پہلے خط دیا تھا لیکن کوئی مجھے لینے کے لیے آیا نہیں۔“

”تم نے اکیلے یہاں آکر بہت بڑا رسک لیا ہے۔“ راشدہ نے کہا۔ ”میں بھی پیر آباد کی رہنے والی ہوں۔ مجھے چودھری امانت علی کے بیٹے سرفراز چودھری کی پسند کی شادی اس

کی کہ زندگی بھر یاد کرے گا۔ اس نے مارشل آرٹس میں تھوڑا ڈان کی ڈگری حاصل کر رکھی تھی۔ ایک مرتبہ پہلے بھی یہ جہلی فن اس کے کام آگیا تھا اور شاید اب بھر ہاتھ چیر جائے کی ضرورت پڑ جائے۔

باورچی خانہ غالباً صحن میں کسی طرف تھا۔ برتنوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غائب مختار انداز میں کرسی پر بیٹھ کھلے ہوئے دروازے سے باہر دیکھتی رہی۔ تقریباً آٹھ گھنٹے بعد عبدالغنی اندر داخل ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چائے کے کپ اٹھا رکھے تھے۔

”معاف کرنا لی بی۔“ وہ دونوں کپ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”کھانے کو تو کچھ نہیں تھا، میں نے چائے بنا لی ہے۔ دراصل میری بیوی کچھ عرصہ سے بیمار ہے۔ دن میں تو کھانا وغیرہ پوائنٹ میں کی بیوی پکا دیتی ہے اور گھر کے دوسرے کام بھی کر دیتی ہے۔ اس وقت میں نے اسے بلانا مناسب نہیں سمجھا۔ آپ چائے پیچھے۔“

ایک کپ عبدالغنی نے خود اٹھا لیا اور چشیاں لینے لگا۔ چائے پیتے ہوئے اس کے منہ سے سرسری آوازیں نکل رہی تھیں جو غائب کو بہت ناگوار گزر رہی تھیں۔ اس نے بھی اپنا کپ اٹھا لیا اور ہلکی ہلکی چشیاں لینے لگی۔

”آپ کی بیگم کو کیا تکلیف ہے؟“ غائب نے اخلافا پوچھا۔

”میان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آپ دیکھیں گی تو خود ہی سمجھ لیں گی۔“ عبدالغنی نے جواب دیا اور چائے پیتا رہا۔

”غنی.....“ دوسرے کمرے سے ایک مدھم سی نسوانی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟ تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

”ایک مسلمان ہے راشدہ۔“ عبدالغنی نے دروازے کی طرف رخ کر کے جواب دیا۔

”ابھی آ رہا ہوں۔“

غائب کو اطمینان سا ہوا کہ گھر میں کوئی عورت موجود تو ہے۔ اب وہ آرام سے چائے پیتے لگی۔ بالآخر اس نے کپ خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ عبدالغنی بھی چائے پی چکا تھا۔ وہ کپ میز پر رکھتے ہوئے اٹھ گیا۔

”آئیے۔ آپ کو اپنی بیوی راشدہ سے ملاؤں۔“

سعادت علی نے اس کا خرچہ بھی بند کر دیا اور بنگہ بھی خالی کرنے کا حکم دے دیا مگر سرفراز چودھری نے بنگہ خالی نہیں کیا۔

ایک موقع پر سرفراز چودھری کی ماں نے بھی شر آکر ٹایاب کو دھکیلا تھا۔ پہلے تو وہ اسے لالچ دینے کی کوشش کرتی رہی کہ دس مہینے لاکھ لے کر اس کے بیٹے سے الگ ہو جائے مگر جب ٹایاب اس کی باتوں میں نہیں آئی تو وہ دھمکیوں پر اتاری تھی۔

آنتہ بی بی رواجی جاگیر والی تھی۔ وہ بھی دولت کی پکارن تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی شادی شاہ پور کے زمیندار کی بیٹی سے کرنا چاہتی تھی جو رشتے میں اس کا بھائی بھی تھا اور جیز میں کم از کم تین سو مہرے زرعی اراضی ملے گی امید تھی جبکہ ٹایاب کا باپ گریڈ اٹھارہ کا ایک سرکاری آفیسر تھا۔ وہ شاہ پور کے زمیندار کے مقابلے میں بھلا بیٹی کو کیا دے سکتا تھا۔ چودھری امانت علی اور اس کے خاندان نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا مگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

دو سال پہلے سرفراز چودھری گاؤں گیا تھا۔ وہ تو ٹایاب کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ سرفراز اکیلا چلا گیا اور پھر تیسرے ہی دن اس کی موت کی خبر آئی۔ اس روز وہ شہر واپس آنے کے لیے صوبہ سرحد کے گاؤں سے نکلا تھا۔ وہ تانگے پر سوار تھا۔ ایک عورت اور دو آدمی اور بھی تھے جو شہر جانے کے لیے اسٹیشن جا رہے تھے۔ کھیتوں میں اچانک ہی چند آدمیوں نے تانگے کو گھیر لیا۔ وہ سب ڈھانے باندھے ہوئے تھے اور غالباً پہلے ہی سے گمات لگائے کھیتوں میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ سب لاشیوں اور ڈنڈوں سے مسلح تھے۔ تانگے والا اور دوسرے یہ سمجھ کر ڈاؤں گئے۔ وہ سب خوف سے چپخنے لگے۔ ان کا غلبہ پوشوں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ دو آدمیوں نے سرفراز چودھری کو کھینچ کر تانگے سے اتار لیا۔ سرفراز چودھری صورتحال کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ غلبہ پوشوں نے اس پر لاشیوں اور ڈنڈوں سے حملہ کر دیا۔ سرفراز چودھری نے ایک موقع پر بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ حملہ آوروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس پر لاشیاں برساتے رہے۔

حملہ آور غلبہ پوش سرفراز چودھری پر اس دقت تک لاشیاں برساتے رہے تھے جب تک انہیں اس کے قتل ہونے کا یقین نہیں ہو گیا تھا اور پھر وہ کھیتوں میں بھاگ گئے۔

کے بعد شروع ہونے والے جھڑوے اور پھر سرفراز چودھری کے قتل کے واقعہ کا بھی علم ہے۔ جاگیرداروں اور راجپوتوں میں کوئی شخص اپنی موت نہیں مرتا۔ دولت بہت بڑی چیز ہے۔ دن 'زر اور زمین بیش سود کی چیز ہے۔ جن کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں، انہیں دولت کی بوس زیادہ ہے۔ کبھی زمین کی خاطر قتل ہوتے ہیں اور کبھی کوئی عورت کسی کی بیویاں موت کا باعث بنتی ہے۔ سرفراز چودھری کے قتل کے بارے میں بھی کچھ ایسی ہی متضاد باتیں سنی تھیں۔ کوئی کہتا ہے کسی مخالف زمیندار نے پرانی دشمنی کی بنا پر اسے قتل کر دیا تھا اور کسی سے یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ اسے بڑے بھائی نے مروایا تھا تاکہ جاگیر کا بٹوارہ نہ ہو۔ ان سب کو سرفراز چودھری کی ہند کی شادی پر اعتراض تھا۔ تم غائب شادی کے بعد صرف ایک ہفتہ گاؤں میں رہی ہو۔ میں نے تمہیں دیکھا تو نہیں تھا لیکن تمہارے حسن کی بہت تعریفیں سنی تھیں۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ تم عورت میں اہرا ہو۔"

ٹایاب خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ راشدہ ٹھیک کمر رہی تھی۔ تقریباً چار سال پہلے سرفراز چودھری سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ سرفراز چودھری تعلیم کے سلسلے میں شہر میں رہائش پذیر تھا۔ ان دنوں کی ملاقات پونیورسٹی میں ہوئی تھی اور سرفراز چودھری نے اپنے والدین کی رضامندی کے بغیر اس سے شادی کر لی تھی۔ وہ جنب ٹایاب کو پہلی مرتبہ پڑاؤ لے کر آیا تھا تو ٹھیک خاک ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ ٹایاب ایک ہفتہ سے زیادہ گاؤں میں نہیں نک سکی تھی۔

شہر میں بھی چودھری امانت علی کے دو عائیشان بیٹھے تھے جن میں سے ایک میں سرفراز چودھری رہائش پذیر تھا۔ وہ شادی کے بعد ٹایاب کو بھی اس بیٹے میں لے آیا تھا۔ سرفراز چودھری پر اپنے والدین کی طرف سے مسلسل یہ دباؤ پڑتا رہا کہ وہ ٹایاب کو طلاق دے دے لیکن وہ کسی دباؤ میں نہیں آیا۔ باپ نے اسے جائیداد سے عاق کر دینے کی دھمکی بھی دی مگر سرفراز چودھری اس دھمکی سے بھی مرعوب نہیں ہوا۔ اس کا بڑا بھائی چودھری سعادت علی کچھ زیادہ ہی بھرا ہوا تھا۔ اس نے تو پورے خاندان میں سرفراز چودھری کے خلاف بائیکاٹ کی باقاعدہ مہم چلا رکھی تھی۔ اسی کے اکسانے پر کئی قریبی رشتہ داروں نے سرفراز چودھری سے تعلقات منقطع کر لیے تھے لیکن سرفراز نے کبھی اس کی پروا نہیں کی تھی۔

چمپے لے کر پیدل ہوتے تھے اور اب اس سے سب کچھ جھینا جا رہا تھا۔ خرچ ملتا بند ہو گیا تو اس نے معمولی سی چٹخوہ پر نوکری کر لی۔ ثایاب کے والد نے ان کی مالی مدد کرنا چاہتی تھی مگر سرفراز چودھری نے کوئی مدد لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

ثایاب کو سرفراز چودھری کی محبت پر فخر تھا تو اس پر ترس بھی آتا تھا۔ ایک موقع پر اس نے سرفراز سے کہا بھی تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر اپنے والدین کی بات مان لے۔ اس پر سرفراز نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا کہ آئندہ وہ ایسی کوئی بات نہ کرے۔

ثایاب کو وہ تھپڑ بھی یاد تھا اور یہ بھی یاد تھا کہ تھپڑ مارنے کے بعد سرفراز اس سے لپٹ کر رکتا رویا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ سکتا ہے مگر اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ثایاب کو سرفراز چودھری کی دولت کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ اس کی محبت ہی اس کے لیے سب سے بڑی دولت تھی مگر دولت نے سرفراز کی جان لے لی تھی اور جب اس کی موت کے صرف دو ہفتے بعد سعادت علی نے ثایاب کو دھمکیاں دیں اور ایک ہفتے کے اندر اندر بگلہ خالی کر دینے کو کہا تو اس نے بھی صورتحال کے سامنے ڈٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ سرفراز چودھری کی بیوہ تھی۔ سرفراز کا اپنے باپ کی جاکیر میں اتنا ہی حصہ تھا جتنا اس کے بڑے بھائی سعادت علی کا ہو سکتا تھا۔ سرفراز چودھری کی بیوہ کی حیثیت سے قانونی طور پر وہ اس حصے کی حقدار تھی۔

سعادت علی کے جانے کے دوسرے ہی روز اس نے اپنے والد سے مشورہ کیا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ پہلے تو اسے سرفراز چودھری کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن سعادت علی کی مکمل دھمکی کے بعد وہ صورتحال کا مقابلہ کرے گی اور کسی بھی صورت میں اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوگی۔

ثایاب کا والد احمد نواز گریڈ اٹھارہ کا سرکاری آفیسر تھا۔ اس محکمہ میں رشت اور ناجائز کمائی کے ذرائع تو قیامت تھے لیکن وہ زندگی بھر اس لذت سے دور ہی رہا تھا۔ البتہ اس کے تعلقات خاصے اوپر تک تھے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ چودھری امانت علی جیسے جاگیردار سے کیر لینا آسان نہیں ہوگا۔ وہ جاگیردار تھا اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس کے پاس اور بھی ذرائع تھے جن سے وہ انہیں پریشان کر سکتا تھا لیکن وہ اپنی بیٹی

سرفراز چودھری کے بھائی سعادت علی نے دوسرے گاؤں میں رہنے والے اپنے ایک مخالف زمیندار اکرام اللہ کے خلاف قتل کی رپورٹ لکھوا دی۔ ان میں پہلے ہی سے زمینوں کے تنازعہ پر مقدمے بازی چل رہی تھی۔

پھر آباد کے لوگ اکرام اللہ اور چودھری امانت علی کی مقدمے بازی سے واقف تھے اور وہ چودھری امانت علی کے گھمبیر جھگڑوں کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ تمام گاؤں والے اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ سرفراز چودھری کی پسند کی شادی کے بعد اس خاندان میں کس طرح پھوٹ پڑ گئی تھی اور سرفراز چودھری کو کیسی کیسی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ بعض لوگ دلی زبان میں یہ تو کہتے تھے کہ سعادت علی نے اپنے بھائی کو مروایا ہے مگر کھل کر بات کرنے کا حوصلہ کسی میں نہیں تھا۔ پولیس مفروضوں پر قتل کی تحقیقات کرتی رہی اور قاتلوں کا آج تک پتہ نہیں چل سکا تھا۔

سرفراز چودھری کی موت کے دو ہفتے بعد سعادت علی شری پنج گیا۔ ثایاب اسی ہنگامے میں معیم تھی۔ سعادت علی نے اسے ایک بار پھر ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی اور ایک ہفتے کے اندر اندر وہ بگلہ خالی کر دینے کو کہا۔

شوہر کی موت سے ثایاب کے تو ابھی آنسو بھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ اپنے سرسرا والوں سے پہلے ہی تالاں تھی۔ اس کے خیال میں اس کے شوہر کی موت کے ذمے دار سعادت علی اور اس کا باپ چودھری امانت علی تھے اور اب چودھری سعادت علی کی دھمکی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ ایسی دھمکیوں سے نہ تو پہلے ڈری تھی اور نہ اب خوفزدہ ہوئی تھی۔

ثایاب نے دولت کے لالچ میں سرفراز چودھری سے شادی نہیں کی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور اسی چاہت میں ایک ہوئے تھے۔ اسے شادی سے پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ سرسرا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی اور شادی کے بعد تو صورتحال مکمل کر سامنے آگئی تھی۔ سرفراز کے والدین ہی اس کے دشمن ہو گئے تھے۔ اسے طرح طرح سے تنگ کیا جا رہا تھا اور جائیداد سے عالق کر دینے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔

سرفراز چودھری کا شمار ایسے لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو بتل مٹھے منہ میں سونے کا

اور آدمی کو بھی ساتھ لے جائے لیکن ٹایاب اکیلی جانے پر ہند رہی تھی۔ اس سے پہلے کچھ بڑے لوگ بیچ میں پڑ چکے تھے۔ اس لیے ٹایاب کو توقع تھی کہ چودھری امانت علی یا اس کا بڑا بیٹا سعادت علی اسے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کریں گے۔

اس نے اگرچہ ایک ہفتہ پہلے چودھری امانت علی کو خط لکھ دیا تھا کہ وہ کب آ رہی ہے لیکن اسے لینے کے لیے کوئی بھی اسٹیشن پر نہیں پہنچا تھا اور اب وہ اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی کے گھر میں بیٹھی اس کی بیوی راشدہ سے باتیں کر رہی تھی۔

راشدہ بھی حیر آبادی کی رہنے والی تھی اور چودھری خاندان کے اس بھڑے سے واقف تھی اور وہ بڑے غلوں سے اسے محتاط رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے آپ چودھری فیملی کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔“ ٹایاب نے کہا۔

”میں ہی کیا“ حیر آباد کا ہر باسی ان کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔“ راشدہ نے جواب دیا۔ ”امانت علی کا چھوٹا بیٹا سرفراز چودھری بہت اچھا آدمی تھا۔ اپنے گھروالوں سے بالکل مختلف مگر سعادت علی..... اس کے اندر تو شیطان کی روح بھرا کیے ہوئے ہے۔ وہ حیر آباد کے کسی گھر اجاڑ چکا ہے۔ کئی لڑکیوں نے اس کے ہاتھوں رسوا ہو کر خودکشی کر لی۔ کسی نے گلے میں پھندا ڈال کر جان دیدی اور کسی نے کنوئیں میں پھلانگ دے دی مگر کوئی اس شیطان کو روکنے والا نہیں۔ ان کے پاس پیسہ ہے۔ پولیس ان کی ذر غریہ ہے۔ کئی مرتبہ پولیس حیر آباد آئی مگر مظلوموں کی داد دے دینے کی بجائے انہی کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔ بہت ظالم ہیں یہ لوگ۔“

”میں ان سے اچھی طرح واقف ہو چکی ہوں۔“ ٹایاب نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”انہوں نے دوسروں پر ظلم اس لیے کیا کہ لوگ خاموشی سے ظلم سہتے رہے۔ کسی نے ان کا ہاتھ نہیں روکا۔ انہوں نے تو مجھے بھی بو تسلیم کرنے کے بجائے میرے ساتھ دروایتی بھٹکڑے استعمال کرنے کی کوشش کی مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اگر میں بھی دوسروں کی طرح ڈر جاتی تو میرا بھی وہی مشر ہوتا جو دوسروں کا ہوتا رہا ہے لیکن اب یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی ہے کہ کوئی ان کے راستے کی رکاوٹ بھی بن سکتی ہے۔“

”حیر آباد کے لوگ اسٹیشن پر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان سے حالات کا کچھ پتہ چلا

کی ضد سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے اگر فیصلہ کر لیا تھا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے یہ فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

اسے نواز جس عکس میں تھا وہاں اس نے کیا تو کچھ نہیں تھا البتہ کچھ لوگوں سے اچھے تعلقات ضرور بنائے تھے۔ اس نے اپنے چند دوستوں سے مشورے کئے۔ قانونی رائے بھی لی اور بالآخر ایک بہت بڑے وکیل کے توسط سے ٹایاب کی طرف سے چودھری امانت علی کو ایک یگل نوٹس بھجوا دیا جو بالآخر ایک مقدمے کی بنیاد بنا۔

دو سال سے مقدمہ چل رہا تھا۔ شروع میں چودھری امانت علی نے کہا تھا کہ وہ چنگی بھانے ہی اس مقدمے کا فیصلہ اپنے حق میں کرالے گا اور ٹایاب کو اپنے بیروں پر ناک رکھنے پر مجبور کر دے گا مگر نہ تو اس کی چنگی بیچ سکی اور نہ ہی وہ ٹایاب کو ناک رکھنے پر مجبور کر سکا۔

چودھری امانت علی اس مقدمے پر دیرپہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ دوسری طرف احمد نواز کے تعلقات کام کر رہے تھے۔ چودھری امانت علی کے لیے آئے دن نئی نئی ابھینیں پیدا ہو رہی تھیں۔ کبھی بلوں کی عدم ادائیگی کی بنا پر اس کی اراضی پر ٹیوب ویلن کی بجلی کاٹ دی جاتی، کبھی نیری پانی کا کوئی بھڑا کھڑا ہو جاتا اور کبھی اراضی کی اس کے باپ واداکے زمانے کی حد بندی کا کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ تقریباً پچاس ساٹھ برس پہلے چودھری امانت علی کے باپ نے عکس کے اہلکاروں کو پیسہ کھلا کر تقریباً چار مربع سرکاری زمین اپنی اراضی میں شامل کر لی تھی اور اب عکس کی طرف سے بھی وہ سرکاری زمین واپس کرانے کے لیے ایک مقدمہ بن گیا تھا۔

ہر روز پیدا ہونے والی نئی نئی پیچیدگیوں سے چودھری امانت علی کے چودہ طبقے روشن ہو گئے۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ ٹایاب کو اپنے بیروں پر ناک رکھنے پر مجبور کر دے گا لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اگر صورتحال یہی رہی تو خود اسے ٹایاب کے بیروں پر ناک رکھنی پڑے گی۔ بالآخر اس نے ٹایاب کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ اگر وہ اپنا کیس واپس لے لے اور اس کے خلاف دیگر کارروائیاں بند کر دی جائیں تو یہ فیض شراٹکے کے تحت سرفراز چودھری کا حصہ اسے دینے کو تیار ہے اور ٹایاب وہی شراٹکے لے کرے حیر آباد جا رہی تھی۔

ٹایاب کے والد اور دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ وہ اکیلا نہ جائے۔ اپنے وکیل اور کسی

راشدہ کو دیکھ کر ٹایاب کا چرو خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کا دل خزاں رسیدہ ہے۔
طرح کاٹ رہا تھا۔

”یہ۔۔۔۔۔“ ٹایاب ہکلا کر رہ گئی۔

عبدالغنی کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ باہر سے ایک آواز سنائی دی۔ کوئی آدمی اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔

”عبدالغنی۔۔۔۔۔ او یاؤ عبدالغنی۔۔۔۔۔“

”کون ہے بھئی۔۔۔۔۔ ابھی آتا ہوں۔“ عبدالغنی نے دروازے کی طرف رخ کر کے جواب دیا اور راشدہ کے جسم پر چادر اور چہرے پر دوشہ ڈال دیا اور ٹایاب کی طرف دیکھا ہوا باہر نکل گیا۔

اسی وقت ٹایاب کو گھوڑے کی ہنساہٹ کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

عبدالغنی صحن والا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔

”کون تھا عبدالغنی؟“ راشدہ نے پوچھا۔

”چودھری امانت علی کے آدمی تھے۔“ عبدالغنی نے جواب دیا۔ ”پوچھ رہے تھے زمین سے کوئی زناہ سواری تو نہیں اتری تھی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ وہ لوگ مجھے لینے کے لیے آئے ہوں گے۔“ ٹایاب جلدی سے بولی۔ ”انہیں پتہ چل گیا ہو گا کہ زمین آگنی ہے۔ انہیں روکیے عبدالغنی صاحب!“

”وہ لوگ جا چکے ہیں۔“ عبدالغنی نے جواب دیا۔ ”میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ آج اس زمین سے کوئی سواری اتری ہی نہیں۔“

”آپ نے یہ کیوں کہہ دیا؟“ ٹایاب نے اسے گھورا۔ ”کمال ہے۔ وہ لوگ مجھے لینے کے لیے آئے اور آپ نے جھوٹ بول کر انہیں واپس کر دیا۔“

”بھئی بھئی جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔“ عبدالغنی نے جواب دیا۔ ”ان کے ارادے نیک نہیں تھے ٹایاب بی بی! اگر وہ ہمیں لینے کے آئے ہوتے تو تانگے یا بکے پر آتے۔ وہ دونوں آدمی گھوڑوں پر تھے۔ جس انداز اور لمبے میں وہ مجھ سے سوال کر رہے تھے اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ بہر حال تم ابھی اپنے منہ سے آواز مت

رہتا ہے۔“ راشدہ نے کہا۔ ”منا ہے تم اپنا مقدمہ واپس لے رہی ہو؟“

”ابھی نہیں۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”جب تک تمام معاملات طے نہیں ہو جاتے میں اپنا مقدمہ واپس نہیں لے سکتی۔“

”خدا حمیس سرخرو کرے۔ ہمیں دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ راشدہ نے کہا۔ ”چودھری سعادت علی کو کسی عورت کے قدموں میں گر کر گزرتا دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی۔“

”آپ ایک دن یہ بھی دیکھ لیں گی۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”خیر۔ چھوڑے ان باتوں کو۔ آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ کیا عارضہ ہے آپ کو اور آپ نے چہرے پر دوشہ کیوں ڈال رکھا ہے؟“

”تمہاری وجہ سے۔“ راشدہ نے جواب دیا۔ ”مجھے دراصل پائیچا ہے۔ منہ سے بو آتی ہے۔ کوئی میرے قریب بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ اس لیے منہ پر دوشہ ڈال رکھا ہے۔“

”لیکن میں اپنی انجائی ہمدرد کی صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ عبدالغنی اس وقت کمرے میں نہیں تھا۔ ٹایاب نے راشدہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے چہرے سے دوشہ ہٹا دیا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھنے کے ساتھ ہی وہ بری طرح چبھا اٹھی۔

بست بھیاک چرو تھا راشدہ کا۔۔۔۔۔ جلا ہوا۔۔۔۔۔ پوری کھال جلی ہوئی تھی۔ دائیں آنکھ کا ڈبلا باہر لٹکا ہوا تھا۔ ناک کا آگے کا حصہ تدارد اوپر کا ہونٹ بھی غائب تھا اور دانت جڑوں تک نظر آ رہے تھے۔

ٹایاب نے اس کے جسم پر سے چادر بھی ہٹا دی۔ اس کی گردن اور پیٹے کا جو حصہ نظر آ رہا تھا وہ بھی جلا ہوا تھا۔ اس نے ذیلی وحالی سی قیض پن رکھی تھی۔ البتہ بازو نظر آ رہے تھے۔ انگلیوں سے لے کر اوپر تک بازو جملے ہوئے تھے۔ ایک بازو کی کھال کی بڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے بازوؤں کو حرکت نہیں دے سکتی تھی اور شاید اسی لیے جب ٹایاب نے اس کے چہرے سے دوشہ اتارا تھا تو وہ اس کا ہاتھ بھی نہیں روک سکی تھی۔

ٹایاب کی چبھ سن کر ایشیوں ماسٹر عبدالغنی دوڑ کر اندر آ گیا اور پھر صورتحال کو سمجھتے ہوئے اس کے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔

آئے بغیر واپس چلی جاؤ گی۔“

”میں واپس نہیں جاؤ گی۔“ ثایاب نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، تمہاری مرضی۔“ عبدالغنی ہنسا سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ”اب میں

اشیش جا رہا ہوں۔ میری واپسی دو بجے کے بعد ہی ہوگی۔ میری عدم موجودگی میں اگر باہر کوئی آواز دے تو ہمیں چار گھنٹے یا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ راشدہ خود ہی جواب دے لے گی۔“

عبدالغنی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے حیز پر رکھی ہوئی لائین اور ثایاب کا بریف کیس اٹھایا۔ بریف کیس اس نے اٹھ کر لے لیا لاکر ثایاب کے حوالے کر دیا اور دوسری چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”تم یہاں سو جاؤ، ثایاب بی بی! میں اشیش سے واپس آکر بیشک میں سو جاؤں گا۔“

عبدالغنی چلا گیا۔ اس نے صحن والے دروازے کو باہر سے کڑا لگا دیا تھا۔ ثایاب کرسی پر بیٹھی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بیشک وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی جہاں دو تین نوٹی پھونی کرسیاں اور ایک پرانا سا موٹر تھا۔ اس کمرے کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ بان کی چارپائیاں۔ ایک چارپائی کے نیچے لوہے کا ایک پرانا سا ٹرک رکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کھوئی پر دو تین پرانے سے جوڑے گھجے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ کلاڑی کی ایک چھوٹی حیز پر دو آؤں کی دو بوتلیں، گم کیوں کے اسپرل اور چند اور چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ پانی سے بھرا ہوا سلور کا ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔

سانس والی دیوار کے کنارے پر بھی چند ایسی ہی چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ البتہ ان میں ایک ایسی چیز تھی جس نے ثایاب کی توجہ کھینچی۔ وہ فریم میں لگی ہوئی ایک تصویر تھی۔ ثایاب نے اٹھ کر وہ فریم اٹھا لیا۔ ایک مرد اور ایک عورت کی تصویر تھی۔ عورت بے حد حسین تھی اور مرد بھی بڑا اسارت تھا۔

”یہ کس کی تصویر ہے؟“ ثایاب نے راشدہ سے پوچھا۔

”میری اور عبدالغنی کی۔“ راشدہ نے گمرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”شادی کے

تقریباً ایک سال بعد کھینچی گئی تھی۔“

ثایاب اچھل پڑی۔ تصویر میں راشدہ بے حد حسین تھی اور اب اسے دیکھ کر تو یہ

لگانا۔ وہ لوگ اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک انہیں اطمینان نہ ہو جائے۔ یہ بھی اچھا ہو کہ ہمیں کسی اور سے نرین سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“

”عبدالغنی ٹھیک کہہ رہے ہیں ثایاب بی بی۔“ راشدہ نے اس کی بات کٹ دی۔ ”اگر وہ ہمیں لینے کے ارادے سے آئے ہوتے تو آتے یا کچے ہوتے۔ لیکن وہ آؤں کا گھوڑوں پر آتا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کے ارادے واقعی ٹیک نہیں ہیں۔ تم خاموشی سے یہاں میرے پاس بیٹھی رہو۔“

ثایاب واقعی خاموش ہو گئی۔ اس سلسلے میں اس نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ باتیں کرتے ہوئے ڈیڑھ بج چکا تھا۔

”ثایاب بی بی۔“ عبدالغنی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے اکیلے یہاں آکر غلطی کی ہے۔ چودھری امانت علی تمہارا سر ہے، تم اسے اتنا نہیں جانتے جتنا ہم لوگ جانتے ہیں۔ وہ دونوں باپ بیٹے عذاب ہیں اس علاقے کے لوگوں کے لیے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بھی اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا کہ جاگیر میں کوئی اور حصہ دار نہ بن سکے۔ انہوں نے ہمیں یہاں بنایا ہے تو اس میں بھی یقیناً ایک چال ہوگی۔ تم نے اکیلے یہاں آکر بہت بڑی غلطی کی ہے لیکن وقت اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”دو بجے ایک گز نرین آئے والی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم شر واپس چلی جاؤ۔ میں ہمیں مال گاڑی میں گاڑو کے ڈبے میں بٹھا دوں گا۔“

”نہیں عبدالغنی صاحب!“ ثایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے ساتھ تو کسی لوگ آنے کو تیار تھے لیکن میں ضد کر کے اکیلی آئی ہوں اور چودھری امانت علی کو بھی اپنے خط میں یہ اطلاع دیدی تھی کہ میں اکیلی ہی آؤں گی۔ اگر میں واپس چلی گئی تو بڑوں کھلاؤں گی اور ان کی نظروں میں کمزور پڑ جاؤں گی۔“

”جو فیصلہ تمہارے دماغ سے سوچ سمجھ کر کیا جائے، اسے بڑی نہیں کہتے۔“ عبدالغنی نے کہا۔ ”بہر حال اپنے معاملات کو تم ہی ہم سے بہتر سمجھتی ہو لیکن میرا مشورہ مان کر اگر واپسی کا ارادہ ہو تو میں اس مال گاڑی کو اشیش پر رکھوا سکتا ہوں۔ تم کسی کی نظروں میں

آدمیوں کے ساتھ اس طرف نکل آیا۔ مجھے اکیلے پا کر چودھری سعادت علی کو موقع مل گیا۔ میں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی مگر انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں چیخ مچا کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی مگر چودھری سعادت نے مجھے دبوچ لیا۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

میری چیخوں کی آواز سن کر دوڑ کھینچوں میں کام کرنے والے لوگ اس طرف دوڑے۔ چودھری سعادت نے جب دیکھا کہ اب کام گم ہوا ہے تو اس نے مجھے اٹھا کر راب کے کھولے ہوئے کڑھاؤ میں پھینک دیا۔ کڑھاؤ الٹ گیا۔ کھوٹا ہوا سارا راب میرے اوپر گرا تھا۔

مجھے پہلے نورپور قصبے اور پھر شہر کے ہسپتال بھجوا دیا گیا۔ بعد میں گاؤں میں پولیس بھی آئی تھی لیکن چودھری سعادت کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے میرے بابا کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔

بابا چھ مہینوں تک نورپور کی حوالات میں بند رہا اور میں ایک سال تک ہسپتال میں پڑی رہی۔ عبدالغنی نے میرے لیے دن رات ایک کر دیا۔ میرے علاج کے لیے اس نے اپنا شہر والا مکان فروخت کر دیا۔ گھر کے برتن اور ہر وہ چیز بیچ دی جس سے دو پیسے مل سکتے تھے۔ اسے بڑی محبت ہے مجھ سے۔ میں نے کہا تھا مجھے مرنے دیا ہوتا۔ اس حالت میں میں اس کے کسی کام کی مگر وہ کہتا ہے محبت جسم سے نہیں روح سے ہوتی ہے۔ مجھے دیکھ کر لوگ ڈر کر کچھ اٹھتے ہیں۔ میرے قریب نہیں آتے۔ میری طرف ایک نظردیکھنا پسند نہیں کرتے مگر یہ عبدالغنی!... اسے اب بھی مجھ سے بڑی محبت ہے۔ بڑی تکلیفیں اٹھا رہا ہے میرے لیے۔ ساری تنخواہ میرے علاج پر خرچ کر رہا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ کہا مجھے شہر کے ہسپتال میں رہنے دو لیکن وہ مجھے اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتا۔

اسی لیے عبدالغنی بھی اور میں بھی بار بار تم سے کہہ رہے ہیں کہ واپس چلی جاؤ اور اپنی حفاظت کا بندوبست کر کے پھر آباد جاؤ۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔

نایاب راشدہ کی کمائی سن کر کلپ انجی۔ ایک طرف گناہ اور حرص و ہوس کی کمائی تھی تو دوسری طرف محبت اور چاہت کی داستان۔ راشدہ پانچ سال سے اس حالت میں تھی۔ لوگ اس کی فعل دیکھ کر ڈرتے تھے لیکن عبدالغنی نے اسے سینے لگا رکھا تھا۔ یہ واقعی

تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ اسی کی تصویر تھی۔ عبدالغنی بھی بہت اسارت تھا۔ وہ اس تصویر میں عبدالغنی کو بالکل نہیں پہچان سکتی تھی۔ کیسی تبدیلی آچھی تھی اس میں۔ اب تو وہ بہت بد دھنیت ہو گیا تھا۔

”ایک بات پوچھوں راشدہ؟“ نایاب تصویر کارنس پر رکھتے ہوئے پوچھی۔ ”تمہارے ساتھ یہ سب کچھ کیسے ہوا تھا؟ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں نایاب بی بی۔“ راشدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میری تصویر تم نے دیکھی۔ میں گاؤں کی سب سے حسین لڑکی ہوا کرتی تھی۔ گاؤں کے بہت سے لڑکے مجھ سے شادی کے خواہش مند تھے۔ قرعہ فال عبدالغنی کے نام نکلا۔ وہ میرا ماموں زاد بھی ہے۔ شادی سے پہلے وہ کسی اور اسٹیشن پر ہوا کر رہا تھا۔ پھر اس کا ٹرانسفر یہاں ہو گیا۔ ہمارے گھر اس کا آنا جانا بدھ گیا اور پھر ہماری شادی ہو گئی۔

”میرے چاہنے والوں میں ایک نام چودھری سعادت علی کا بھی تھا لیکن اس کی چاہت میں ہوس تھی۔ اس نے کئی مرتبہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور پھر میری شادی ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ میری شادی کے بعد وہ میرا پیچھا چھوڑ دے گا لیکن وہ شیطان اب بھی مجھ پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے گلی میں روکا تو میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اگر اس میں شرافت کا ذرا بھی مادہ ہوتا تو اس کے بعد وہ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا لیکن اس ذلیل آدمی کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ ایسے لوگ اس قسم کی باتوں کو بھولا نہیں کرتے۔ وہ انتقام لینے کے لیے موقع کی ناک میں رسبے ہیں اور پھر پانچ سال پہلے اسے موقع مل گیا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی، پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”وہ کماد کا سیزن تھا۔ گمے کی کمانی ہو رہی تھی۔ ایک جگہ گڑ بنانے کے لیے بہت بڑا کڑھاؤ آگ پر چڑھا دیا گیا تھا۔ فصل کی کٹائی ہوتی ہے تو سب لوگ کام کرتے ہیں، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ میں بھی ان دنوں گاؤں میں گئی تھی اور بابا کے ساتھ کھیتوں پر کام کر رہی تھی۔ بابا نے مجھے کڑھاؤ کے پاس بٹھا دیا کہ میں اس کے پیچھے لاؤں میں ایندھن بھونکتی رہوں۔ بابا خود کسی اور طرف چلے گئے۔

میں وہاں اکیلی تھی۔ کڑھاؤ میں راب، گنے کا رس بھرا ہوا تھا جو کھول رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے لاؤں میں ایندھن جھونکتی جا رہی تھی۔ اسی دوران چودھری سعادت علی اپنے دو

دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

عبدالغنی بھی لائین اٹھا کر اس کے ساتھ آیا۔ بیٹھک میں آکر اس نے لائین میز پر رکھ دی اور کمرے سے نکل گیا۔ ٹایپ نے دروازہ بھڑکایا اور جب کھڑا لگتا چلا تو چونک گئی، اندر کی طرف کا کھڑا ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ چند لمبے دہان کھڑی سوچتی رہی، پھر اس نے دو کرسیاں اٹھا کر دروازے کے سامنے رکھ دیں اور جوگزرا اتار کر صوفے پر لٹ گئی۔ نیکی کی جگہ اس نے اسی کرسی سے گدی اٹھا کر دوہری کر کے سر کے نیچے رکھ لی تھی۔

اس وقت اگرچہ تین بیٹے والے تھے لیکن نیند ٹایپ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ راشدہ کی کمائی سن کر وہ کانپ اٹھی تھی۔ چودھری فیملی کے بارے میں وہ اب تک بھی سمجھتی رہی تھی کہ انہیں دولت کی ہوس ہے لیکن راشدہ کو دیکھ کر اور اس کی درد بھری کمائی سن کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ ان باپ بیٹوں کے اندر شیطان چھپا بیٹھا تھا۔

ٹایپ بھی اب یہی سوچ رہی تھی کہ اسے عبدالغنی اور راشدہ مان لینا چاہئے اور صبح کی ٹرین سے شہر واپس چلے جانا چاہئے۔ سعادت علی اور اس کے باپ سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھی کوئی زیادتی کرنے کی کوشش کریں۔ چودھری کے دو آدمی یہ معلوم کرنے کے لیے یہاں آچکے تھے کہ وہ رات والی ٹرین سے آئی تھی یا نہیں۔ اس سے ٹایپ کو اندازہ ہوا کہ ٹرین کے ٹائم پر شام چھ بجے کوئی نہ کوئی اس کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر ضرور موجود ہوگا اور جب ٹرین لیت ہوئی چلی گئی تو وہ بھی واپس چلے گئے ہوں گے اور پھر رات گیارہ بجے انہوں نے ٹرین کی دسل کی آواز سنی ہوگی اور دو آدمی اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے عبدالغنی سے اس کے بارے میں پوچھا تھا اور عبدالغنی نے غصہ مندی سے کام لیتے ہوئے انہیں ٹال دیا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے رات کو عبدالغنی کے ساتھ اس کے گھر آنے کی پیشکش قبول کر کے اچھا ہی کیا تھا۔ اگر وہ اس کے ساتھ نہ آئی تو اسٹیشن پر بیٹھی رہتی اور پھر نمائے اسے کس قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا۔ عبدالغنی کے گھر آجانے سے اسے فائدہ ہی ہوا تھا۔ چودھری فیملی کے بارے میں نہ صرف بہت سی معلومات حاصل ہو گئی تھیں بلکہ کچھ سنسنی خیز افشاءات بھی ہوئے تھے۔ اب وہ دھوکے میں ان کا شکار نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے رات کے آخری پیراس کی آنکھ لگ گئی۔

اس کی محبت تھی کہ وہ اسے اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یوں تو ٹایپ پچھلے پانچ سال سے اپنے سرسرا کر بھگت رہی تھی۔ شادی کے بعد وہ صرف ایک ہفتہ اس گاؤں میں آکر رہی تھی اور پھر اس کے بعد پانچ سال کا عرصہ اس نے جس اذیت میں گزرا تھا، وہی جانتی تھی لیکن چودھری فیملی کے بارے میں اسے صرف اسی حد تک معلومات حاصل تھیں جس حد تک اس کا تعلق تھا میراں عبدالغنی اور راشدہ سے ملاقات کے بعد جو افشاءات ہوئے تھے، وہ بہت خوفناک تھے۔ ان دونوں نے اسے واپس چلے جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ بھی ضد کی پکی تھی۔ بڑھا ہوا قدم پیچھے ہٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ڈھائی بجے کے قریب عبدالغنی واپس آ گیا۔

”وہ دونوں ابھی ابھی واپس آ گئے ہیں۔“ اس نے ٹایپ کو بتایا۔ ”مجھ سے اور میرے ہونٹنشین میں سے طرح طرح کے سوال کرتے رہے۔ پورا اسٹیشن انہوں نے کئی مرتبہ ادھر سے ادھر تک دیکھ ڈالا۔ ان کا خیال تھا کہ ممکن ہے تم ٹرین سے اترتی ہو اور کسی کو نہ پا کر وقت گزارنے کے لیے کہیں ادھر ادھر چھپ کر بیٹھی ہو۔ اب شاید انہیں یقین ہو گیا تھا کہ تم رات والی ٹرین سے نہیں آئیں۔ ٹایپ بی بی!“ وہ رک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ان لوگوں کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ چودھری امانت علی اور اس کا بیٹا جیسے پیر آباد پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے میرا مشورہ اب بھی یہی ہے کہ پیر آباد جانا تمہارے لیے خطرے سے خالی نہیں ہے۔ تم واپس چلی جاؤ اور اپنی حفاظت کا بندوبست کر کے واپس آؤ۔“

”میں اب یہاں تک آچکی ہوں تو واپس نہیں جاؤں گی۔“ ٹایپ نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، تمہاری مرضی۔“ عبدالغنی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر بولا۔ ”رات زیادہ ہو چکی ہے۔ تم یہاں اس چالپاری پر سو جاؤ۔ میں بیٹھک میں صوفے پر لیٹ جاتا ہوں اور ہاں..... دروازے کو اندر سے کھڑا مت لگاتا تاکہ راشدہ اگر کسی وقت آواز دے تو میں اندر آسکوں۔“

”میرا خیال ہے آپ یہاں سو جائیے۔ میں بیٹھک میں چلی جاتی ہوں۔“ ٹایپ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اس نے اپنا بریف کیس بھی اٹھا لیا اور عبدالغنی کے جواب کا انتظار کیے بغیر

”نہیں۔ میں چائے نہیں پی سکتی۔ مجھے جو کچھ کھانا پلانا ہوتا ہے، عبدالغنی اپنے ہاتھ سے کھاتا ہے۔ جاؤ تم ناشتہ کر لو۔ بائیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔“ راشدہ نے کہا۔

نایاب اٹھ کر باہر گئی۔ آگن میں بائیں طرف غسل خانہ تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی غسل خانے میں داخل ہو گئی۔ اندر پانی کا دھم بھرا ہوا تھا۔ نہر کا گدلا سا پانی تھا۔ کل ٹرین میں تقریباً آٹھ گھنٹے کے سفر میں اس کا لباس بھی گرد آلود ہو چکا تھا اور جسم پر بھی ریت کے ذرات چپکے ہوئے تھے۔

نہانے کے بعد اس نے دروازہ ذرا سا کھول کر باہر بھاٹکا اور پھر جسم پر تولیہ لپیٹ کر دوڑتی ہوئی اس کمرے میں گھس گئی جہاں اس نے رات گزارا تھی۔ وہ اندر داخل ہو کر دروازہ پھیل رہی تھی کہ صحن والا دروازہ کھلنے کے آواز سنائی دی۔ اس نے جلدی سے دو کرسیاں اٹھا کر سامنے رکھ دیں اور بھری میں جھانک کر دیکھنے لگی۔

عبدالغنی ایک اور آدمی کے ساتھ صحن میں داخل ہو رہا تھا۔ ان دونوں کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا۔ نایاب بدحواس سی ہو گئی۔ وہ میز پر سے بریف کیس اٹھا کر بڑی بھرتی سے دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو گئی اور بریف کیس کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔ اسی وقت دروازے کو باہر سے دھکیلا جانے لگا۔

”ایک منٹ رک جائیے عبدالغنی صاحب! میں کپڑے بدل رہی ہوں۔“ نایاب نے دروازے کے قریب منہ بے جا کر کہا اور جلدی جلدی لباس بدلنے لگی۔

اس وقت بھی اس نے جینز اور کمرے رنگ کی ٹی شرٹ پہنی تھی۔ اس شرٹ کا گلا قدرے فراج تھا۔ شروں میں اس قسم کے لباس کو اب معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا اور پھر اونچے گھروں کی خواتین کا تو یہ پسندیدہ لباس بن گیا تھا لیکن گاؤں و دھماؤں میں عورتوں کے لیے ایسا لباس پہننے کا قصور بھی نہیں تھا۔ نایاب طویل عرصہ سے اس قسم کے لباس پہن رہی تھی اور یہاں اپنے ساتھ بھی دو تین جوڑے وہ ایسے ہی کپڑوں کے لے کر آئی تھی۔ کپڑے پہن کر اس نے بریف کیس ایک طرف رکھ دیا اور کرسیاں ہٹا کر دروازہ کھول دیا۔ انٹیشن ماسٹر عبدالغنی دوسرے آدمی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ وہ دونوں کمری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

نایاب کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ دروازہ قامت، گداز جسم، ہموری چٹی رنگت اور بھرپور

انجن کے وسل کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت پڑی چھت کو گھورتی رہی۔ کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ذرا سی گردن ہٹھا کر دیکھا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا جس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

کمرے کا دروازہ دو پٹ کا تھا اور اس نے سونے سے پہلے دونوں کے سامنے کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک پٹ کے سامنے سے کرسی دور ہئی ہوئی تھی۔ باہر سے دروازہ دھکیل کر کھولا گیا تھا تو کرسی اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی۔ اس نے میز کی طرف دیکھا، لائٹیں موجود نہیں تھیں۔ البتہ اس کا بریف کیس رکھا ہوا تھا۔

انجن کے وسل کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس کے فوراً ہی بعد گاڑی کی سیٹی کی آواز بھی اس کی سماعت سے گزرائی۔ وہ غالباً صبح آٹھ بجے والی ٹرین تھی۔ اس نے کھائی پر بندھی ہوئی کھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے۔ گویا یہ ٹرین بھی دو گھنٹے کی تاخیر سے پہنچی تھی اور اب غالباً اگلی منزل کی طرف روانہ ہو رہی تھی۔

نایاب نے اٹھ کر دونوں کرسیاں دروازے کے سامنے سے ہٹا دیں اور دروازہ پوری طرح کھول دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس قدر بے ہوشی کی نیند سوئی تھی کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ کون کب کمرے میں آیا اور واپس چلا گیا اور ظاہر ہے وہ عبدالغنی کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا اور اسے ذبح بھی کر ڈالتا تو اسے پتہ نہ چلتا۔

وہ کمرے سے باہر گئی۔ پورے آگن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر دروازے کے سامنے کھڑی رہی، پھر راشدہ والے کمرے میں آگئی۔ راشدہ حسب معمول بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر دوپٹہ بھی تھا۔

”جاگ گئیں نایاب بی بی۔“ راشدہ نے کہا۔ ”عبدالغنی تو تیس صبح آٹھ بجے ہی جاگ رہا تھا۔ میں نے منع کر دیا تھا کہ تھکی ہوئی اور دیر تک جاگی ہے، سوئے دو۔“

”کیسی ہیں آپ؟“ نایاب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میرا حال کیا پوچھنا۔“ راشدہ نے کمرہ سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”پہلے تم ناشتہ کر لو۔ باورچی خانے میں پر اٹھا دھکا رکھا ہوگا۔ چائے بنالو۔“

”آپ کے لیے بھی چائے بنا دوں۔“ نایاب اٹھتے ہوئے ہوئی۔

دی۔ اس نے اپنے علاوہ ان دونوں کے لیے بھی چائے بنائی تھی۔ اس نے آواز دے کر عبدالغنی کو دو کپ دے دیئے۔ عبدالغنی اس کی اس خدمت پر بے حد خوش ہوا۔ ٹایاب اپنا کپ لے کر راشدہ والے کمرے میں آگئی اور کرسی پر بیٹھ کر ہلکی ہلکی چٹکیاں لینے لگی۔

”یہ عمرین کیسا آدمی ہے راشدہ بہن؟“ اس نے پوچھا۔

”بہت اچھا آدمی ہے۔ کئی سال سے ان دونوں کی دوستی ہے۔“ راشدہ نے جواب دیا۔ ”پہلے ریلوے پولیس میں تھا۔ پھر دو کڑی جھوڑ کر دوسرے کاموں میں لگ گیا۔ میرے ساتھ یہ کبھ کبھ ہوا تھا تو اس نے ہماری ہی مدد کی تھی۔ اب بھی مالی مدد کرتا رہتا ہے۔ عبدالغنی کو اس کا بڑا سارا ہے۔ انہوں نے تو جھوڑ دیا، اب غیری کام کر رہے ہیں۔“

”ہاں راشدہ بہن۔“ ٹایاب نے گمراہ سانس لینے ہوئے کہا۔ ”اب تو غیری انہوں سے بڑھ کر ہیں۔“ وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر بولی۔ ”تو آپ کے خیال میں مجھے عمرین کے ساتھ چلے جانا چاہئے؟“

”ہاں ہاں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ کم از کم راستے میں جہیزیں ڈھارس تو رہے گی۔“ راشدہ نے جواب دیا۔

ٹایاب نے ہاتھیں کرتے ہوئے بریف کیس کھول کر اس کی زپ پاکٹ میں سے ہزار روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کے کچے کے پیچے رکھ دیا۔

”راشدہ بہن۔ معمولی سی رقم ہے۔ میں شرداہیں جا کر آپ لوگوں کے لیے کچھ کروں گی اور میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہئے، دوپہ تیز ہو رہی ہے۔“

کمرے سے باہر آ کر اس نے غسل خانے سے اپنے کپڑے اٹھا کر تہہ کیے اور انہیں بریف کیس میں رکھ لیا اور پھر بیٹھک کے دروازے پر آ کر عبدالغنی کو بتایا کہ وہ جانے کے لیے تیار ہے۔

اس کے تقریباً دس منٹ بعد وہ عمرین کے ساتھ اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی کے کوارٹر سے نکل رہی تھی۔ اس کا بریف کیس عمرین نے لے لیتا چلا تھا لیکن ٹایاب نے اسے اپنے پاس ہی رکھا۔ عبدالغنی کچھ دور تک ان کے ساتھ چلا تھا، پھر اسٹیشن کی طرف مڑ گیا۔

عمرین کی عمر بیٹائیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ بھاری ذیل ڈول کا مالک تھا اور قد چھ فٹ سے لکھا ہوا تھا۔ وہ ٹایاب کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور ٹایاب نے محسوس کیا تھا

شباب۔ اس نے تین سال ازدواجی زندگی میں گزاری تھی۔ اولاد سے وہ دونوں میاں بیوی خود ہی پرہیز کرتے رہے تھے۔ اس لیے ٹایاب کا شایبہ کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔

عبدالغنی اس وقت یونیفارم میں تھا۔ گرمی سانسوں رکھتے پر سفید ڈریس عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ اب بھی ٹایاب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹایاب نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور اس کمرے سے نکل کر راشدہ والے کمرے میں آگئی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے بریف کیس میں سے کنگھا نکالا اور بال سنوارنے لگی۔

”ناشتہ کر لیا ٹایاب بی بی؟“ راشدہ نے پوچھا۔

”ابھی نہیں۔ میں نمائے چلی گئی تھی۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ بال سنوارنے کے بعد وہ کنگھا بریف کیس میں رکھ رہی تھی کہ عبدالغنی بھی وہیں آ گیا۔

”ٹایاب بی بی!“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم نے تیر آباد جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو تو بڑی اچھی بات ہے لیکن اگر جانا ہی چاہتی ہو تو میں عمرین کو لے آیا ہوں۔ وہ ہمارے ساتھ جائے گا، کم از کم اس کے ساتھ تم خیریت سے تیر آباد پہنچ تو جاؤ گی۔“

”عمرین کون ہے؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”میرا دوست ہے۔ نورپور میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی آ جاتا ہے۔“ عبدالغنی نے جواب دیا۔ ”پہلے پولیس میں تھا، پھر اس نے دو کڑی جھوڑ دی۔ اب وہ چھوٹے ریلوے اسٹیشنوں کے قرب و جوار میں واقع تہیوں میں ضروریات زندگی کی چیزیں چلائی کرتا ہے۔ میری اس کی دوستی بہت پرانی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ جائے گا۔ خدا نخواستہ راستے میں اگر کوئی گزبزو ہوئی تو وہ نہ صرف تمہاری حفاظت کرے گا بلکہ اس قسم کے کسی واقعہ کا گواہ بھی ہو گا۔“

”ٹایاب بی بی نے ابھی ناشتہ نہیں کیا ہے عبدالغنی۔“ راشدہ نے کہا۔

”میں ابھی ناشتہ کر رہی ہوں راشدہ بہن۔“ ٹایاب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں آگئی۔

اس نے پہلے کچن میں رکھی ہوئی چیزوں کا معائنہ کیا۔ چکیر میں ایک کپڑے میں پراٹھا لپٹا ہوا تھا۔ پراٹھے کو دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ یہ مرد کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔ اس نے چولہے پر چائے کا پانی رکھ دیا اور وہیں کھڑے کھڑے پراٹھے کے تھے تو توڑ کر منہ میں رکھیں

شپا ہر چودھویں کی شپ نیلے کے پہلو میں کھیتوں میں واقع برگم مندر جایا کرتی تھی۔ وہاں دراصل ایک بہت پرانا برگم کا درخت تھا جس کا تاج تیس فٹ سے بھی زیادہ موٹائی میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کی لمبی شاخیں زمین کو چھوتی تھیں۔ برگم کا وہ درخت آج بھی موجود ہے۔ برہمالک ایک بندر نے برگم کے اس درخت پر ڈیرہ بجا رکھا تھا۔ وہ بندر علاقے میں پائے جانے والے عام بندروں سے جسامت میں بہت بڑا تھا۔

بندو بندر کو بھی ہنومان دیوتا سمجھتے تھے۔ رانی شپا نے برگم کے اس درخت کے نیچے ایک بہت بڑا چوڑا بنوا کر اس پر بارہ دری بنوا دی اور وہاں ہنومان کی ایک مورٹی بھی رکھوا دی۔ ایک چھوٹا سا چوڑا الگ بنوا دیا تھا جس پر برگم پر رہنے والے بندر کے لیے کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی جاتیں۔

اس بارہ دری کو مندر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ لوگ روزانہ وہاں پوجا پاٹ کے لیے جانے لگے۔ ایک پنڈت نے بھی وہاں ڈیرہ بجالایا تھا لیکن پورن ماشی کی رات اس مندر میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ پنڈت بھی شام ڈھلنے سے پہلے ہی وہاں سے کہیں اور چلا جاتا۔ پورے چاند کی وہ رات رانی شپا کے لیے مخصوص تھی۔ اس رات رانی شپا برگم پر رہنے والے بندر کے لیے اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کر کے لاتی اور رات اس چوڑے پر گزارتی۔

پورن ماشی کی رات بہتی کے کسی بھی فرد کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن ایک رات ایک مسافر اس طرف پہنچ گیا۔ اس مسافر نے بارہ دری میں جو کچھ بھی دیکھا، وہ اس کے لیے بہت حیرت انگیز تھا۔ وہ رات بھر چھپ کر وہ سب کچھ دیکھتا رہا اور پھر اگلے روز پوری ہستی میں یہ بات پھیل گئی کہ رانی شپا پورن ماشی کی رات بارہ دری میں ہنومان کی مورٹی کے سامنے برہم رقص کرتی ہے۔ برگم پر رہنے والا بندر دور بیٹھا اسے دیکھتا رہتا ہے اور پھر رانی شپا جب رقص کرتے کرتے تھک کر گر جاتی ہے تو وہ بندر اس کے پاس آجاتا ہے اور پھر وہاں وہ کھیل شروع ہو جاتا ہے جس کا کوئی قصور بھی نہیں کر سکتا۔

یہ بات پوری ہستی میں پھیل گئی تھی۔ لوگ چہ گوئیاں کرنے لگے۔ اس سلسلے میں لوگوں کی آرام مختلف تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ رانی شپا کب تک برواٹ کرتی؟

کہ وہ بار بار کن اگھیں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے پیر آباد جانے کے لیے وہ راستے تھے۔ ایک تو وہ کشادہ راستہ جس پر تانگے وغیرہ چلتے تھے لیکن یہ راستہ طویل تھا۔ دوسرا راستہ ایک تنگ سی پگڈنڈی تھی جو کھیتوں میں سے گزرتی تھی۔ یہ نسبتاً قریب کا راستہ تھا۔ پیدل آنے والے اسی راستے کو استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے پگڈنڈی والا راستہ اختیار کیا تھا۔

سامنے بہت دور ایک ٹیلہ نظر آ رہا تھا۔ عہدین اس ٹیلے کے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہاں قدیم کھنڈرات ہیں۔ صدیوں پہلے یہاں کوئی آبادی ہو کر تھی لیکن پھر نجانے کب اور کیسے وہ بہتی کھنڈرات میں تبدیل ہو گئی۔ وہاں کے رہنے والے لوگوں کا کیا ہوا تھا، اس بارے میں تاریخ بھی خاموش ہے۔ اس ضلع کی تاریخ میں ٹیلے کے ان کھنڈرات کا بھی تذکرہ ہے لیکن تفصیل سے کچھ نہیں۔ ویسے لوگوں نے ان کھنڈروں کے بارے میں اپنے طور پر کچھ کہانیاں گھڑ رکھی ہیں۔ ان میں ایک کہانی جو سب سے زیادہ مشہور ہے، اس کے مطابق اس ٹیلے کے ارد گرد جیلوں دور تک کا علاقہ شپا ٹائی ایک بندو عورت کی ملکیت تھا۔ اس علاقے کو ایک چھوٹی سی ریاست کا درجہ حاصل تھا۔

اس زمانے میں بھی یہ علاقہ اسی طرح سرسبز و شاداب ہوا کرتا تھا۔ ریاست کا اپنا ایک نہری نظام تھا جس سے زمینیں اور باغات سیراب ہوتے تھے۔ بڑی خوشحالی تھی۔ لوگ مطمئن و مسرور تھے۔ عوام پر کسی قسم کا ٹیکس نہیں تھا۔ زمیندار تاجر اور کسی بھی قسم کا کاروبار کرنے والا ہر شخص دشکارانہ طور پر اپنی کمائی کا کچھ حصہ رانی شپا کی خدمت میں پیش کر دیا کرتا تھا۔

یوں تو اس علاقے میں چھوٹی چھوٹی ہی ہستیاں تھیں مگر رانی شپا کی ہائش اس ٹیلے پر تھی۔ بہت بڑی حویلی تھی جس کے ارد گرد آبادی تھی۔

رانی شپا بہت حسین تھی۔ اس کی عمر اگرچہ چالیس سال ہو چکی تھی مگر اس نے شادی نہیں کی تھی۔ چالیس سال کی ہونے کے باوجود اس کے حسن و شباب میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پڑوس کی ریاستوں کے کئی حکمرانوں اور راجاؤں نے رانی شپا کو شادی کے لیے پیغام بھیجے تھے لیکن رانی نے ہر ایک کو انکار کر دیا تھا۔

اور پھر رانی شپا کے بارے میں بھی عجیب و غریب باتیں گردش کرنے لگیں۔ رانی

بڑکانے والوں کی بھی کی نہیں تھی۔

لوگ ایک جلوس کی شکل میں رانی شہا کی حویلی پر پہنچ گئے۔ جہم میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی باتیں جلتی پر تل کا کام کر رہی تھیں۔ ان کے جھٹکے ہوئے جملوں سے لوگوں کا فہم بھوک رہا تھا۔ جہم میں سے کسی نے کہا، 'اگ لگا دو' رانی شہا کو زندہ جلا دو اور پھر حویلی کو اگ لگا دی گئی۔ رانی شہا کو زندہ جلا دیا گیا۔ اس کی چپٹیں گونجتی رہیں اور بالا خر اگ کے شعلوں نے اس کی پیڑوں کو بھی نگل لیا۔

لوگوں کا ایک جہم مندر کی طرف آگیا۔ انہوں نے غصے میں بارہ دری توڑ ڈالی اور برآمدے کے اس بوڑھے درخت پر بندر کو تلاش کرنے کے لیکن وہ بندر وہاں نہیں تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید وہ درخت سے اتر کر کیتوں کی طرف چلا گیا ہوگا۔ وہ لوگ وہاں بیٹھے اس کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ شام ہو گئی، بندر واپس نہیں آیا۔ بہت سے لوگ ہستی میں لوٹ گئے تھے لیکن وہ تین آدمی لٹھیاں لیے رات بھر وہاں بندر کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

اور پھر کئی روز گزر گئے۔ وہ بندر واپس نہیں آیا۔

اور پھر اس کے بعد اس ہستی اور ریاست کا زوال شروع ہو گیا۔ نہروں کا پانی سوکھ گیا، کنوئیں خشک ہو گئیں، فصلیں تباہ ہو گئیں۔ ایسا زبردست قحط پڑا کہ لوگ بھوک پیاس سے اڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے لگے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ رانی شہا پر جھوٹا الزام لگا کر اسے زندہ جلا دیا گیا تھا اور یہ قحط، تباہی و بربادی سب کچھ اس کی بددعا کا نتیجہ تھا۔

بستیوں کی بستیوں اجڑ گئیں۔ ہر طرف انسانوں اور مویشیوں کی لاشیں نظر آنے لگیں۔ بچے کھجور، لوگوں کو بیماریوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس طرح رانی شہا کی پوری ریاست قبرستان بن گئی اور سب کچھ ختم ہو گیا۔

نصف صدی تک کسی نے اس ریاست کی زمین پر قدم نہیں رکھا اور پھر دوسرے مائتوں کے لوگ آہستہ آہستہ اس طرف آکر آباد ہونے لگے۔ لوگوں نے دوسری جگہوں پر بستیوں بسائیں لیکن اس نیلے کارخ نہیں کیا۔ نیلے پر رانی شہا کی حویلی اور ہستی کے دوسرے مکان کھنڈر بن چکے تھے جو اب بھی جوں کے توں وہاں موجود تھے۔

کیتوں کے چھ کی پگڈنڈی پر چلے ہوئے مردین رانی شہا کی ریاست کی تباہی کے

اس نے اپنی انا کا بھرم رکھنے کو شادی نہیں کی تھی لیکن جب شہاب کا بیٹا لبرز ہو گیا تو اس نے وہی کام ایک بندر سے لیا جو کسی مرد سے لیا جاسکتا تھا۔

دوسرا طبقہ اس راءے کے خلاف تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو رانی کی پاکدامنی کی قسمیں کھاتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ رانی شہا کو بدنام کرنے کے لیے اس پرستانہ راءے کا راءا تھا۔ ان کے لیے رانی شہا ایک دیوی تھی اور کسی دیوی سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہو سکتی تھی۔

رانی شہا چند روز تک لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنی رہی اور پھر لوگ اس بات کو بھول گئے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کو آسانی سے نہیں بھولتے۔ وہ اگلی پورن ہاشی رات کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں وہ پنڈت رکھو تھا بھی تھا جو برگلہ مندر میں رہا کرتا تھا۔

پورن ہاشی کی رات کسی کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں تھی۔ پنڈت بھی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلا یا جایا کرتا تھا لیکن اس شام وہ کہیں اور جانے کے بجائے قریب ہی جوار کے کیتوں میں چھپ گیا۔

رانی شہا چاند طلوع ہونے کے تھوڑی دیر بعد مندر پہنچ گئی۔ وہ اپنے ساتھ بندر کے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔ وہ کھانا اس نے اس چھوٹے سے مخصوص چوترے پر رکھ دیا اور پوجا بات میں مصروف ہو گئی۔

پنڈت کیت سے نکل کر جھاڑیوں میں چھپا ہوا ایسی جگہ پر آ گیا تھا جہاں سے بارہ دری والا چوترہ آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر سانس روکے بیٹھا رہا۔ آدھی رات کے قریب شہا نے پوجا ختم کر دی اور جہان کی موتی کے سامنے رقص کرنے لگی۔ وہ بندر اپنی جگہ پر بیٹھا رانی کو رقص کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور بالا خر رانی شہا تھک کر بندر کے قریب گر گئی۔ بندر چند لمے اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے رانی کو اپنی آنکھوں میں بھر لیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ سب کچھ ہونے لگا جسے دیکھ کر پنڈت کانپ اٹھا۔

اگلے روز ہستی کے لوگوں کی زبان پر پھر یہی قصے تھے۔ ہستی کے پشتر لوگ رانی شہا کو دیوی مانتے تھے۔ اس کی پاکدامنی کی قسمیں کھاتے تھے لیکن وہ پنڈت کی بات کو بھی نہیں بھٹکا سکتے تھے۔ ایسے لوگوں کے اعتقاد کو ہمیں چھٹی تھی۔ وہ غصہ میں آگئے اور انہیں

کھاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس وجہ سے بھی اس سائیکل سوار کو وہاں تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگ گئے۔ قریب پہنچ کر وہ سائیکل سے اتر گیا۔ اس نے سائیکل کھڑی کر کے بڑے پر جوش انداز میں عمر دین سے ہاتھ ملایا تھا۔

”کیا حال ہے بھائی عمر دین؟ بہت عرصہ بعد نظر آئے ہو۔“ سائیکل سوار نے کہا۔
عمر دین اس سے باتیں کرنے لگا۔ ٹایپ ایک طرف کھڑی سائیکل والے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی قبض پینے سے تر ہو رہی تھی۔ اس نے دھوپ سے بچنے کے لیے سر پر ایک کپڑا رکھا ہوا تھا جس سے وہ اپ وہ اپنی گردن اور چہرے کا پینٹ پونچھ رہا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ٹایپ کی طرف بھی دیکھا تھا۔

”اور سناؤ غلام رسول۔ تمہارے پنڈ کے چودھریوں کا کیا حال ہے؟“ عمر دین نے اس شخص سے پوچھا۔

”ہمارے پنڈ کے چودھری تو آج کل بہت بوکھلائے ہوئے ہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”سنا ہے ان کی چھوٹی بھابھی نے حساب کتاب کرنے آ رہی ہے۔ چودھری سعادت علی تو بہت بھڑا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے اپنی ایک کلہ زمین بھی کسی کو نہیں دے گا لیکن یہ بھی سنا ہے کہ ان کی بو بڑی ڈاڈھی عورت ہے۔“

”وہ ڈاڈھی ہو یا نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حقدار کو اس کا حق ملنا چاہیے۔“ عمر دین نے کہا۔ ”یہ دیکھو۔ تمہارے سامنے شیر دی بٹی کھڑی ہے۔ اکیلی جا رہی ہے۔ ہے تا بہت والی۔ دیکھ لیتا ہے تمہارے چودھریوں کو تاک رگڑنے پر مجبور کر دے گی۔“

عمر دین نے اگرچہ یہ الفاظ سرگوشیاں لیجے میں تھے مگر ٹایپ نے اس کی بات سن لی تھی اور وہ دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

غلام رسول نے چونک کر ٹایپ کی طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر بڑے ادب سے سلام کیا۔

”آپ اکیلی آئی ہیں بی بی جی؟ کسی کو ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا۔“ اس نے کہا۔
”میں اکیلی نہیں، میرا خدا میرے ساتھ ہے۔“ ٹایپ نے جواب دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے بی بی جی۔ خدا مظلوموں کے ساتھ ہے مگر۔۔۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”مگر چودھری سعادت بہت بھڑا ہوا ہے۔ جس نے جائیداد کے لئے اپنے سبکے

قصبے سنا رہا تھا اور ٹایپ اس کے ساتھ خاموشی سے چل رہی تھی۔ دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ ٹایپ کی ٹی شرٹ پینے سے تر ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی پینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

وہ پکائیں کے ایک درخت کے نیچے رک گئی۔ ٹھنڈی چھاؤں بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ عمر دین نے ایک نظر ٹایپ کی طرف دیکھا اور پھر رخ بدل کر کھڑا ہو گیا۔ ٹایپ جینز کو جیب سے رومال نکال کر چہرے اور گردن سے پینٹ پونچھ رہی تھی۔ جس جگہ وہ کھڑے تھے، وہاں سے بائیں طرف کچھ فاصلے پر وہ ٹیلہ اور کھنڈرات تھے۔ ٹوٹی پھوٹی چند دیواریں بھی نظر آ رہی تھیں۔

”وہ برگد کا درخت آپ دیکھ رہی ہیں؟“ عمر دین نے تقریباً سو گز دور برگد کے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ درخت بہت پھیلا ہوا تھا۔ ”یہی وہ درخت ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں ایک بندر رہا کرتا تھا جو رانی شہا کی موت کا باعث بنا تھا اس درخت کے نیچے وہ ٹوٹا پھوٹا چوترو بھی ابھی تک موجود ہے۔“

ٹایپ برگد کے اس پھیلے ہوئے درخت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے مزید دو گز آگے وہ ٹیلا شروع ہو جاتا تھا۔ اسے رانی شہا کے بارے میں سنائی ہوئی عمر دین کی کہانی خاصی دلچسپ لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آگے جا کر برگد کے اس درخت اور ٹیلے کے کھنڈرات کو دیکھے لیکن یہ موقع ابھی نہیں تھا کہ وہ سیر و تفریح میں وقت ضائع کرتی۔

”چیر آباد اب کتنی دور ہے؟“ اس نے مڑ کر عمر دین سے پوچھا۔
”اس ٹیلے کے دوسری طرف چیر آباد ہے۔“ عمر دین نے جواب دیا۔ ”اتنا ہی فاصلہ باقی ہے جتنا ہم طے کر کے آئے ہیں۔“

ٹایپ کے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا۔ وہ لوگ تقریباً ڈیڑھ کوس کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور ابھی اتنا ہی فاصلہ باقی تھا۔ چٹکنی دھوپ میں ڈیڑھ کوس کا یہ فاصلہ ٹایپ کو قیام لگ رہا تھا۔ کیتھ میں جس کی یہ کیفیت تھی جس سے گری کا احساس بڑھ گیا تھا۔ وہ لوگ وہاں سے روانہ ہونا ہی چاہتے تھے کہ سامنے سے ایک سائیکل سوار کو آ دیکھ کر عمر دین رک گیا۔ وہ سائیکل سوار ابھی کافی دور تھا۔ پگڈنڈی کھیتوں کے درمیان

لکڑیاں کھڑی کر کے اس پر سائیاں سا بنا دیا گیا تھا۔ اس پتھر کے نیچے ایک عورت اور دو بچے بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پانی کا ٹھکانا بھی رکھا ہوا تھا۔

”یہاں عمر دین“ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ میرا خیال ہے وہاں پانی مل جائے گا۔“

ٹایاب نے کہتے ہوئے سائیاں کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ یہاں رکھیے، میں پانی لے آتا ہوں۔“ عمر دین نے کہا۔

”میں بھی چلتی ہوں۔ سائے میں کچھ دم لے لیں گے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔

وہ دونوں سائیاں کی طرف جانے والی چمڑی پر مڑ گئے۔ سائیاں کے نیچے بیٹھی ہوئی وہ عورت ٹیکوں سے ٹوڑی بنا رہی تھی۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی اور جب یہ لوگ قریب پہنچے تو وہ اٹھ کھڑی ہو گئی۔

”پیاس لگ رہی ہے“ پانی مل جائے گا؟“ ٹایاب نے کہا۔

اس عورت نے سلور کا میلا سا گلاس کھلا اور پھر پانی سے بھر کر ٹایاب کے ہاتھ میں دے دیا۔ پانی گدلا سا تھا لیکن ٹایاب اس کی پروا کیے بغیر غٹ غٹ پانی پینے لگی۔ وہ عورت بڑی دلچسپ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دور سے وہ اسے کوئی سروی سمجھی تھی لیکن اب اسے حیرت ہو رہی تھی کہ شہر کی عورتیں اس قسم کا لباس پہنتی ہیں۔

عمر دین نے بھی پانی پیا۔ ٹایاب عورت اور اس کے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ عورت کی عمر تیس بیس سال کے گگ بھگ رہی ہوگی۔ میلے سے کپڑے اور ڈھیلا ڈھالا سا جسم۔ ایک بچہ چھ سات سال کا تھا جو اپنی ماں کی طرح ٹیکوں سے کچھ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے کی عمر دو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی ناک بسہ کر منہ میں جا رہی تھی اور وہ بڑے مزے سے مٹی میں کھیل رہا تھا۔ دونوں بچوں نے میلے سے کرتے پہنے ہوئے تھے۔ چابرا یا چٹری وغیرہ نہیں تھی۔

وہ تقریباً پانچ منٹ تک سائیاں کے نیچے کھڑے رہے، پھر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ گاؤں اب دو سو گز سے زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ راستے میں ایک تقریباً دس فٹ چوڑی ندی تھی جس پر آمد و رفت کے لیے دو تین ٹیکوں پر پلایا بنی ہوئی تھیں۔

وہ لوگ ندی سے ابھی دور ہی تھے کہ ایک گھوڑا سوار کیتھوں کی طرف سے آتا ہوا نظر آیا۔ اس گھوڑا سوار کو دیکھ کر بجائے کیوں ٹایاب کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

بھائی کو قتل کروا دیا، اس سے کسی بھی برائی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ پتہ چلا تھا کہ آپ کل کی گاڑی سے آنے والی ہیں۔ اس کے دو آدمی کل شام کو اسٹیشن پر بیٹھے رہے تھے مگر گاڑی لیٹ تھی۔ وہ واپس آ گئے۔ رات گیارہ بجے گاڑی کے دسل کی آواز سنائی دی تو چودھری نے فوراً ہی دو آدمی اسٹیشن پر بھیج دیئے تھے لیکن آپ رات والی گاڑی سے نہیں آئیں۔ آج صبح بھی دو آدمی اسٹیشن پر موجود تھے۔ حیرت ہے انہوں نے آپ کو دیکھا کیوں نہیں۔“

”میں صبح والی گاڑی سے ہی آئی ہوں۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ اس نے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ رات اس نے اسٹیشن ماشر کے گھر پر گزاری تھی۔ ”ہو سکتا ہے“ وہ مجھے بچان نہ سکے ہوں۔“

”آپ ذرا ہو شیار رہیے بی بی جی۔“ غلام رسول نے مشورہ دیا۔

وہ لوگ کچھ دیر اور وہاں کھڑے باقیں کرتے رہے اور پھر غلام رسول تو سائیکل پر سوار ہو کر اپنی راہ چلا گیا اور یہ دونوں گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ کیتھوں میں دور دور تک کسان کام کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ٹایاب سوچ رہی تھی کہ یہ لوگ کتنی محنت سے فصلیں لگاتے ہیں۔ اناج پیدا کرتے ہیں۔ کڑا کے کی سردی اور چٹلائی دھوپ میں ان کا زیادہ وقت کیتھوں ہی میں گزرتا ہے اور جب فصل تیار ہو جاتی ہے تو زمیندار سب کچھ سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور محنت کرنے والے یہ لوگ فاقوں میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ نہ ان کے پاس بیت بھر کھانے کو ہوتا ہے، نہ پینے کو ڈھنگ کے کپڑے۔ ان کے بچے تعلیم سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس کے برعکس زمیندار اور جاگیردار عیش کرتے ہیں۔

وہ چمڑی پر چلنے ہوئے نیلے کے دوسری طرف نکل چکے تھے۔ گاؤں بھی اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ یہ ساری زمینیں چودھری امانت علی کی ملکیت تھیں۔ شادی کے بعد جب ٹایاب سرسرا کے ساتھ یہاں آئی تھی تو اس نے ٹایاب کو اپنے علاقے کی سیر کرائی تھی۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھانوں کیتھوں میں گھومتے رہے تھے۔ ان کی زمینیں میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

گرمی کی شدت سے ٹایاب کا داغ پگھلا جا رہا تھا۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ ایک طرف تقریباً پیاس مڑ کے فاصلے پر ایک پتھر دیکھ کر وہ رک گئی۔

تھے۔

عمر دین نے ایک آدمی سے ملک صلاح الدین کے گھر کا پتہ دریافت کیا تو وہ شخص رہنمائی کے لیے ان کے ساتھ چل پڑا۔ دو تین گھنٹوں گھومتے کے بعد وہ ایک حویلی کے سامنے رک گیا۔ اندر اطلاع بھجوائی گئی تو ملک صلاح الدین فوراً ہی باہر آگیا۔

عمر دین حویلی کے دروازے ہی سے واپس چلا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دوسرا اپنے ایک دکاندار دوست کے پاس گمارنے کے بعد واپس چلا جائے گا۔

ملک صلاح الدین کے گھر میں نایاب کا استقبال پڑی مگر جوئی سے ہوا تھا۔ ملک صلاح الدین کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹا اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں امریکہ میں مقیم تھا اور دوسرے نے زمینداری سنبھال رکھی تھی۔ وہ سب سے بڑا تھا اور اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک چھ سال کی لڑکی اور دوسرا تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر کا لڑکا۔ ملک صلاح الدین کی دو بیٹیاں میں سے ایک تو نایاب کی ہم عمر تھی اور دوسری کی عمر پندرہ سولہ سال کے قریب تھی۔ ان سب نے نایاب سے مل کر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

گاہوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ چودھری امانت علی کی بیوہ آگئی ہے۔ گاہوں کی عورتیں نایاب کو دیکھنے کے لیے ملک صلاح الدین کی حویلی میں آ رہی تھیں۔ ملک صلاح الدین کی بیوہ کیکنے نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ نایاب کے کپڑے تبدیل کروا دیئے۔ ظاہر ہے نایاب تو اپنے ساتھ شلوار قمیض نہیں لائی تھی۔ ملک صاحب کی بڑی بیٹی زمر کے کپڑے اسے پورے آگئے تھے۔ دوسرا کھانا کھانے کے بعد نایاب سو گئی اور پھر اس کی آنکھ شام چھ بجے ہی کھلی تھی۔

چھوٹے چھوٹے گاہوں رساتوں میں بھی لوگ کسی وغیرہ کو بھول کر چائے کے عادی ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی تواضع بھی چائے ہی سے کی جاتی تھی۔ ملک صاحب کے گھر کے لوگ دیے بھی شام کو چائے پینے کے عادی تھے اور پھر نایاب کی وجہ سے تو خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا۔ چائے کے ساتھ بکٹ وغیرہ بھی تھے۔

ملک صاحب کا بڑا بیٹا سکندر بھی زمینوں سے واپس آچکا تھا۔ حویلی کے وسیع و عریض صحن کے ایک طرف مویشیوں کا باڑہ تھا۔ ایک آدمی مویشیوں کا چارہ وغیرہ تیار کر رہا تھا اور

وہ گھوڑا سوار ان کے قریب آکر رک گیا۔ اس نے پہلے سرسری سے انداز میں عمر دین کی طرف دیکھا اور پھر گرمی نظروں سے نایاب کی طرف دیکھنے لگا اور پھر کچھ کے بغیر اس نے گھوڑے کا رخ موڑا اور اسے کھیتوں کی طرف دوڑا دیا۔

”یہ چودھری کا بھتیجہ ہے۔“ عمر دین نے کہا۔ ”مجھے اچھی طرح جانتا ہے لیکن غالباً آپ کی وجہ سے اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور اس نے شاید آپ کو پہچان لیا ہے اور میرے خیال میں وہ چودھروں میں سے کسی کو اطلاع دینے گیا ہے۔“

”لیکن وہ گاؤں کی طرف تو نہیں گیا۔“ نایاب نے کہا۔

”ہو سکتا ہے چودھری اس وقت کھیتوں میں ڈیرے پر ہوں۔“ عمر دین نے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”گاؤں میں آپ کہاں جاؤں گی۔ چودھریوں کی حویلی.....“

”ملک صلاح الدین کے گھر۔“ نایاب نے جواب دیا۔ ملک صلاح الدین اس علاقے کا ایک چھوٹا زمیندار تھا اور سرفراز چودھری کے ہمدردوں میں سے تھا۔ اس کا بیٹا سراج نایاب اور سرفراز چودھری کا کلاس فیلو تھا جو ایک سال پہلے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلا گیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک تو چودھری امانت علی سے ملک صلاح الدین کی دوستی بڑی گرمی تھی مگر پانچ سال پہلے جب ملک صلاح الدین نے سرفراز اور نایاب کی شادی کی حمایت کی تھی تو ان کی دوستی میں رخنہ آگیا تھا۔ ملک صلاح الدین چودھری امانت علی کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ سرفراز نے اگر پسند کی شادی کر لی ہے تو اسے تسلیم کر لینا چاہیے مگر چودھری امانت علی کو سرفراز اور نایاب سے اس کی یہ ہمدردی بری لگی تھی اور اس طرح ان کی بول چال بند ہو گئی تھی اور دونوں گھرانوں کے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ سرفراز چودھری کی موت کے بعد بھی ملک صلاح الدین اکثر و بیشتر شہر آ رہتا تھا اور نایاب اور اس کے والد سے ضرور ملاقات کرتا تھا۔

وہ دونوں نہر کی پلایا عبور کر کے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ گاؤں کے لوگ نایاب کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اسے اس لباس میں دیکھ کر بعض عورتوں نے تو شرم سے نظریں جھکا لی تھیں۔ البتہ بعض مرد بوئے شوق انداز میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کئی بچے بھی اس کے ساتھ ساتھ چلے گئے تھے، وہ شاید شہر کی اس چیز کو کوئی آسمانی مخلوق سمجھ رہے

ہے۔ اس کی کچھ وضاحت کریں گے؟“ غایب نے کہا۔
 ”چودھری امانت علی کا خیال ہے کہ شر والا وہ بھگہ جس میں تمہاری رہائش ہے“
 تمہیں دے دیا جائے اور اس کے عوض تم سے مقدم واپس لینے کی تحریک لکھوا لی جائے۔
 اس نے تو تین دن سے اپنے وکیل کو بھی یہاں بلا رکھا ہے جس نے کچھ کاغذات تیار کیے
 ہوئے ہیں جن پر وہ تم سے دستخط کروانا چاہتا ہے۔“
 ”انہوں نے مجھے سچی سمجھ رکھا ہے جو ایک بھگہ دے کر مجھے نرغا دس گئے۔“ غایب
 نے کہا۔ ”بات یہ ہے اٹکل کہ اگر یہ لوگ مجھے اپنی بو تسلیم کر لیتے، مجھے وہ مقام دیتے جو
 میرا حق تھا، مجھے بیٹی کی طرح دل میں اور گھر میں جگہ دیتے تو میں ہر چیز سے دستبردار ہو
 سکتی تھی۔ ان کی ہر وہ بات مانتی جو یہ مجھے کہتے لیکن انہوں نے مجھے اپنی بو تسلیم ہی نہیں
 کیا۔ مجھے بچ، کم ذات، لالچی اور بھاننے کیا کیا کسر کر طلاق دلوانے کی ہر ممکن کوشش کی
 لیکن سرفراز نے ان کی کوئی بات نہیں مانی تو یہ لوگ اونچے بھگڑوں پر اتر آئے۔ انہوں
 نے دولت کی خاطر اپنے بچے کو بھی موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ میں لالچی نہیں ہوں۔ میں
 نے دولت کی خاطر سرفراز سے شادی نہیں کی تھی۔ شادی سے دو مہینے پہلے تک تو مجھے یہ
 بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کسی جاگیردار کا بیٹا ہے۔ ہم صرف یہ جانتے تھے کہ اس کا تعلق ایک
 کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ ہم بھی بچ یا بھکاری نہیں ہیں۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ میرے
 والد حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ہمارے خاندان کو شہر کے چند معزز ترین
 خاندانوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ ہماری عزت ہے، وقار ہے۔ ہمیں ہر جگہ پڑ پرائی
 ملتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج کے دور میں دولت ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی
 ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دولت پا کر آدمی انسانیت کے جانے سے باہر ہو جائے
 اور دوسروں کو اپنے سے حقیر سمجھنے لگے۔ اس دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جن کے
 پاس دولت نام کی کوئی چیز نہیں لیکن ان کے اخلاق اور ان کے حسن سلوک کی بنا پر لوگ
 ان کی عزت کرتے ہیں۔ مجھے دولت کا کوئی لا بچ نہیں۔ اللہ نے مجھے سب کچھ دیا ہے لیکن
 جس کے لیے مجھے اس عمر میں بیوگی کا صدمہ اٹھانا پڑا ہے، اب میں اس سے دستبردار نہیں
 ہو سکتی۔ میں اس جاگیر سے اپنے شوہر کا حصہ ضرور لوں گی۔ اس چودھری جیللی کو یہ بھی بتا
 دوں گی کہ اپنا حق کیسے وصول کیا جاتا ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اپنا حصہ وصول کر کے

دوسرا بھینسوں کا دودھ دوہنے کی تیاری کر رہا تھا۔
 ”دوسرے کوئی پیغام تو نہیں آیا اٹکل؟“ غایب نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ملک
 صاحب کی طرف دیکھا۔
 ”نہیں۔“ ملک صاحب نے جواب دیا۔ ”میں تھوڑی دیر پہلے باہر گیا تھا۔ چودھری
 امانت علی سے بھی آگنا سامنا ہوا تھا۔ ویسے تو ان لوگوں کو تمہاری آمد کا پتہ چل گیا ہے۔
 میں چاہتا تھا کہ خود بھی اسے بتا دوں۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا لیکن وہ جواب
 دینے بغیر منہ پھیر کر چل دیا۔“
 ”ویسے ان کی ناراضگی کا تو مجھے پتہ ہے۔“ غایب نے کہا۔ ”لیکن میرے یہاں آنے
 سے ناراضگی شاید کچھ اور بڑھ گئی ہوگی۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ شاید میں سیدھی ان
 کے پاس آؤں گی۔“
 ”میرا خیال ہے اس کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“ ملک صلاح الدین نے
 مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”انہوں نے جو پروگرام بنا رکھا تھا، وہ کچھ اور ہے۔“
 ”انہوں نے مجھے یہاں تھینے کے لیے بلایا ہے لیکن مجھے پتہ چل گیا ہے کہ ان کا
 ارادہ کیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کل رات وہ آدمی میری تلاش میں ریلوے اسٹیشن
 گئے تھے۔ آج صبح بھی وہ آدمی ٹرین کے وقت اسٹیشن پر بیٹھے رہے۔ وہ مجھے ڈرا دھمکا کر
 واپس بھیج دینا چاہتے تھے یا ان کا ارادہ کچھ اور تھا لیکن میں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ وہ اپنے
 کسی گھماؤنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔“
 ”میرے خیال میں چودھری امانت علی ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا جس سے اس پر
 فوجی داری کیس بننے کا اندیشہ ہو۔“ ملک صاحب نے کہا۔
 ”ہو سکتا ہے میرے سر میں ابھی تھوڑی بہت عقل باقی ہو اور وہ کوئی ایسی حرکت
 کرنے سے گریز کرے لیکن اس کا بیٹا چودھری سعادت علی سنا ہے، وہ بہت بھگڑا ہوا ہے۔
 کل رات وہ آدمی اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی کے گھر آئے تھے اور میرے بارے میں پوچھ رہے
 تھے اور آج صبح بھی اسی کے دو آدمی وہاں موجود تھے۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ مجھے
 گاؤں بھیجنے سے پہلے ہی قسم کر دینا چاہتا تھا۔ بعد میں یہی کہا جاتا ہے کہ میں تو یہاں آئی ہی
 نہیں لیکن بہر حال، ابھی آپ نے کہا تھا کہ چودھری امانت علی نے کوئی اور پروگرام بنا رکھا

اور آس پاس کی بتیوں کے لوگ آپ کے ساتھ ہوں گے۔ آپ انشاء اللہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گی۔“

”میری چودھری چٹلی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔“ نایاب نے کہا۔ ”میں تو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ حقہ دار کو اس کا حق ملنا چاہیے اور اگر حق غصب کرنے کی کوشش کی جائے تو اسے کس طرح چھٹانا جاتا ہے۔“

وہ لوگ برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ملک صاحب کی چھوٹی بیٹی عذرہ نے گھر کی بنیاد جلا دی تھیں۔ اس گاؤں میں بجلی موجود تھی۔ گاؤں کے دوسری طرف تقریباً ایک میل کے فاصلے پر بائی وے تھی جو بڑے شہروں کو آپس میں ملاتی تھی۔ بائی وے تک آمد و رفت کے لیے یہی پختہ سڑک تھی۔ ریلوے اسٹیشن اگرچہ گاؤں سے دور پڑا تھا اس لیے زیادہ لوگ بسوں کے ذریعے ہی سفر کرتے تھے لیکن طویل سفر کے لیے ہر حال ٹرین ہی کو ترجیح دی جاتی تھی۔

وہ لوگ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ دو عورتیں حویلی میں داخل ہوئیں۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر تھی اور دوسری جوان۔ ان دونوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔

”آؤ بہن اللہ رکھی۔ اتنے عرصہ بعد کیسے آنا ہوا؟“ ملک صلاح الدین نے ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اللہ رکھی کیوں آئی ہوگی۔ وہ چودھری امانت علی کی رشتہ کی بہن تھی جو بیوہ ہونے کے بعد حویلی ہی میں رہ رہی تھی۔ اس کے ساتھ جوان لڑکی عارفہ اس کی بیٹی تھی۔ کتنے کو اللہ رکھی چودھری امانت کی رشتہ کی بہن تھی لیکن بس ہی لوگ جانتے تھے کہ وہ اس حویلی میں نوکران کی طرح رہ رہی تھی۔

”آپ لوگوں سے ملنے کو تو بہت دل چاہتا ہے ملک جی۔“ اللہ رکھی نے جواب دیا۔ ”لیکن آپ جانتے ہیں چودھری صاحب ناراض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں جن سے میں نہیں ملتا دوسرے رشتہ دار کیوں ملیں۔“

”بڑھاپے میں اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ ملک صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تو بیٹو بہن۔“

”نہیں ملک جی۔“ اللہ رکھی نے جواب دیا۔ ”میں تو چھوٹی بی بی کو لینے آئی ہوں۔“

میں وہ ساری زمینیں ان کسانوں میں مفت تقسیم کر دوں گی جو نسل در نسل ان زمینوں پر شب و روز محنت کر رہے ہیں اور اس کے باوجود ان زمینیں تک کو محتاج ہیں۔“

”نایاب بہن۔“ ملک صاحب کے بیٹے سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہاں کے لوگوں کے لیے انہی ہیں اور یہ خاندانی جھگڑا کئی سال سے چل رہا ہے۔“ یہاں کے لوگوں نے آپ کو دیکھا بھی نہیں لیکن اس کے باوجود اکثریت کو آپ سے ہمدردی ہے۔ لوگوں کو سرفراز چودھری کے قتل کا بھی دکھ ہے۔ وہ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ اسے کس نے مروا یا تھا۔ وہ اس خاندان کا ایک ایسا فرد تھا جس کے دل میں غریب کسانوں اور کاشتکاروں کے لیے ہمدردی تھی۔ وہ چھٹیوں میں جب بھی شہر سے آتا اس کا زیادہ وقت انہی غریب کاشتکاروں کے ساتھ گزرتا۔ وہ ان کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتا، ان کی مالی مدد کرتا اور ان کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہوتا۔ اس گاؤں کی تین لڑکیاں تو ایسی ہیں جن کی شادیاں اس نے اپنے خرچ پر کرائی تھیں۔ چودھری سعادت کو اس کی یہ باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ وہ اکثر سرفراز کو ٹوٹا رہتا تھا کہ ان غریب مزارعوں کے ساتھ نہ بیٹھا کرے۔ بے تکلف ہونے کے بجائے اپنے اور ان کے درمیان اتنا فاصلہ رکھے جو کسی جاگیردار اور مزارع کے درمیان قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس نے باپ سے بھی کئی مرتبہ شکایت کی تھی کہ سرفراز کو ایسی حرکتوں سے روکا جائے، وہ جاگیردار دے گا۔ چودھری امانت نے بھی سرفراز کو کئی مرتبہ ٹوکا تھا لیکن وہ عجیب فطرت کا آدمی تھا۔ پیدا تو دولت مند گھرانے میں ہوا تھا لیکن غریبوں کے سچ میں بیٹھ کر اسے عجیب سی خوشی ہوتی تھی۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہاں کے لوگ آپ کو نہیں جانتے لیکن سرفراز چودھری کے ساتھ جو کچھ ہوا اور آپ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب جانتے ہیں۔“ ان حالات کے پیش نظر بس کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ پہلے آپ ایک ہفتہ یہاں رہ کر گئی تھیں۔ ان دنوں بھی گاؤں کی چند عورتوں کے سوا کسی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دو سال بعد آپ کو آپ یہاں آئی ہیں اور ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلیں لیکن یہ خبر پورے گاؤں کو ہو چکی ہے کہ چودھری امانت علی کی بسو بیلانی آگئی ہے۔ گاؤں کی عورتیں آپ سے ملنے کے لیے یہاں آ رہی ہیں اور جب لوگوں کو یہ پتہ چلے گا کہ آپ کے ارادے کیا ہیں تو یقین کیجئے اس گاؤں کی پوری آبادی

نایاب اندر داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بہت شاندار حویلی تھی۔ بہت بڑا کپاؤنڈ تھا جس کے وسط میں وسیع و عریض، خوبصورت لانا بنا ہوا تھا۔ لان کے دوسری طرف شاندار دو منزلہ عمارت تھی جس میں سنگ مرمر زیادہ سے زیادہ استعمال کیا گیا تھا۔ وسیع پورچ میں دو بچھائی ہوئی کاریں کھڑی تھیں۔ حویلی کے کپاؤنڈ میں کئی جگہوں پر لیپ پوسٹ لگے ہوئے تھے جن پر فینس برقی کٹمنے جھکا رہے تھے۔ دائیں طرف آخر میں سروٹ کوارٹر تھے۔ گٹ میں داخل ہوتے ہی ذرا آگے بائیں طرف دو بیڑ روزمر پر مشتمل ایک اور چھوٹی سی عمارت تھی۔ یہ سمان خانہ تھا۔ یہاں ان سمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا جن کا خاندان سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ سمان خانہ بھی ایک چھوٹے سے بنگہ کی طرح تھا۔ دو بیڑ روزمر کے علاوہ ایک وسیع ڈرائنگ روم اور لاؤنج بھی تھا۔ یہ سمان خانہ پوری طرح آراستہ تھا۔

”اس طرف آجائے چھوٹی لی بی۔“ نوکر نے سمان خانے کی طرف اشارہ کیا۔ نایاب ٹھک گئی۔ اسے اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اسے کس قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سمان خانے کی طرف مڑتے ہوئے اس نے حویلی کے برآمدے کی طرف دیکھا۔ وہاں دو عورتیں کھڑی تھیں۔ برآمدے میں بھی ٹیڈ لائٹ مل رہی تھی۔ روشنی میں نایاب نے ایک عورت کو پہچان لیا۔ وہ اس کی ساس آمنہ لی بی تھی۔ نایاب سمان خانے کے برآمدے میں آگئی۔ ملک صاحب بھی اس کے ساتھ تھے۔ چودھری کا ملازم ان سے پہلے ہی اندر جا چکا تھا۔ اس نے اندر جا کر ان کی آمد کا بتا دیا اور پھر دروازے سے باہر بھاگتے ہوئے بولا۔

”آئیے چھوٹی لی بی! اندر آجائیے۔“

نایاب برآمدے والے دروازے میں داخل ہو کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ حویلی کے چھانک میں داخل ہوتے وقت اس کے دل کی دھڑکن کچھ بڑھ گئی تھی اور اس دروازے میں قدم رکھتے ہوئے اس کی دھڑکن بے قابو ہو رہی تھی۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم بہت شاندار طریقے سے آراستہ تھا۔ اندر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک اس کا سر چودھری امانت علی جس کے چہرے پر خوشنودی نمایاں تھی۔ باقی دو آدمی اس کے لیے ابٹنی تھے لیکن نایاب کے خیال میں سرمنی شلوار سوٹ والا وکیل تھا

بڑے چودھری صاحب نے کہا تھا کہ وہ اپنا سامان لے کر آئے۔“ وہ گردن جھما کر نایاب کی طرف دیکھنے لگی۔

”کوئی خاص معاملہ ہے؟“ ملک صاحب نے اس طرح پوچھا جیسے کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔

”آپ تو سب کچھ جانتے ہیں ملک بی۔“ اللہ رکھی نے کہا۔ ”گھروالوں کی باتیں سن کر لگتا ہے ان کے دل میں کچھ خیال آگیا ہے اور چھوٹی لی بی!“ وہ ایک بار پھر نایاب کی طرف مڑ گئی۔ ”میرا خیال ہے وہ لوگ اس جھگڑے کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں بہت ہو چکا۔ مزید بات بڑھانے سے بد مزگی ہی پیدا ہوگی۔ اس لیے میں تمہیں بھی مشورہ دوں گی کہ ان کی بات مان کر اس جھگڑے کو ختم ہی کر دو۔“

”چھو پھو!“ نایاب نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ کہیں کہ سادہ کاند پر دستخط کر دو تو کیا مجھے کر دینے چاہئیں؟“

”نہیں چھوٹی لی بی! میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ اللہ رکھی نے کہا۔ ”میں تو کہتی ہوں کہ یہ جھگڑا ختم ہو جائے اور تم بھی اپنے گھر میں رہو۔“

”میں بے گھر تو نہیں ہوں پھر پھو!“ نایاب نے جواب دیا۔ ”اچھا۔ آپ چلیں میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“

اللہ رکھی بیٹی کو لے کر واپس چلی گئی۔ نایاب ملک صاحب اور سکندر سے مشورہ کرنے لگی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب وہ کرسی سے اٹھی تو ملک صاحب بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”چلو بیٹی! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”چلتے۔ مجھے کچھ حوصلہ رہے گا۔“ نایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

چودھری امانت علی کی حویلی زیادہ دور نہیں تھی۔ حویلی کے سامنے کشادہ گلی تھی۔ حویلی کی دیواریں کسی فیصل کی طرح بلند اور چھانک بہت اونچا تھا۔ چھانک اس وقت بند تھا مگر اس کا ذیلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ چودھری کا ایک ملازم دروازے میں کھڑا شاید نایاب ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ملک صلاح الدین کو دیکھ کر وہ ایک لمحہ کو جھجکا، پھر ان کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ رحمت اللہ تھا۔ اس علاقے کا پڑاری اور چودھری امانت کا گہرا دوست۔ ”چودھری صاحب نے تمہارے لیے ایک بیٹھک رکھی ہے۔ اگر اسے قبول کر لو تو یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتا ہے۔ وکیل صاحب! آپ بتائیے انہیں۔“ اس نے آخری الفاظ وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

وکیل نے اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی فائل اٹھا کر کھول لی۔ سب سے اوپر اسٹامپ پیپر تھا جس کے نیچے دوسرے کاغذ تھے۔ وہ چند لمبے اسٹامپ پیپر کو دیکھتا رہا، پھر اس نے فائل ٹایاب کی طرف بڑھا دی اور ساتھ ہی جین جیب سے نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔

”پتلے پڑھ لیجیے بی بی! اس کے بعد۔۔۔۔۔“

”وکیل صاحب!“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ نے تو جین اس طرح میرے سامنے رکھ دیا جیسے میں پڑھے بغیر دھندلا کر دوں گی۔“

”اسی لئے تو کہا ہے کہ پتلے پڑھ لیجیے۔“ وکیل نے کہا۔

ٹایاب فائل کا مطالعہ کرنے لگی۔ وہ جیسے جیسے پڑھ رہی تھی، اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو رہے تھے۔ بالآخر اس نے فائل کو میز پر رکھ دیا۔ چند لمبے خاموش رہی، پھر گہرا سانس لے کر وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”وکیل صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرے اور ان کے درمیان کیا تنازعہ چل رہا ہے؟“

”جی ہاں۔ جائیداد کا جھڑا ہے جسے یہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر ختم کرنا چاہتے ہیں اور میرا خیال ہے، یہ ایک مناسب تجویز ہے۔“ وکیل نے کہا۔

”میں نے اس جاگیر میں سے جس حصہ کا مطالبہ کیا ہے، اس کی مالیت کا بھی آپ کو اندازہ ہوگا۔“ ٹایاب نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ”اس تحریر کے مطابق اگر میں جائیداد میں سے اپنے حصے سے دستبردار ہو جاؤں اور ان کے خلاف تمام کھسڈ واپس لے لوں تو وہ جھگڑا ختم ہو جائے گا جس میں، میں اس وقت رہائش پذیر ہوں۔ کیا انہوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ جھگڑا میرے مرحوم شوہر سرفراز چودھری کے نام تھا۔ بیڑ شپ قانون کے تحت اب میرے نام منتقل ہو چکا ہے اور میں اس جھگڑے کی جائز اور قانونی مالک

جسے چودھری نے شہر سے ہٹا رکھا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھے کے ٹاپ والی نیپل پر ایک فائل بھی رکھی ہوئی تھی۔ تیسرا آدمی میز سے ذرا ہٹ کر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

ٹایاب نے اندر داخل ہوتے ہی سلام کیا تھا۔ وکیل اور دوسرے آدمی نے تو جواب دے دیا مگر چودھری امانت علی کے لیوں کو حرکت نہیں ہوئی۔ ملک صاحب نے بھی السلام علیکم کہتے ہوئے آگے بڑھ کر تینوں سے ہاتھ لایا تھا۔ ملک سے ہاتھ ملاتے ہوئے بھی چودھری امانت علی کے انداز میں سردمہری تھی۔ ٹایاب اور ملک صاحب ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

”امانت علی۔“ ملک صاحب چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”تمہاری بیو آئی ہے۔ تم نے اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ اس کے سر پر ہاتھ تو رکھ دو۔“

”میں نے اس لڑکی کو یہاں سو کی نشیبت سے نہیں بلایا۔“ چودھری امانت علی نے جواب دیا۔ اس کے لیے جین بھی سردمہری تھی۔ ”میرے اور اس لڑکی کے مابین کچھ تنازعہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں، یہ معاملات ختم ہو جائیں تاکہ میری بعض الجھنیں ختم ہوں اور یہ لڑکی بھی سکون سے زندگی گزار سکے۔“

”اس لڑکی کی زندگی اب بھی سکون سے گزر رہی ہے۔ کوئی بے سکونی نہیں ہے۔“ ٹایاب نے مدھم لیجے میں جواب دیا۔ ”میں لگتا ہے آپ کی الجھنوں میں اضافہ ہو چکا ہے۔“

”میں اس معاملے کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔“ چودھری امانت کے لہجہ میں کڑنگی تھی۔ ”جیسا کہ میں نے تمہیں خط میں بھی لکھا تھا کہ کچھ شرائط سے یہ معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔“

”گویا آپ مجھ سے کچھ اپنی شرائط منوانا چاہتے ہیں جبکہ میں اس پوزیشن میں ہوں کہ آپ سے شرائط منوا سکوں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”اور یہ بھی مت سمجھئے کہ میں آپ کے بلاوے پر یہاں آئی ہوں۔ میں تو اپنے مرحوم شوہر کی زمینیں دیکھنے آئی ہوں۔ دو چار دن یہاں رہوں گی، پھر واپس چلی جاؤں گی۔ اسی دوران اگر آپ کوئی مسئلہ طے کرنا چاہتے ہیں تو میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔“

”بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں بنی۔“ وکیل کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی

اپنے ایک حریف زمیندار پر عاید کیا۔ وہ اگر معمولی آدمی ہوتا تو یہ لوگ اسے اب تک پھانسی لگوا چکے ہوتے لیکن دو سال مگزرنے کے بعد بھی پولیس اس کے خلاف جرم ثابت نہیں کر سکی۔ میں اس زمیندار کی وکالت نہیں کر رہی لیکن اس کیس میں اسے بے قصور سمجھتی ہوں۔ ان کی جاگیر کا ہر شخص جانتا ہے کہ سرفراز چودھری کو قتل کرنے میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ میں اس وقت یہاں کوئی نیا مسئلہ نہیں چھیڑنا چاہتی۔ میں یہ سب کچھ اس لیے بتا رہی ہوں کہ آپ کو صحیح صورتحال کا ادراک ہو سکے۔ جس شخص کو اپنی اولاد سے زیادہ دولت پیاری ہو، وہ کسی اور کا کیا خیال رکھے گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی، پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اس تحریر کے آخری پیراگراف میں یہ لکھا ہے کہ اگر میں ان کے بڑے بیٹے چودھری سعادت علی سے عقدہ خالی کر لوں تو سارے جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں نے سرفراز سے دولت کی خاطر شادی نہیں کی تھی کہ وہ مر گیا تو دوسرے بھائی سے شادی کر کے دولت پر قبضہ کرنے کی کوشش کروں۔“

دولت سے مجھے نہیں، انہیں زیادہ پیار ہے۔ یہ نہیں چاہتے کہ اس دولت میں کوئی اور شریک ہو۔ اس لیے انہوں نے اپنے بیٹے کی قربانی دے دی۔ یہ شرط لکھوائے ہوئے انہوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا ہوگا کہ ان کے ذہن میں منصوبہ کیا ہے۔ میں بتاتی ہوں۔“ وہ خاموش ہو کر چودھری امانت علی کی طرف دیکھنے لگی جو خاموش بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ نایاب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ان کا منصوبہ یقیناً یہ ہوگا کہ اگر میں چودھری سعادت سے عقدہ خالی کر لوں تو مجھے بھلا پھسلا کر یا کسی قسم کا دباؤ ڈال کر مجھ سے اپنے حصے سے دستبرداری کی تحریر لکھوا لی جائے گی اور اس کے بعد میرے ہاتھ میں طلاق نامہ تھا کر مجھے یہاں سے رخصت کر دیا جائے گا۔ آپ تو وکیل ہیں، مجھ سے زیادہ قانون جانتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے اس کے بعد میرے پاس کیا رہے گا؟ وکیل صاحب میں کوئی بے وقوف یا جاہل عورت نہیں ہوں۔ آپ نے بڑے اعتماد سے قلم آگے بڑھایا تھا کہ میں خاموشی سے اس کاغذ پر دستخط کروں گی لیکن میں ان شرائط میں سے ایک بھی شرط ماننے کو تیار نہیں ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ اگر غلوں اور پیار محبت سے معاملہ طے ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔“

ہوں۔“
”وہ بنگلہ ان کے روپے سے تعمیر ہوا تھا اور آپ کے نام اس کا انتقال غیر قانونی ہے۔ انہوں نے اس کے خلاف درخواست دے رکھی ہے اور چند روز میں فیصلہ ہونے والا ہے۔“ وکیل نے کہا۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ فیصلہ دو روز پہلے میرے حق میں ہو چکا ہے۔ اس فیصلے کی نقل انہیں ڈاک کے ذریعے بھیجی جا چکی ہے۔ جو ہو سکتا ہے، انہیں اب تک نہ ملی ہو۔ آپ کو ایک اور بات بھی بتا دوں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”بیزشپ قانون کے تحت میرے نام اس بنگلے کی منتقلی کے لیے تمام قانونی تقاضے پورے کیے گئے تھے۔ دو ہفتے پہلے تین بڑے اخبارات میں یہ نوٹس شائع کرائے گئے تھے کہ اگر کسی کو کوئی اعتراض ہو تو متعلقہ آفیسر سے رجوع کیا جائے۔ وہ اخبارات یہاں بھی آتے ہیں۔ انہوں نے وہ نوٹس نہیں پڑھے تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے نا اور بعد ازاں وقت کسی کارروائی کا نتیجہ تو یہی ہوتا ہے۔ اب میں قانونی طور پر اس بنگلے کی وارث اور مالک ہوں۔ اس لیے اسے سچ میں لانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب چودھری صاحب یہ بتائیں کہ مجھے اس جائیداد میں سے کیا حصہ دے رہے ہیں؟“
وکیل خاموش ہو کر چودھری امانت علی کی طرف دیکھنے لگا۔ پیر نایاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”انہیں ابھی تک اس فیصلے کی نقل نہیں ملی لیکن چلے یہ مان لیں کہ اس بنگلے کا فیصلہ آپ کے حق میں ہو چکا ہے لیکن شاید آپ نے آخری پیراگراف پر غور نہیں کیا؟“ وکیل نے کہا۔

”میں نے اس تحریر کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا ہے۔“ نایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے انہوں نے صورتحال کے بارے میں آپ کو مکمل طور پر اندھیرے میں رکھا ہے۔ میرا شوہر سرفراز چودھری ان کا چھوٹا اور سب سے لاڈلا بیٹا تھا۔ اس نے ان کی مرضی کے خلاف شادی کر لی تو انہیں برا دکھ ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے طلاق دلوانے کے لیے اپنے بیٹے پر طعنہ طرح سے دباؤ ڈالا، اسے جائیداد سے عاق کر دینے کی دھمکیاں بھی دی تھیں اور پھر دہی ہوا، اسے قتل کروا دیا گیا۔ مگر کہ انہوں نے اپنے بیٹے کے قتل کا الزام

اس دوران مجھے کچھ ہو گیا تو اس کی تمام تر ذمہ داری میرے سر چودھری امانت علی اور ان کے بڑے بیٹے چودھری سعادت پر ہوئی اور چودھری صاحب....." وہ سر کی طرف مڑ گئی۔ "میں ملک انکل کے گھر قیام پذیر ہوں اور اس دوران اگر میرے حصے کی ادائیگی کے سلسلے میں کوئی ٹیک خیال ذہن میں آئے تو مجھے پیغام بھجوا دیجئے۔ پتلے ملک انکل!" اس نے آخری الفاظ ملک صاحب سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

ملک صلاح الدین اس سادی منتھو کے دوران خاموش ہی بیٹھا رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ اٹھ کر خاموشی سے ٹایپ کے ساتھ ڈرائنگ روم سے باہر آگیا۔ وہ مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے واپس آگئے۔

"میکنڈ۔ کھانا لگاؤ۔ بیٹی۔ ٹایپ بہن اور ابا جان واپس آگئے ہیں۔" سکندر نے انہیں دیکھ کر اپنی بیوی کو آواز لگائی۔ پھر وہ باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کوئی فیصلہ ہوا یا حاضری لگا کر آگئے؟"

"حاضری ہی گئی ہے۔" ملک صاحب نے برآمدے میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چودھری امانت بے وقوف آدمی ہے۔ اپنے بیٹے کے ہاتھوں کھیل رہا ہے۔ ٹایپ بیٹی سے کہہ رہا تھا کہ سعادت سے شادی کر لو۔ ہاں بے وقوفوں جیسی بات۔ اسحق سے اسحق آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس نے یہ بات کیوں کہی ہوگی۔ ویسے مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ آج وہ چٹھا دھاڑا نہیں۔"

"میرا خیال ہے ان میں اب زیادہ چیخنے دھاڑنے کی سکت نہیں رہی۔" ٹایپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کو شاید معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان کے خلاف مقدموں کی فہرست بہت طویل ہو چکی ہے اور یہ مقدمے ایسے نہیں کہ انہیں رشوت دے کر ختم کر دیا جا سکے۔ ابھی تو چند ہی پیشیاں سمجھتی ہیں۔ اگلی چند پیشیوں میں ہوش ٹھکانے آجائیں گے اور یہ بھول جائیں گے کہ وہ ایک بہت بڑے زمیندار ہیں اور وہ اپنی دولت سے سب کچھ خریدا کرتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی۔ دولت سے سب کچھ نہیں خریدا جا سکتا۔" ملک صاحب نے کہا۔ "لیکن ایک بات بتاؤں۔ میں امانت علی کو بچپن سے جانتا ہوں۔ ہم دونوں گھر سے دوست ہوا کرتے تھے۔ پہلے وہ ایسا نہیں ہوا کرتا تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد جب

آئے دن عدالتوں میں کھڑے رہنے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" وکیل نے کہا۔

"آپ ان کے وکیل ہیں۔ اس لیے یہ بات کہہ سکتے ہیں۔" ٹایپ نے کہا۔ "جہاں تک غلوں اور پیار محبت کا سوال ہے تو وہ میں پانچ سال سے دیکھ رہی ہوں۔ اس کا کچھ اندازہ تو ابھی آپ نے بھی لگا لیا ہوگا۔ مجھے گھر کے اندر لے جانے کے بجائے میاں لا کر بٹھا دیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب تک دینا گوارا نہیں کیا لیکن ایک بزرگ کی حیثیت سے میں اب بھی ان کا بہت احترام کرتی ہوں۔ اگر یہ اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں میری شرائط بلکہ صرف ایک شرط ماننی ہوگی۔ یہ میرا حصہ دیدیں، سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔"

"تمہاری یہ شرط میں نہیں مان سکتا۔" چودھری امانت علی نے پہلی مرتبہ جواب دیا۔ "ابھی میں زندہ ہوں۔ زبردستی مجھ سے حصہ نہیں لیا جا سکتا۔"

"میں بھی زندہ ہوں۔" ٹایپ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ "اس کیس کا فیصلہ بہر حال اب عدالت ہی میں ہوگا۔ میاں بیٹہ کر بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"سنو لکی۔" چودھری امانت علی بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اتنی اور چٹوٹی کا کوئی مقابلہ نہیں۔ تمہارے باپ کے پاس کیا ہے..... چند ہزار روپے ماہانہ تنخواہ اور دو مکان۔ جو اب تک نہیں کیے تو اگلی دو تین پیشیوں میں بک جائیں گے۔ ایسے مقدمات کے فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوا کرتے۔ تم اگر چاہو تو میں شہر والا دوسرا بھگہ بھی تمہیں دے سکتا ہوں۔ اس کی بابت بہتیش چاہیں لاکھ کے قریب ہے۔ وہ بنگلہ لے لو اور مقدمے بازی ختم کر دو۔"

"جس طرح آپ اس وقت مجھے وہ بنگلہ پیش کر رہے ہیں، بالکل اسی طرح ایک روز آپ جائیداد کا حصہ ہائٹ میں سجا کر مجھے پیش کریں گے۔" ٹایپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس پیشکش سے آپ کے دل کی بات بھی کھل کر سامنے آگئی ہے کہ آپ نے میرے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے اور وکیل صاحب! وہ وکیل کی طرف مڑ گئی۔ "آپ ان کی باتیں سن رہے ہیں اور آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس وقت میں بالکل ٹھیک اور سلامت میاں موجود ہوں۔ اپنے بیروں پر چل کر میاں آئی ہوں اور اپنے بیروں ہی پر چل کر اس وقت اس حویلی سے باہر جا رہی ہوں۔ میں چند روز اس گاؤں میں رہنا چاہتی ہوں اور اگر

سرفراز سعادت سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ یہ لڑکا اپنے باپ اور بھائی سے بالکل مختلف ثابت ہوا۔ اس کے دل میں بھردری کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خدی وہ بھی تھا لیکن اس کی ہر ضد نیکی کے لیے ہوتی۔ ماں اور باپ سے ضد کر کے پیسے لیتا اور غریبوں میں بانٹ دیتا۔ وہ جب بڑا ہوا تو مزید جھیل گیا۔ اناج، کپڑے اور دوسری چیزوں سے مزارعوں کی مدد کرنے لگا۔ مزارع اور کارندے خوش تھے کہ اس خاندان میں کوئی تو نیک انسان پیدا ہوا۔ سعادت ہدمزارع اور سخت گیر ہونے کے علاوہ ادب و ادب بھی تھا۔ وہ اکثر گاؤں کی لڑکیوں کو چھڑتا۔ اس نے اپنے چند ادب و ادب دوستوں کے ساتھ اپنے ایک مزارع کی بیٹی کی عزت لوٹی تو اس لڑکی نے گلے میں پھندہ ڈال کر غصہ خیزی کر لی۔ بات امانت علی تک پہنچی مگر اس نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ لڑکوں سے جوانی میں ایسی حرکتیں سرزد ہو ہی جاتی ہیں۔

ایک اور لڑکی نے کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ وہ اسکول ماسٹر کی بیٹی تھی۔ ماسٹر نے فوراً پورے قہانے میں سعادت علی کے خلاف رپورٹ لکھوا دی۔ پولیس یہاں آئی لیکن سعادت علی کا کچھ نہیں بگڑا۔ اس کے برعکس ماسٹر کو ڈرا دھمکا کر اس گاؤں سے ہی نکال دیا گیا۔

”ایک اور لڑکی کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ وہ بھی ان کے مزارع کی بیٹی تھی۔ سعادت علی اس پر دانت ڈاڑے بیٹھا تھا لیکن اس لڑکی نے اسے ایسا کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا بلکہ ایک موقع پر گلے میں دوسرے لوگوں کی موجودگی میں اس نے اس کے منہ پر تھپڑ بھی مار دیا اور پھر اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اس لڑکی کی شادی ہو گئی۔“

”لیکن سعادت علی اس تھپڑ کو نہیں بھولا تھا۔“ ملک صاحب کے خاموش ہونے پر ثایاب نے کہا۔ ”وہ مجھے کی کٹائی کا موقع تھا۔ کھیت میں ایک جگہ گڑبانے کے لیے آگ کے لادے پر گئے کے رس کا کڑاوا چڑھا ہوا تھا اور وہ لڑکی اکیلی وہاں بیٹھی آگ میں ایندھن جھونک رہی تھی۔ اس دوران سعادت علی اپنے دو دوستوں کے ساتھ اس طرف آگلا اور موقع پا کر انہوں نے لڑکی کو گھیر لیا۔ لڑکی نے سعادت علی کے منہ پر تھوک دیا جس پر سعادت علی نے اسے اٹھا کر کھولتے ہوئے کڑھاوا میں پھینک دیا۔“

”اوہ۔“ ملک صاحب بولے۔ ”یہ تو تمہاری شادی سے تقریباً چھ سینے پہلے کی بات ہے۔ تم اس واقعے کے بارے میں کیسے جانتی ہو؟“

اس نے جاگیر کا نظام سنبھالا تو اس وقت اس کی عمر صرف تیس سال تھی۔ وہ ہدمزارع ضرور ہوا کرتا تھا لیکن دل کا برا نہیں تھا۔ تمام مزارع اور کارندے بھی اس سے خوش رہتے تھے۔ بیچتیں سال کی عمر میں اس کی شادی ہو گئی اور اس کے ایک سال بعد وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ ہم دونوں کی شادیاں بھی آگے پیچھے ہوئی تھیں اور اولاد بھی دونوں کے ہاں ایک ڈیڑھ ہفتے کے وقفے سے ہوئی تھی۔ یہ میرا سکندر چودھری سعادت سے ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ چھوٹا ہے۔ ہرمال، سعادت کی پیدائش پر پوری جاگیر میں خوشیاں منائی گئیں۔ امانت علی نے دل کھول کر رویہ لٹایا۔ کوئی مزارع یا کارندہ ایسا نہیں تھا جو اس کی سعادت سے محروم رہا تھا۔

لیکن پھر جیسے جیسے بیٹا بڑا ہوتا گیا، امانت علی میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں۔ سعادت بہت خدی ہونے کے ساتھ ایک فہر کا جھوٹا بھی تھا۔ اس کی ہر ضد تو پوری ہو ہی جاتی تھی لیکن جھوٹ بولنے کی عادت بعض اوقات امانت علی کو بھی دوسرے کے سامنے شرمندہ کر دیتی۔ سعادت گاؤں کے دوسرے بچوں کو مار پیٹ کر آجاتا اور ماں سے کہتا اسے فلاں بچے نے بے قصور پیٹا ہے جس پر دوسرے بچوں کی پٹائی کر دی جاتی۔

چودھری امانت علی اپنے اس بیٹے کی وجہ سے بدلا چلا گیا۔ میٹرک کرنے کے بعد سعادت علی جاگیر کے انتظامی امور میں بھی مداخلت کرنے لگا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا تھا کہ مزارع اور کارندے فصل کی کٹائی کے موقع پر اناج کیوں لے جاتے ہیں۔ وہ بے وقوف ہے نہیں جانتا تھا کہ دن رات کام کرنے والے مزارع اسی ملے بھر اناج پر زندہ ہیں جو فصل کی کٹائی کے موقع پر انہیں دیا جاتا ہے۔

سعادت علی نے کارندوں اور مزارعوں پر سختی شروع کر دی۔ شروع میں جب کوئی مزارع یا کارندہ امانت علی کے پاس شکایت لے کر آتا تو امانت علی کسی نہ کسی طرح اس کی اشک شونی کر دیتا لیکن پھر وہ بھی بیٹے کی طرح ان پر سختی کرنے لگا۔

جس سال سعادت نے انتظام سنبھالا تھا، اس سال آمدنی بڑھ گئی۔ اس سے امانت علی کے دل میں طبع بھی بڑھ گئی اور وہ صرف اپنی آمدنی میں اضافے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کے مزارع اور کارندے کس بدحالی میں زندگی گزار رہے ہیں۔

دیا جائے کہ میری موت کسی حادثے کے نتیجہ میں واقع ہوئی ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی!“ ملک صاحب نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”معاذ علی جیسے شخص سے کچھ بھی بعید نہیں ہے اور چودھری نے یہ تجویز بھی یقیناً اسی کے مشورے پر رکھی ہوگی۔“

”یہ دولت اور جائیداد بہت بری چیز ہے انکل۔“ ثانیاب نے انکل۔ ”اس کی خاطر اپنی اولاد تک کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ سندھ میں بیٹیوں کی شادی قرآن پاک سے بھی کر دی جاتی ہے۔ یہ شادی عام طور پر بڑے گھروں اور دُوروں میں ہوتی ہیں۔ غریب طبقے میں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بیٹی کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں ملا تھا، اس لیے اس کی شادی قرآن سے کر دی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دُورے لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ان کی جائیداد اور زمینوں میں دلاؤ کی صورت میں کوئی اور حصہ دار پیدا ہو جائے۔ اس لیے جوان بیٹی کے اراکوں کا گلا گھونٹ کر قرآن مجید سے اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔“

”میں نے پہلے بھی ایک مرتبہ ایسی بات سنی تھی۔“ ملک صاحب نے کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے لیکن اسی وقت غدرہ آگئی۔

”کھانا تیار ہو چکا ہے۔ اب اٹھتے آپ لوگ۔“ اس نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چلو ثانیاب بیٹی۔“ ملک صاحب کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔ ”اب یہ لڑکی ہمیں ایک منٹ بھی یہاں نہیں بیٹھنے دی گے۔“

”ایک بات اور اباجی۔“ غدرہ نے کہا۔ ”کھانے کے بعد ثانیاب باہمی ہماری ہوں گی۔ میرا مطلب ہے کہ.....“

”میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔“ ملک صاحب نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ثنیاب اب بھی تمہاری ہے اور کھانے کے بعد بھی تمہاری ہی ہوگی۔“

وہ لوگ اس کمرے میں آگئے جہاں ڈاننگ نیپل لگی ہوئی تھی۔ میز پر کھانا بچا ہوا تھا۔ اشیا آمیز خوشبو سے ثانیاب کی بھوک چمک اٹھی۔ لیکن نہ کچھ زیادہ ہی تکلف کر ڈالا تھا۔ تین چار قسم کے سالن تھے اور دو ڈشیں میٹھے کی تھیں۔ اسی وقت سکندر بھی کمرے

”راشدہ نام کی وہ لڑکی اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی کی بیوی ہے۔“ ثانیاب نے جواب دیا۔

”میں اس سے مل چکی ہوں۔ میں دراصل کل رات کی ٹرین سے آئی تھی۔ ٹرین رات گیارہ بجے پہنچی تھی۔ میں چودھری امانت علی کے بلاوے پر یہاں آئی تھی اور میں نے خط کے ذریعے اپنے آٹے کا پروگرام بھی لکھ دیا تھا لیکن مجھے لینے کے لیے اسٹیشن پر کوئی نہیں پہنچا تھا۔ میں سمجھی تھی کہ یا تو میرا خط ہی نہیں ملا تھا یا اگر کوئی مجھے لینے کے لیے آیا بھی تھا تو ٹرین بہت زیادہ لیت ہوئے کی وجہ سے واپس چلا گیا تھا۔ بہرحال مجھے اکیلے پا کر اسٹیشن ماسٹر نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ پیشکش کی کہ میں رات اس کے کوارٹر میں گزار لوں۔ میرے پاس اس کی پیشکش قبول کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں ڈرتی ڈرتی اس کے کوارٹر میں چلی گئی اور پھر میری ملاقات اس کی بیوی راشدہ سے ہوئی۔ اسے دیکھ کر میں کانپ اٹھی۔ مجھے جرت تو یہ ہے کہ وہ زندہ کیسے ہے لیکن شاید یہ اس کے شوہر کی محبت ہے جو کونسل کی طرح بٹے ہوئے جسم سے روح کا رشتہ باقی ہے۔“

”ہاں۔ عبدالغنی واقعی اس سے بہت محبت کرتا ہے۔“ ملک صاحب نے کہا۔

”اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد دو گھڑ سوار وہاں آئے تھے۔“ ثانیاب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی کو گھر سے باہر بلا کر پوچھا تھا کہ کوئی عورت تو ٹرین سے نہیں اترتی۔ اگر اترتی تھی تو کمان گئی۔ اسٹیشن ماسٹر نے کہہ دیا تھا کہ اس ٹرین سے کوئی مسافر اترا ہی نہیں تھا۔“

”اچھا ہوا“ اس نے تمہاری موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا ورنہ وہ تمہارے ساتھ ان دونوں کو بھی ختم کر دیتے۔ تمہاری لاش غائب کر دی جاتی اور یہ کہا جاتا کہ تم بچر آباد پہنچی ہی نہیں تھی۔ اس طرح جائیداد کے ہزارے کا معاملہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا۔“

”میرے بارے میں جان کر اسٹیشن ماسٹر بھی شاید صورتحال کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اسی لیے اس نے میرے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا۔“ ثانیاب چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”اب چودھری امانت علی صاحب فرماتے ہیں کہ میں معاذت علی سے عقد ثانی کر لوں۔ کیا اس شادی کے چند روز چند ہفتوں یا چند مہینوں بعد پر اسرار طور پر میری موت واقع نہیں ہو جائے گی یا مجھے قتل کر کے ایسا رنگ میں دے دیا جائے گا جس سے یہ تاثر

کئے ہیں۔ کوئی اس طرف آنے کی ہرات نہیں کرے گا۔ چودھری سعادت نے اگر کوئی حماقت کی تو زندگی بھر بچتے گا۔ آپ جاکر سو جائیں، میں باہر موجود ہوں۔“

ٹایاب چونک سی گئی۔ اسے اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ انہیں چودھری امانت یا سعادت علی سے کسی قسم کا خطرو تھا اور یہ خائن کی انتقامات کر رہے تھے۔ ملک صاحب اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑے تو انہوں نے ٹایاب کو دیکھ لیا۔

”کیا بات ہے انکل؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹی۔“ ملک صاحب نے جواب دیا۔ ”گاؤں رہائش میں چودھری داکوؤں کا خطرو رہتا ہی ہے۔ میں سکدر سے یہی بات کر رہا تھا۔ جاؤ بیٹی تم سو جاؤ۔“

ٹایاب کمرے میں آگئی۔ نرمس اور عذرہ نے اسے اپنے بیچ میں لٹا لیا اور پھر باتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ملک صاحب اور سکدر کی باتیں سننے کے بعد ٹایاب سوتا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے وہ نرمس اور عذرہ سے باتیں کرتی رہی۔ باہر ذرا سی آہٹ بھی ہوتی تو وہ چونک جاتی۔

سائے بارہ بجے کے قریب دونوں ہمیں سو گئیں۔ ٹایاب اس کے بعد بھی کافی دیر تک جاگتی رہی اور بالاخر اس کی آنکھ لگ گئی۔

گاؤں کی زندگی شرے سے بڑی مختلف ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ صبح منہ اندھیرے اٹھ جاتے ہیں۔ جس وقت شرے کے لوگ دفتر جا رہے ہوتے ہیں، اس کاں اس وقت تک اپنے بہت سے کام نمٹا چکے ہوتے ہیں۔

ملک صلاح الدین کے گھر کے افراد بھی صبح سویرے ہی اٹھ جاتے تھے مگر ان کی مسمان ٹایاب دیر تک سوتی رہی۔ رات کو اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے تھے جن کی وجہ سے وہ دیر تک جاگتی رہی تھی۔

ٹایاب کمرے سے باہر نکلی تو آنگن میں دھوپ بھیلی ہوئی تھی۔ نرمس اور عذرہ برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں اور سیکند ملازم سے آنگن کی صفائی کروا رہی تھی۔

”ناشتہ بناناں ٹایاب بائی؟“ عذرہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بھئی۔ رات کو پیٹ بھر کر کھانا کھا تھا۔ اب پھر بھوک لگ رہی ہے۔“ ٹایاب

میں داخل ہوا اور کھانا شروع ہو گیا۔

کھانے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں لیکن یہ باتیں اب چودھری چیل کے بارے میں نہیں تھیں۔ بھتیجی ہاڈی کے حوالے سے مشکوہ ہو رہی تھی۔ سکدر بتا رہا تھا کہ کس موسم میں کون کون سی فصلیں ہوتی ہیں۔

”میں نرمی پانی کی کچھ کی ہے۔“ اب ملک صاحب بات کر رہے تھے۔ ”پانی پورا نہ ہونے کی وجہ سے فصلوں کو بھی نقصان ہوتا ہے اور زمینداروں میں جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ اٹھارہ انیس سال پہلے میں نے اور چودھری امانت علی نے مل کر کھلی کے حصول کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ ٹیوب ویل لگ جانے سے ہمارا پانی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ نورپور پاور ہاؤس سے یہاں تک چھ میل کا فاصلہ ہے۔ یہاں تک لائن ڈالنے اور دوسرے اخراجات میں نے اور چودھری امانت علی نے اپنی جیب سے ادا کیے۔ اس سے نہ صرف ہمیں بلکہ علاقے کے دوسرے چھوٹے زمینداروں کو بھی فائدہ ہوا ہے۔“

ان کی باتوں سے ٹایاب کی معلومات میں خاصا اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ لٹاج پیدا کرنے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔

کھانے کے بعد عذرہ اور اس کی بڑی بہن نرمس ٹایاب کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ یہاں گنگ سائز ڈبل بیڈ تھا۔ دونوں ہمیں یہیں سویا کرتی تھیں اور وہ ٹایاب کو بھی اپنے ساتھ ہی سلاتا چاہتی تھیں۔

”اسے لڑکیو! کیونکہ نہ کمرے میں داخل ہو کر کہا۔“ ٹایاب کو الگ بستر ہونے دو۔ تم دونوں رات بھر اسے باتوں میں لگائے رکھو گی اور سوتے نہیں دو گی۔“

”کوئی بات نہیں بھابھی۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بیڈ خاصا بڑا ہے۔ میں ان کے ساتھ ہی سو جاؤں گی۔“

گھر کے فرنیچر کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی گاؤں میں ہے۔ ٹایاب کچھ دیر تک نرمس اور عذرہ سے باتیں کرتی رہی، پھر اٹھ کر باہر آگئی۔ وہ ہاتھ دھو کر دریاں آ رہی تھی کہ برآمدے کے دوسرے سرے پر ملک صاحب اور سکدر کو باتیں کرتے دیکھ کر رک گئی۔ ان دونوں کے رخ دوسری طرف تھے اور سکدر کہہ رہا تھا۔

”ابا جی آپ بالکل غر نہ کریں۔ میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔ میرے بندے پہنچ

معاملہ جانیداد کا ہے۔ اس قتل میں چودھری سعادت کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ ایس ایس پی کے حکم پر مقامی پولیس نے چودھری سعادت کو بھی شامل تفتیش کر لیا تھا لیکن وہ بھتوں کے بعد پولیس نے اسے بے گناہ قرار دے کر تفتیش سے خارج کر دیا۔ جب تفتیشی آفیسری بددیانت اور راجی ہو تو صحیح رخ پر تفتیش کیسے ہو سکتی ہے۔ بہر حال مجھے یہاں آئے ہوئے چند گھنٹے ہوئے ہیں مگر ہر طرف سے میرے کانوں میں یہ آوازیں آرہی ہیں کہ چودھری سعادت اپنے بھائی کا قاتل ہے۔ میرا خیال تھا کہ آج میں واپس چلی جاؤں گی لیکن اب میں نے چند روز یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں خود معلومات حاصل کروں گی۔ اگر اس شخص کو ذرا بھی تقویت ملی تو شر جاکر اعلیٰ حکام سے رابطہ کر کے ازسرنو کیس کی تحقیقات کرواؤں گی۔ ویسے تم نے بتایا نہیں چھوچھو اللہ رکھی کیوں آئی تھی؟

”یونی۔“ آپ کو دیکھنے کے لیے۔“ زمر نے جواب دیا۔ ”بات کا رخ بدل گیا۔ میں کہہ رہی تھی کہ سعادت ہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ اگر یہ کانٹا نکل جائے تو چودھری انکل اور آئی آپ کو اپنی موت تسلیم کر لیں اور آج ہی آپ کو عزت و احترام سے اپنے گھر لے جائیں۔ اس خاندان کے بیشتر لوگ آپ کے حق میں ہیں لیکن سعادت کی وجہ سے زبان نہیں کھولے۔ ماسی اللہ رکھی بھی آپ کی حمایت میں ہیں لیکن وہ بچاری بہت مجبور ہیں۔ منہ سے ایک لفظ نہیں نکال سکتیں۔“

”گو کیا زور اس بات پر ہوا کہ میری بریادی کا ذمہ وار صرف اور صرف چودھری سعادت ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔

”جی ہاں۔“ زمر نے سر ہلایا۔ ”چند روز یہاں رہنے کا ارادہ ہے تو ذرا غماخ رہنے گا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ خود سامنے نہیں آئے گا۔ اپنے لوگوں کے ذریعے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ وہ بہت بد معاشر آدمی ہے۔“

”اس کا اندازہ مجھے ہو چکا ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”مگر میں بزدل ہوتی تو اکیلی یہاں نہ آتی۔ بہر حال میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گی اور غماخ رہوں گی۔ ویسے انکل کہاں ہیں؟“

”وہ تو ذریعے پر گئے ہوئے ہیں۔“ زمر نے جواب دیا۔

”اور ذریعہ کہاں ہے؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

نے کہا۔ ”میں ہاتھ روم سے ہو کر آئی ہوں۔ تم ناشتہ تیار کرو۔“ اور پھر تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ برائے میں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ عذرہ اور زمر بھی اس کے ساتھ تھیں۔ ٹایاب کے انتظار میں انہوں نے بھی ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تھا۔ ناشتے کے دوران عذرہ بتا رہی تھی کہ گاؤں کی کئی عورتیں اس سے ملنے کے لیے آئی تھیں۔

”اس کے علاوہ کوئی اور خبر؟“ ٹایاب نے مسکرا کر پوچھا۔

”آپ کے لیے ایک اہم خبر یہ ہے کہ چودھری انکل کا وکیل آج صبح سویرے واپس چلا گیا ہے۔“ زمر نے بتایا۔

”اسے تو جانا ہی تھا۔ وہ مستقل طور پر یہاں رہنے کے لیے تو نہیں آیا تھا۔“ ٹایاب نے کہا۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ زمر نے کہا۔ ”صبح ماسی اللہ رکھی بھی آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ رات کو آپ لوگوں کے اپنے کے بعد چودھری انکل اور وکیل میں خوب گہرا گرم بحث ہوئی تھی۔ وکیل نے کہا تھا کہ اسے حالات کے بارے میں مکمل طور پر اندھیرے میں رکھ کر اس سے غلط کام لینے کی کوشش کی جا رہی ہے اور وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس سے اس کی نیک نامی پر حرف آئے۔ اس لیے وہ واپس چلا گیا۔“

”چھوچھو اللہ رکھی کیوں آئی تھی؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”یونی۔“ زمر نے کہا۔ ”ویسے آپ کو ایک بات بتاؤں۔ چودھری انکل اور آئی بری نہیں ہیں۔ فساد کی جڑ تو سعادت علی ہے۔ یہ سارا ہنگامہ اسی کا کھڑا کیا ہوا ہے۔ وہ اکیلا اس جاگیر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لیے تو اس نے سرفراز بھائی کو.....“ وہ کہتے کہتے رک ٹپک پڑ گیا، پھر ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے وہ مدھم لمبے میں پڑی۔ ”معاف کرنا بائی۔ میں آپ کے زمنوں کو نہیں چھیڑتا چاہتی لیکن دسے لفظوں میں ہر شخص یہی کہہ رہا ہے کہ چودھری سعادت ہی نے بھائی کو مروا دیا تھا۔“

”مجھے بھی شروع ہی سے یہ شبہ ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”لیکن صورتحال یہ ہے کہ جب یہ افسوسناک واقعہ ہوا، میں یہاں نہیں تھی۔ پولیس نے نہ معلوم افراد کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کیا تھا۔ میں نے علاقہ کے ایس ایس پی کو ایک تحریری درخواست دی تھی کہ

طرف تقریباً دس کیتوں کی زمیںیں خالی اور بھر نظر آ رہی تھیں۔ اس پوری زمین پر سفید پاؤڈر سا بکھرا ہوا تھا۔

”اس زمین کی مٹی سفید کیوں ہے؟“ ثایاب نے پوچھا۔

”یہ قصور ہے ثایاب بانی۔ اسے کبھی نہیں جانتے ہیں۔“ عذرہ نے بتایا۔

”یہ کھر زمین کو کھا جاتا ہے۔ اس جگہ گھاس بھی پیدا نہیں ہوتی۔ جہاں کھر ہوگا وہاں زمین بھر اور دیران ہوگی۔ پہلے تو بہت بڑا رتہ اس کھر کی وجہ سے بھر پڑا تھا۔ ابا جان نے بڑی محنت کی ہے اس زمین پر۔ دوائیں اور کیمیکل ڈال ڈال کر اس زمین کو قابل کاشت بنایا ہے۔ یہ تھوڑا سا کھوارہ گیا ہے، یہ بھی انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

مگروا ندی کے اس طرف تمہاری زمین شروع ہو جاتی ہے اور یہ زمین جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں؟“ ثایاب نے پوچھا۔

”آپ کی ہے۔“ عذرہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ دونوں پانی میں ہیر ہلاتے ہوئے بائیں کر رہی تھیں کہ ثایاب چونک کر اس بھر زمین کے کنارے کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک نیلا اور سانپ کھیت سے نکل کر اس بھر زمین پر آگئے تھے۔ نیلا سانپ پر حملہ کر رہا تھا اور سانپ مل کھا کھا کر اپنے آپ کو پھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ موقع پا کر وہ بھی نیلے پر حملہ کر دیا۔ ثایاب حیرت سے سانپ اور نیلے کی لڑائی دیکھ رہی تھی۔ اس لڑائی میں نیلے کا پلڑا بھاری نظر آ رہا تھا۔

ثایاب کو زیادہ حیرت سانپ کو دیکھ کر رہی تھی۔ وہ سانپ لمبائی میں تقریباً ایک فٹ اور بالکل سنہری رنگت کا تھا۔ اس کی موٹائی ایک انچ کے قریب تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سونے کی ایک موٹی سی زنجیر ہو۔ دھوپ میں وہ سونے ہی کی طرح چمک رہا تھا۔

ثایاب کچھ دیر تک یہ لڑائی دیکھتی رہی۔ پھر نبھائے اسے کیا ہوا کہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور ندی سے گزر کر دوسری طرف آگئی۔ اسے اس خوبصورت سانپ پر ترس آ گیا تھا جسے وہ بد شکل نیلا فٹم کر رہا تھا۔

ثایاب نے مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا اٹھا لیا اور آگے بڑھنے لگی۔ اسے بالکل خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پہلے نیلے کو ہشکاری رہی، پھر اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹی کا وہ ڈھیلا کھینچ مارا۔

”کیتوں میں۔“ زمس کے بجائے عذرہ بول پڑی۔ ”چلیں گی۔ وہاں اہلی کا ایک بہت بڑا درخت بھی ہے جو آج کل پھل سے لدا ہوا ہے۔ کچی اہلی۔ کنارے۔“ بات کرتے ہوئے عذرہ کے منہ میں پانی بھر گیا۔

”ابا جان سے ایسی ڈانٹ پڑے گی تاکہ روٹی روٹی واپس آؤ گی۔“ زمس نے اسے مگھورا۔

”ثایاب باقی ساتھ ہوں گی تو کوئی ڈانٹ نہیں پڑے گی۔ آخر وہ مسمان کا کچھ تو لحاظ کریں گے۔“

”تو چلو پھر چلیں۔“ ثایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آج کے دن میں ہمیں ڈانٹ سے بچنا ہو گا۔“

وہ دونوں تیار ہو کر حویلی سے باہر آئیں۔ گاؤں کی گلیاں کافی کشادہ تھیں لیکن کبھی ہونے کی وجہ سے جا بجا گڑھے تھے اور کئی جگہوں پر کچڑ پھیلا ہوا تھا۔ کچھ تنگ دھڑنگ بچے گلیوں میں کھیل رہے تھے۔ عورتیں اور مرد مزمر کر ثایاب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کئی عورتوں نے چھوٹی بی بی کہہ کر ثایاب کو سلام بھی کیا تھا۔ وہ دونوں مختلف جگہوں سے ہوتی ہوئی گاؤں سے باہر آئیں۔ گاؤں کے باہر ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس سے آگے کیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ کل ثایاب دوسری طرف سے گاؤں میں آئی تھی۔ اس طرف گاؤں کے باہر ایک نہریں تھی لیکن اس طرف نہر کے بجائے میدان تھا۔

”یہ چودھری انکل کی زمیںیں ہیں۔“ عذرہ تاری تھی۔ ”اس طرف آپ گھنٹوں چلتی رہیں تو ہمیں ان کی زمیںیں فٹم نہیں ہوتیں اور اس طرف کینو کا وہ باغ نظر آ رہا ہے ناں، وہ ہمارا ہے اور اس کے ساتھ والی زمیںیں ہماری ہیں۔ باغ کے ساتھ ہی ڈیرہ ہے۔ ابا اور سکندر بھائی وہیں ہوں گے۔“

ثایاب کے اندازے کے مطابق وہ باغ وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ دونوں کیتوں میں گھنٹہ بڑی پر چلتی رہیں۔ تیز دھوپ میں ثایاب کا لینے بنے لگا۔ عذرہ بھی دوپے سے بار بار چہرے کا لینے پونچھ رہی تھی۔

راستے میں تقریباً تین فٹ چوڑی ایک ندی تھی۔ عذرہ ندی کے کنارے پر بیٹھ گئی اور اس نے دونوں ہیر پانی میں لٹکا دیے۔ ثایاب بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ندی کے دوسری

میرے جسم میں پھیل جاتا اور میں ختم ہو.....“

”بس بس..... آگے کچھ مت کہئے۔“ عذرہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اب چلئے۔ مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے۔“

وہ دونوں ایک بار پھر گڈبندی پر ہوتے ہوئے کیتوں میں چلے گئیں اور باغ کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے تھوڑی ہی دیر بعد ڈیرے پر پہنچ گئیں۔

ٹاپلی کے درختوں کے نیچے ایک بت بڑا سائبان بنا ہوا تھا جس کے نیچے دو تین پان کی چار بانیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف بیسینیں بندھی ہوئی تھیں اور دو تین کارندے مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ سکندر یا ملک صاحب وہاں میں تھے۔ کارندوں نے ٹاپ باور عذرہ کو سلام کیا۔

”ابا جان کہاں ہیں؟“ عذرہ نے ایک کارندے سے پوچھا۔

”وہ نیوب ویل کی طرف گئے ہیں“ ابھی آتے ہی ہوں گے۔ آپ دونوں دھوپ میں آ رہی ہیں۔ پانی پلاؤں؟“ کارندے نے کہا۔

”ہاں۔ پلا دو۔ پیاس تو لگ رہی ہے۔“ عذرہ نے کہا۔

کارندے نے ٹپکے سے دونوں کو پانی پلایا۔ عذرہ ٹاپ کو اشارہ کرتی ہوئی ڈیرے کے پچھلی طرف آگئی جہاں املی کا ایک بت بڑا درخت تھا جو پھل سے لدا ہوا تھا۔ عذرہ اچھل اچھل کر نیچے جھکی ہوئی ایک شاخ کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگی لیکن املی تو اس کے ہاتھ میں نہیں آئی البتہ ایک کانٹا انگلی میں چبھ گیا۔ وہ انگلی کو منہ میں ڈال کر چوسنے لگی۔ اس وقت وہ کارندہ بھی اس طرف آیا۔

”غلام رسول۔ ہمیں کنارے توڑ کر دو۔“ عذرہ نے کہا۔

”آپ ملک صاحب کی ڈانٹ کو بھول گئی ہیں چھوٹی بی بی!“ غلام رسول نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے ساتھ اس دن مجھے بھی ڈانٹ پڑ گئی تھی۔“

”ابا اس وقت تو یہاں نہیں ہیں۔“ عذرہ نے کہا۔ ”اگر آج بھی گئے تو آج مجھے ڈانٹ نہیں پڑے گی۔ ٹاپ باجی میرے ساتھ ہیں۔“

غلام رسول نے مسکراتے ہوئے ایک شاخ پکڑ کر نیچے کھینچ لی اور تین چار کنارے توڑ کر عذرہ کو دے دیئے۔

دھیلا خاصا بڑا تھا۔ نیولے کی کرپر لگا۔ نیولے نے سانپ کو چھوڑ دیا اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ٹاپ کی طرف دیکھنے لگا۔ ٹاپ نے ایک اور دھیلا اٹھا کر مارا۔ نیولا دوڑتا ہوا کھیت میں گھس گیا۔

سنہری سانپ دھن پر بل کھا رہا تھا۔ سر سے تقریباً دو انچ نیچے نیولے کے دانٹوں کے نشان نظر آرہے تھے۔ ٹاپ آگے بڑھنے لگی۔

”ٹاپ باجی۔“ عذرہ دوری سے چیچی۔ ”کچھ ہیٹ جاؤ۔ سانپ ڈس لے گا۔“ ٹاپ کو سانپوں سے بت خوف آتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ زخمی سانپ زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے لیکن حیرت کی بات تھی کہ اس وقت اسے سانپ سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ اسے اس خوبصورت زخمی سانپ پر ترس آ رہا تھا۔

وہ سانپ کے قریب پہنچ کر جھکی اور آہستہ آہستہ ہاتھ آگے بڑھانے لگی۔ اس وقت اسے کچھ خوف محسوس ہو رہا تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ بل کھا رہا تھا۔ ٹاپ کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سانپ پر رکھ دیا۔

سانپ ایک دم تڑپ اٹھا۔ اس نے کنڈلی مار کر پھن پھلا لیا۔ اس کا پھن بھی بڑا خوبصورت تھا۔ دونوں طرف سیاہ رنگت میں خوبصورت ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔ سانپ نے پھن کو اس طرح جھکا دیا جیسے حملہ کرنا چاہتا ہو لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ گیا۔ اس کا پھن بھی سٹ گیا اور پھر وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا دائیں طرف والے کھیت میں گھس گیا۔ ٹاپ اسے پودوں میں جاتے دیکھتی رہی اور پھر وہ اچھل پڑی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی ہو۔

”تم نے میری جان بچائی ہے“ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

ٹاپ نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ عذرہ ندی کے کنارے پر بے حس و حرکت کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر وہ دوڑتی ہوئی ٹاپ سے لپٹ گئی۔

”تم بڑی بے وقوف ہو ٹاپ باجی۔“ وہ بولی۔ ”میں تمہیں دور رہنے کو سچ رہی تھی اور تم اس سانپ کو پکڑنے جا رہی تھیں۔ اگر وہ تمہیں ڈس لیتا تو؟“

”تو کیا ہو آ۔“ ٹاپ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”سانپ کا زہر

لوگوں کو صورتحال کا اندازہ ہو چکا ہے۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ اٹیٹ کو ہزارے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اسے بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ سعادت مجھ سے شادی کر لے اور بعد میں یا تو مجھے طلاق دے دے یا کسی پر اسرار طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دے اور آپ جانتے ہیں کہ میں اپنی جان تو دے سکتی ہوں لیکن نہ تو سعادت پیسے بد قماش اور بد کردار شخص سے شادی کروں گی اور نہ ہی اپنے حصے سے دستبردار ہوں گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی دولت کہاں تک ان کا ساتھ دیتی ہے۔

”بہر حال۔“ ملک صاحب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”میں نے سعادت سے کہہ دیا تھا کہ تم اس کی یہ شرط نہیں مانو گی۔ بہتر یہ ہے کہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے کر لیا جائے اور ٹایاب کا حصہ اسے دے دیا جائے لیکن وہ کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہیں۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”پھر اس کا فیصلہ عدالت ہی کرے گی۔“

ملک صاحب کچھ دیر دباں بیٹھے رہے، پھر اٹھ کر ایک کارندے کے کام میں اس کی مدد کرنے لگے۔ ٹایاب اور عذراء تقریباً ایک گھنٹہ ڈیرے پر رہیں اور جب وہ واپس جانے لگیں تو ملک صاحب نے غلام رسول کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوئیں تو ایک گلی میں سانسے سے چودھری امتی علی کو آتے دیکھ کر ٹایاب رک گئی۔ چودھری کے ساتھ دو تین آدمی اور بھی تھے۔ جب وہ قریب پہنچا تو ٹایاب نے اپنے سر کو سلام کیا لیکن چودھری جواب دینے بغیر منہ پھیر کر آگے نکل گیا۔ حولی میں دو تین عورتیں موجود تھیں جو ٹایاب ہی سے ملنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ چودھری فیملی نے گاؤں میں یہ بات پھیلا دی تھی کہ ٹایاب چودھری سعادت سے شادی پر آمادہ ہو گئی ہے۔ اس شادی کے بعد سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

”کیا یہ سچ ہے چھوٹی بی بی؟“ رخت بی بی نام کی ایک عورت نے کہا۔ ”کیا تمہیں مطمئن نہیں کہ نئے چودھری تم سے شادی کیوں کرنا چاہتا ہے؟“

”میں سب جانتی ہوں لیکن یہ جھوٹ ہے۔ میں نے شادی کی کوئی بات نہیں کی۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں کسی ایسے شخص سے شادی کر سکتی ہوں جو میری بربادی کا ذمہ دار ہے۔ جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ میرے شوہر کو قتل

”ہاں یہ کافی ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کا گلا پھلے ہی خراب رہتا ہے۔“

عذراء نے وہ کٹارے ٹایاب کو دے دیئے۔ ٹایاب نے دانتوں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑا۔ کٹائی سے اس کے جڑوں میں عجیب سی سنسنیات ہونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ملک صاحب بھی آگئے۔ وہ ٹایاب کو یہاں دیکھ کر حیران بھی ہوئے تھے۔

”تمہیں یہ بلا اپنے ساتھ لے کر آئی ہوگی۔“ ملک صاحب نے مسکراتے ہوئے عذراء کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ اہلی کھانے کے لیے یہاں آئی ہے۔ دیکھو! اب بھی منہ میں بھڑک رہی ہے۔ اسے مطمئن نہیں کہ اگر گلا زیادہ خراب ہو گیا تو آپریشن کرانا پڑے گا۔“

”نہیں ہو گا تو خراب۔“ عذراء نے اٹھلا کر جواب دیا۔

”آؤ ٹایاب بیٹی، اس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔“ ملک صاحب نے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں ساتیان کے پیچھے چارپائیوں پر آئے سانسے بیٹھ گئے۔ عذراء غلام رسول کو ساتھ لے کر اہلی توڑنے کے لیے ڈیرے کے پچھلے طرف چلی گئی۔

”مجھ چودھری سعادت یہاں آیا تھا۔“ ملک صاحب نے ٹایاب کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”اوہ۔“ ٹایاب چونک گئی۔ ”اس نے آپ کو دھمکی دی ہوگی کہ مجھے اپنے گھر سے نکال دیں۔“

”نہیں۔ مجھے وہ ایسی دھمکی نہیں دے سکتا۔“ ملک صاحب نے جواب دیا۔ ”وہ جانتا ہے کہ میں کدوڑ نہیں ہوں۔ ان پیسے لوگوں سے ہر لحاظ سے نٹ سکتا ہوں۔“

”تو پھر وہ کیوں آیا تھا یہاں؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”وہ کہہ رہا تھا کہ تم نے اس سے شادی سے انکار کر کے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں شادی والی وہ شرط بجا لیل و حجت مان لینی چاہیے تھی۔“ ملک صاحب نے کہا۔

”جانیو! وہ تعظیم ہونے سے بچانے کے لیے ابھی ایک حبیہ رہ گیا ہے ان کے پاس۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”اس کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ نہیں جس سے وہ اپنی جائیداد بچ سکیں۔ میں سرفراز چودھری کی جائز وارث ہوں۔ اس کے نام کا حصہ حاصل کرنا میرا حق ہے۔ شہر والا وہ بھگت جو سرفراز کے نام تھا، میرے نام منتقل ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جاگیر میں سے حصہ حاصل کرنے میں بھی مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ان

نمایاں تھی۔

”تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو کہ میں کیوں آئی ہوں۔“ ٹایاب نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ سعادت بولا۔ ”تم یہ خیال ذہن سے نکال دو کہ تم ان زمینوں پر چودھرائی کی طرح سیر کر سکو گے۔ البتہ بابا نے تمہارے سامنے ایک شرط رکھی تھی۔ اگر تم وہ شرط مان لو تو اس ایٹھ کی مالک بننے کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔“

”وہ شرط۔“ ٹایاب نے اسے گھورا۔ ”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری وہ شرط مان سکتی ہوں۔ ری ایٹھ کی بات تو میں خوابوں کی دنیا میں نہیں، حقیقت کو زیادہ پسند کرتی ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ میں اب بھی ایٹھ کی مالک ہوں۔“

”یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔“ سعادت بولا۔

”میں خواب نہیں حقیقت کی بات کر رہی ہوں۔ اس ایٹھ پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا۔ یعنی آدھے کی مالک۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔

”میں سب کچھ بھول کر تم سے سمجھو نہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ شرط مان لو تو تم پوری ایٹھ کی مالک بن جاؤ گی۔“ سعادت نے کہا۔

”کیا تم اپنے آپ کو اس قاتل سمجھتے ہو کہ کوئی شریف عورت تم سے شادی کر کے؟“ ٹایاب نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنے آپ کو اس قاتل رکھا ہی کب ہے۔ تم کتنے گھربلاؤں کا بچہ ہو۔ تمہاری وجہ سے کتنی معصوم لڑکیاں نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا۔ ارشدہ کا چہرہ تو اب بھی میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ ان سارے کارناموں کے بعد بھی تم سمجھتے ہو کہ کوئی شریف لڑکی تم سے شادی کے بارے میں سوچ سکتی ہے۔“

”اوہ۔“ سعادت چونک گیا۔ ”تو تم اس رات اسٹیشن پر پہنچ گئی تھیں اور وہ رات تم نے اسٹیشن ماسٹر کے گھر میں گزاری تھی۔“

”ہاں۔ میں اس وقت بھی وہیں تھی جب تمہارے دو آدمی مجھے تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”تم انسان نہیں وحشی ہو۔ مجھے یہ سب کچھ کہنے ہوئے افسوس ہوتا ہے لیکن میں اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتی اور میرے بارے میں ایک اور بات

کروانے میں اس کا ہاتھ ہے۔ نہیں مای۔ یہ سب بھوت ہے۔ میں نے شادی کی کوئی بات نہیں کی۔ البتہ وہ لوگ ایسا ضرور چاہتے ہیں تاکہ ان کی جائیداد تقسیم ہونے سے بچ جائے۔“

”ان کی بات کبھی ماننا بھی مت۔ بڑے ظالم ہیں یہ لوگ۔“ رحمت بی بی نے کہا۔ اس روز شام تک گاؤں کی عورتیں آتی رہیں۔

دوسرے روز ناشتہ کرنے کے بعد ٹایاب کھیتوں پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہنی تھی اور اوپر دوشدہ پہنایا لیا تھا۔ آج وہ ان زمینوں پر جانا چاہتا تھا جو چودھری جلی کی ملکیت تھیں۔

وہ چوٹی سے آگلی ہی نکلے اور گھیراں سے ہوتی ہوئی نہری طرف گئی۔ پلایا پار کر کے و کھیتوں میں گھڑیوں پر اس طرح ٹھٹھلے گئی جیسے کوئی زمیندار اپنی فصلوں کا جائزہ لے رہا ہو۔

کھیتوں میں ادھر ادھر لوگ کام کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک دو مزارعوں کے قریب رہی کئی تھی۔ انہوں نے اسے چھوٹی بی بی کہہ کر سلام بھی کیا تھا۔

ٹایاب کھیتوں میں خلعتی ہوئی بہت دور نکل آئی تھی۔ دوشدہ اس نے سر سے اتار کر گلے میں اس طرح ڈال لیا تھا کہ اس کے دونوں پلو آگے کی طرف دائیں بائیں نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ دھوپ کی وجہ سے وہ پیپے سے تر ہو رہی تھی اور دوشدے کے پلو سے بار بار چہرے کا پینڈ پونچھ رہی تھی۔

وہ ٹاہلی کے ایک درخت کے نیچے رک گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تاحد نگاہ اہلکار ہوئی فصلیں بہت بھلا منظر پیش کر رہی تھی۔

دو گھنٹہ ایک گھڑ سوار کو اس طرف آتے دیکھ کر وہ چونک گئی۔ وہ سفید گھوڑا تھا جو کھیتوں کے درمیان گھڑیوں پر بڑے اطمینان سے ٹھٹھا ہوا آ رہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو سوار کو دیکھ کر ٹایاب کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ چودھری سعادت تھا۔

درخت کے نیچے پہنچ کر اس نے گھوڑا ردک لیا۔ چند لمبے گھوڑے پر ہی بیٹھا رہا۔ اسے گھوڑا تھا۔ پھر نیچے اتار آیا اور گھوڑے کی نگاہ چھوڑ دی۔

”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ اس نے ٹایاب کو گھورتے ہوئے کہا۔ لمبے میں سرودھری

چودھری سعادت جائیداد کو تقسیم ہونے سے بچانے کے لیے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور شاید اسی لیے اس کا انداز تھوڑا سا بدل گیا لیکن نایاب باجی تھی کہ وہ کس قدر کینہ پرور ہے۔ کبھی کبھی باتیں اور صاف جواب سننے کے بعد وہ اگرچہ دہاں سے چلا گیا تھا لیکن اس سے یہ توقع نہیں تھی کہ آئندہ بھی وہ اسی شرافت کا مظاہرہ کرے گا۔

نایاب اگرچہ رات کو دیر سے سوئی تھی لیکن خلاف معمول صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ نرمس اس سے پہلے اٹھ کر کمرے سے جا چکی تھی۔ البتہ عذرہ ابھی تک سو رہی تھی۔ نایاب دیکھ کر ہنس بڑبڑا لیتی رہی، پھر اٹھ کر باہر آئی۔ اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا اور سنہری دھوپ پھیل رہی تھی۔ ملک صاحب اور سکندر کچھتوں میں جا چکے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد نایاب برآمدے میں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی کہ ملک صاحب کے ایک کارندے کی بیوی فاطمہ ایلوں کا گھر سر پر لادے حویلی میں داخل ہوئی۔ اس نے گھر ایک طرف دیوار کے قریب پیچیدک اور اور گردن سلاتی ہوئی برآمدے کی طرف آگئی اور کینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”اندھیرے بی بی بی اندھیرے“

”کیا ہوا فاطمہ.....؟“ کینہ نے پوچھا۔

”کیا بتاؤں بی بی کیا اندھیرا ہو گیا ہے۔“ فاطمہ متحانہ لہجے میں بولی۔ ”اس بھاریے کی بیوی کو خالوں سے پھلے ہی چلا دیا تھا۔ اب اسے بھی چلا کر مار ڈالا۔“

”کیا ہوا؟ کس کی بات کر رہی ہو؟“ کینہ نے پوچھا۔

”نیشن ماسٹر کی۔“ فاطمہ نے جواب دیا۔ ”پانچ سال پہلے چودھری کے بڑے بیٹے نے راشدہ کو اٹھا کر کھولے ہوئے کمرے میں پیچیدک دیا تھا۔ وہ بھاریے اب تک نہانے کس طرح زندہ تھی۔ رات کو کسی نے نیشن ماسٹر کے کوارٹر کو ٹنگ لگا دی۔ ٹنگ لگانے سے پہلے دروازوں کو باہر سے کدے لگا دیے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی جل کر کوئلہ ہو گئے۔ بڑی پولیس آئی ہوئی ہے نیشن پر۔“

نایاب کے ہاتھ سے نوالہ پھوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم راشدہ کا چلا ہوا بھیاک چہرہ گھوم گیا۔ بٹے ہوئے اس خوفناک چہرے میں بھی کتنا خلوص تھا اور پھر اشیش ماسٹر عبدالحی..... کتنا بدرد انسان تھا وہ۔ کتنی محبت تھی اسے اپنی بیوی سے۔ بیوی کی شکل گھرنے کے بعد بھی وہ اسے پہلے ہی کی طرح چاہتا تھا اور بالا خرہ وہ دونوں اکٹھے ہی

بھی ذہن میں رکھ لیتا۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو ظلم نہ کر یا تو اپنے ہونہاری لیتی ہیں یا گلے میں پھندہ ڈال کر اپنے آپ کو ختم کر لیتی ہیں۔ میں بہت مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔ میرے بارے میں کوئی غلط فیصلہ کرنے سے پہلے ابھی طرح سوچ لیتا۔“

چودھری سعادت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھا۔ اس نے کسی لڑکی سے آج تک ایسی باتیں کہاں سنی تھیں۔ لڑکیاں تو اس کے سامنے آتے ہوئے کھڑی تھیں۔ اسے دیکھ کر دودھ سے راستہ بدل لیتی تھیں اور اگر کبھی سامہ ہو بھی جاتا تو خوف سے کھٹی رہتی تھیں اور ان کے منہ سے آواز تک نہیں نکلتی تھی لیکر یہ نایاب بڑی بے خوفی سے اس کے سامنے کھڑی ایسی کھڑی کھڑی تھی جنہیں وہ بڑی مشکل سے برداشت کر رہا تھا۔

”تمہارے لیے اچھی بات یہ ہوگی کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے، یہاں سے واپس چل جاؤ۔“ سعادت نے گھوڑے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے گھوڑے کی نگاہ پکڑی اور مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آج کے بعد میں تمہیں ایسے لباس میں نہ دیکھوں۔ یہ گاؤں ہے شہر نہیں۔ یہاں لوگ بے حیالی کو برداشت نہیں کرتے۔“

”میں جو بھی لباس پہنوں، تمہیں کیا اعتراض ہے۔“ نایاب نے کہا۔

”پھر بتاؤں گا۔“ سعادت کہتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس نے گھوڑے کا رخ ایک کھیت کی گڈبڑی کی طرف موڑ دیا۔

چودھری سعادت کے جانے کے بعد بھی نایاب دس پندرہ منٹ تک درخت کے نیچے کھڑی رہی۔ پھر گاؤں کی طرف چلنے لگی۔ واپسی کے لیے اس نے دوسرا راستہ اپنایا تھا۔ وہ کچھتوں میں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں سے ملتی ہوئی چلتی رہی اور اس طرح دوسرے کے قریب وہ گاؤں واپس پہنچ گئی۔

اس رات بھی نایاب کو دیر تک نیند نہیں آئی تھی۔ وہ سعادت کے بارے میں سوچتی رہی۔ بات کرتے ہوئے اس کے لیے میں اگرچہ سردھری تھی لیکن خلاف معمول باتوں کا انداز جارحانہ نہیں تھا۔ حالانکہ جب بھی ملاقات ہوتی تھی اس کا انداز جارحانہ اور دھمکی آہیز ہوا کرتا تھا لیکن آج اس نے اپنے آپ پر بڑا کنٹرول رکھا ہوا تھا اور اس کی وجہ بھی نایاب سمجھتی تھی۔

دونوں نے بیک وقت اس طرف دیکھا تھا۔

سنہری سانپ گھنڈی پر پھن پھیلائے بیٹھا تھا اور اس کے منہ سے پھنکاریں نکل رہی تھیں۔ وہ سانپ ٹایاب کے پیر سے تقریباً دو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ ٹایاب کا چہرہ زرد ہو گیا۔
 ”اب مجھے اپنے ہاتھ تمہارے خون سے رنگنے کی ضرورت نہیں۔“ اس آدمی نے ہلکا سا تشدد لگایا۔ ”یہ سانپ تمہاری زندگی کا خاتمہ کر دے گا اور چودھریوں کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔“

سانپ ریٹکنا ہوا ٹایاب کی پنڈلی سے لپٹ گیا۔ ٹایاب کو پہننے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ سانپ کے ڈسنے کی شہر قحی لکین وہ سنہری سانپ اس کے پیر سے اتر کر پھنکارا ہوا اس شخص کی طرف ریٹکنا لگا۔

اس شخص کی آنکھیں دھشت سے پھیل گئیں۔ وہ اگلے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ پھر اس نے دوڑ لگا دی مگر اس سانپ نے اسے زیادہ دور جانے کا موقع نہیں دیا۔ وہ شخص ٹھوکر کھا کر گرا اور اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سانپ نے اس کی پنڈلی پر ڈس لیا۔

اس شخص کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وہ نیچے گر کر تر پنے لگا۔

سانپ گھنڈی پر ریٹکنا ہوا واپس آ رہا تھا۔ ٹایاب بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ اس کی نظریں ریٹکنا ہونے اس سنہری سانپ پر جمی ہوئی تھیں جو اس کے پیر پر چڑھ کر پنڈلی سے لپٹ گیا اور پھر نیچے اتر کر ریٹکنا ہوا کھیت میں چلا گیا۔ ایک سرگوشی سی ٹایاب کی سماعت سے کھراکی۔

”میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ تم نے میری زندگی بچائی تھی۔ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔“

ٹایاب پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی پلک جھپکے بغیر ان پودوں کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں وہ سنہری سانپ غائب ہو گیا تھا۔ پھر جب اس نے گردن کھما کر گھنڈی پر پڑے ہوئے اس شخص کی طرف دیکھا تو اس کے منہ سے بے اختیار ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔

جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ کتنی بھیاںک موت ہوگی۔ ٹایاب یہ سوچ کر ہی کانپ اٹھی تھی۔
 ٹایاب ناشتہ چھوڑ کر اٹھ گئی اور کمرے میں جا کر لباس تبدیل کرنے لگی۔ اس کے دماغ میں آنکھیاں سی چل رہی تھیں۔ گزشتہ روز جب اس نے سعادت کو بتایا تھا کہ اس رات نرین لیٹ ہونے کی وجہ سے وہ رات اس نے اسٹیشن ماسٹر کے گھر پر گزار دی تھی تو سعادت کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

سعادت نے اس رات دو آدمی ٹایاب کی تلاش میں ریلوے اسٹیشن بھیجے تھے۔ انہوں نے اسٹیشن ماسٹر سے بھی ٹایاب کے بارے میں پوچھا تھا اور اسٹیشن ماسٹر نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کے اس جھوٹ سے چودھری سعادت کو یہ نقصان ہوا تھا کہ ٹایاب زندہ سلامت گاؤں پہنچ گئی تھی اور اسٹیشن ماسٹر کو جھوٹ کی سزا دینے کے لیے سعادت نے اس کے گھر کو لگا لوگ ادی تھی اور وہ دونوں میاں بیوی جل کر راکھ ہو گئے تھے۔

”کہاں جا رہی ہو ٹایاب؟ تم نے ناشتہ بھی دھنک سے نہیں کیا۔“ سیکنہ نے اسے کمرے سے نکلنے کو کہہ کر پوچھا۔ ٹایاب نے جینز اور نی شرٹ پہن لی تھی۔

”میں تھوڑی دیر میں واپس آتی ہوں۔“ ٹایاب کہتے ہوئے چھانک کی طرف بڑھ گئی۔
 گاؤں سے نکل کر کھیتوں میں پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ سامنے سے آنے والے ایک آدمی نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ لمبا بڑنگا آدمی سعادت کے ڈیرے کی طرف سے آ رہا تھا۔

”اے لڑکی۔“ وہ آدمی غراتے ہوئے بولا۔ ”کہاں منہ اٹھائے چلی جا رہی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں یہ زمینیں چودھری سعادت کی ملکیت ہیں۔“

”ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔“ ٹایاب کے لیے میں غراہٹ تھی۔ ”تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے۔ جانتے نہیں میں کون ہوں؟“

”ابھی طرح جانتا ہوں۔“ اس شخص نے ایک ہاتھ قبض کی سائیڈ والی جیب میں ڈالے ہوئے کہا۔ ”چودھری سعادت کا حکم ہے کہ تمہیں ان زمینوں پر آنے سے روکا جائے اور اگر تم باز نہ آؤ تو.....“

اس نے جیب سے چاقو نکال لیا اور ٹایاب کی طرف بڑھنے لگا۔ ٹایاب کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔ وہ اگلے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ آدمی بھی چاقو کو مخصوص انداز میں حرکت دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور پھر اسی وقت ایک پھنکار سی سائیڈ والی۔ ان

تھی۔

نایاب نے گردن ہٹا کر اس کی طرف دیکھا مگر وہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔ وہ ہنص کھیت سے نکل کر چنڈی پر آگیا اور پھر عبدالرحمن کی لاش دیکھنے ہی ٹھک کر رک گیا۔

”اوہ۔۔۔ اسے کیا ہوا؟“ اس کے لمبے میں شدید حیرت تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ ہنص مجھ پر چاقو سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر اچانک ہی اس طرف سے ایک سانپ نکل آیا۔ سانپ اس کی طرف پکا اور یہ سانپ کو دیکھ کر بھاگا تھا لیکن ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ سانپ نے اس کی پنڈلی پر ڈس لیا اور اس طرف چلا گیا۔“ نایاب نے ایک کھیت کی طرف اشارہ کیا۔ پھر بولی۔ ”یہ ہنص مگر کر ایک لمحہ کو تڑا اور پھر سناٹ ہو گیا۔ شاید سانپ کے زہر سے اس کے جسم کی رگت پیلے نیلی ہوئی تھی اور اب یہ سیاہ پڑ رہا ہے۔“

دراستی والے اس مزار سے کا نام رمضان تھا۔ وہ آگے بڑھ کر عبدالرحمن کی لاش کو دیکھنے لگا جو سیاہ ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں اب بھی لمبے پھل والا چاقو دبا ہوا تھا۔

”یہ لوگوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔“ رمضان نے زمین پر تھوک کر نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”نبائے کتے گھروں کو برباد کر چکا ہے اور بالاخر اپنے اس بھیاںک انجام کو پہنچ گیا۔“

اس دوران تین چار آدمی اور بھی وہاں پہنچ گئے۔ عبدالرحمن کی لاش کو دیکھ کر ایک لمحہ کو بدحواس ہوئے، پھر ان سب کے چہروں پر طمانیت سی آگئی۔ برے آدمی کی موت پر ہر شریف آدمی اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

نایاب اس وقت تک اگرچہ اپنے آپ کو پوری طرح شہنشاہ جی تھی مگر بیاس کی شدت سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔

”پانی مل جائے گا۔ مجھے بہت پیاس لگ رہی ہے۔“ اس نے رمضان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پانی۔“ رمضان نے ادھر ادھر دیکھا، پھر ایک آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے

بولاً۔

دوسری قسم

نایاب چند لمبے بے حس و حرکت کھڑی چنڈی پر پڑے ہوئے اس ہنص کو دیکھتی رہی، پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی قریب آگئی اور جبکرا سے دیکھنے لگی۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ پہلے اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔

سانپ کا زہر بہت ہی سریع الاثر تھا۔ اس نے نہ صرف فوری طور پر اس ہنص کی موت واقع ہو گئی تھی بلکہ زہر پورے جسم میں پھیل گیا تھا اور اس ہنص کے جسم کی رگت تبدیل ہونے لگی تھی۔ پہلے اس کے جسم میں نیلاٹھ پھیلی اور پھر اس کی رگت سیاہ پڑنے لگی۔

دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کچھ مزارعوں نے عبدالرحمن کی ہنص کو کچھ دیر پہلے نایاب کا راستہ روکے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ لوگ عبدالرحمن کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ چودھری سعادت کا خاص گرگ تھا۔ گاؤں کے کسی شریف آدمی کی پگڑی اچھالنا ہوتی یا کسی لڑکی کو انھوانا ہوتا، چودھری سعادت ایسے کام اسی سے لیا کرتا تھا۔ گاؤں اور آس پاس کی بستیوں کے لوگ اس کے سامنے سے بھی ڈرتے تھے۔

عبدالرحمن نے جب نایاب کا راستہ روکا تو کھیتوں میں کام کرنے والے مزارعے سمجھ گئے تھے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ انہوں نے عبدالرحمن کو نایاب سے باتیں کرتے اور پھر اچانک ہی مڑ کر ایک طرف بھاگتے اور پھر گرتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر انہوں نے نایاب کی چیخ بھی سنی تھی۔

نایاب کی چیخ سن کر دو تین آدمی اپنا کام چھوڑ کر اس طرف دوڑ پڑے۔ کسی کے ہاتھ میں دراستی تھی، کسی کے ہاتھ میں کھربازہ ایک آدمی نے تو پھانڈ اٹھا رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر دوسرے بھیتوں سے کچھ اور آدمی بھی اس طرف دوڑے تھے۔

”چھوٹی نیلی۔ کیا ہوا؟“ ایک آدمی نے دور ہی سے پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں دراستی

یہ میاں کیوں آئی تھی۔“

”میں تجھیں پہلے بھی جانتا تھی ہوں کہ ان زمینوں پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا ہے۔ مجھے میاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“ ثایاب نے بے خوفی سے کہا۔ ”تم یہ جانتا چاہتے ہو کہ میں میاں کیوں آئی تھی۔ ان سب لوگوں کے سامنے تم میں جواب دینے کا حوصلہ ہو تو بتاؤ رات کو اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی کے گھر کو آگ کس نے لگائی تھی؟ کس نے ان دونوں کو جلا کر راکھ کیا تھا۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی، پھر زمین پر پڑی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے جن لوگوں نے عبدالغنی اور راشدہ کو جلا کر راکھ کیا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھا۔ اس کا انجام تم نے دیکھ لیا۔ یہ بھی کوئلے کی طرح سیاہ ہو چکا ہے۔“

چودھری سعادت کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ ثایاب کو کوئی جواب نہ دے سکا۔ اپنے مزارعین پر برس پڑا۔

”تم جاؤ اپنا کام کرو۔ میاں کھڑے کیا کر رہے ہو اور شوکے۔ تم جا کر ڈیرے سے ایک چارپائی اٹھا لاؤ اور یہ لاش اٹھا کر گاؤں لے چلو۔“

شوکانے ڈیرے کی طرف دوڑ گیا۔ سعادت نے تین اور آدمیوں کو وہاں روک لیا اور باقی کتھوں میں چلے گئے۔ ثایاب ایک طرف خاموش کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ چند منٹ بعد ہی شوکانے کی ایک چارپائی اٹھا لایا۔ وہ ایک سیلا سا کتھیں بھی لے آیا تھا۔

”لاش کو اٹھا کر چارپائی پر ڈالو اور اسے گاؤں میں لے چلو۔“ چودھری سعادت علی نے کہا۔

شوکانے چارپائی ایک طرف بچھا دی اور وہ آدمی جھک کر عبدالرحمن کی لاش اٹھانے لگے لیکن وہ لاش چلے ہوئے بھرے کوئلے کی طرح ان کے ہاتھوں میں لوٹ گئی۔ وہ سب چونک گئے۔ انہوں نے خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چودھری سعادت کے چہرے پر بھی ہوائیاں سی اڑنے لگیں لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ ثایاب بھی ایک لمحہ کو خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔

اور پھر عبدالرحمن کی لاش کو جس جگہ سے بھی اٹھانے کی کوشش کی گئی، وہ راکھ کی طرح بکھر گئی۔

”اوئے شوکے..... اس غالی کے نیچے گھڑا رکھا ہوا ہے۔ جلدی سے پانی لے کر آ۔“ چھوٹی بی بی کو پیاس لگ رہی ہے۔“

شوکانے نام کا وہ شخص ایک طرف دوڑتا چلا گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ایک مٹکی اور پلاسٹک کا ایک سیلا سا گلاس اٹھا لایا۔ ثایاب نے دو گلاس پانی پی لیا مگر اس کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ اب وہ تیسرا گلاس پی رہی تھی۔

اس دوران کتھوں میں کام کرنے والے دس بارہ مزارے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب دور کھڑے عبدالرحمن کی لاش کو دیکھ رہے تھے جواب بالکل کوئلے کی طرح سیاہ پڑ چکی تھی مگر ان میں سے کسی نے بھی لاش کو چھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا چہرہ بہت ہیسا تک ہو گیا تھا۔

کسی نے چودھری سعادت کو بھی اطلاع دیدی۔ ڈیرا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ چند منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ وہ بہت پھرا ہوا تھا۔ اطلاع دینے والے نے اسے بتایا تھا کہ کتھوں میں عبدالرحمن کی لاش پڑی ہے اور ثایاب بھی وہاں موجود ہے۔ دراصل اس نے بہت پہلے ثایاب کو کتھوں کی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اس نے عبدالرحمن کو بھیج دیا تھا کہ اسے ڈرا دھکا کر اپنی زمینوں سے نکال دے۔ لاش کی اطلاع ملنے پر وہ سمجھا تھا کہ شاید ناراضگی میں عبدالرحمن ہی ثایاب کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس لیے اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے عبدالرحمن کی لاش دیکھ کر وہ ثایاب کو قتل کر دے گا۔

لیکن عبدالرحمن کی لاش دیکھ کر تو ایک لمحہ کو وہ بھی سناٹے میں آ گیا تھا۔ وہ چند منٹ لاش کو دیکھتا رہا، پھر سیدھا ہو کر خونخوار نظروں سے ثایاب کی طرف دیکھنے لگا۔

”ست..... تم میاں کیوں آئی تھیں؟“ اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”کیا تم نے اسے.....؟“

”چھوٹی بی بی نے کچھ نہیں کیا چودھری جی۔“ قریب کھڑے ہوئے رمضان نے اس کی بات نہت دی۔ ”اس کو تو سوپ لڑا ہے۔ دیکھتے نہیں اس کی لاش زہر کے اثر سے کوئلے کی طرح کالی ہو رہی ہے۔“

”تم چپ رہو۔“ چودھری سعادت نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”میں اس سے پوچھ رہا ہوں“

”اور تم اسے پکڑنے جا رہی تھیں؟“ زمس مسکرائی۔

”اس وقت مجھے اس پر مت زس آیا تھا۔ اگر میں نولے کو چتر مار کر نہ بھاگ دیتی تو وہ شاید اس کی گردن ہی چا جاتا۔“ ٹایاب چند لمبے کو خاموش ہوئی، بھربات جاری رکھے ہوئے بولی۔ ”یہ تو مجھے آج پتا چلا کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔“

”کیا مطلب؟“ زمس نے اسے پھر گھورا۔ ”کیا آج وہ پھر کسی نولے سے لڑ رہا تھا اور اس نے نولے کو مار ڈالا؟“

”نولے کو نہیں، ایک انسان کو۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔

”اوہ۔ کون تھا وہ؟“ زمس اچھل پڑی۔

”چودھری سعاد کا ایک دوست عبدالرحمن۔“ ٹایاب نے کہا۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ زمس بولی۔ ”وہ تو بہت غیبت آوی تھا۔ ایسے لوگوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے لیکن یہ کب کی بات ہے۔ کیا تمہارے سامنے۔۔۔۔۔“

”ہاں۔“ ٹایاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں سعاد سے ملنے کھیتوں کی طرف گئی تھی۔ ابھی اس کے ڈیرے سے دور ہی تھی کہ کھیتوں میں عبدالرحمن نے میرا راستہ روک لیا۔“

”تمہیں لانا منع بھی کیا تھا کہ اکیلی سعاد کے سامنے مت جانا۔ کیوں گئی تھیں تم؟“ زمس نے اسے گھورا۔

”صبح تم نے سنا تھا کہ کل رات کسی نے انیشین ماسٹر عبدالغنی کے کوارٹر کو آگ لگا دی تھی اور دونوں میاں بیوی کو زندہ جلا دیا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ کل دن میں بھی میری چودھری سعاد سے ملاقات ہوئی تھی اور میرے منہ سے یہ ج لگا لگا تھا کہ زمین سے اترنے کے بعد وہ رات میں نے انیشین ماسٹر کے کوارٹر میں گزاری تھی اور اس کی بڑی راشدہ نے مجھے اس کے بارے میں بت کچھ بتا دیا تھا اور آج صبح یہ خبر سننے کو ملی کہ گزشتہ رات کسی نے کوارٹر کو آگ لگا کر دونوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ مجھے شبہ ہی نہیں یقین تھا کہ یہ آگ چودھری سعاد نے ہی لگوائی تھی۔ میں اس سے اس سلسلے میں بات کرنے جا رہی تھی کہ ان معصوم اور بے گناہوں نے اس کا کیا بکا ڈا تھا۔ میں ابھی ڈیرے سے دور ہی تھی کہ عبدالرحمن نے میرا راستہ روک لیا اور دھمکی دی کہ میں چودھری کی ذمہ داریوں سے

ٹایاب چند لمبے اور وہاں رکی۔ اس نے چودھری سعاد کے بدحواس چہرے کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کے بغیر مڑ کر گاؤں کی طرف چل پڑی۔

آج کے اس واقعہ نے ٹایاب کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ جب وہ حویلی میں داخل ہوئی تو بے پناہ محسن محسوس کر رہی تھی۔ زمس صحن میں پنڈ پپ سے بائیں میں پانی بھر رہی تھی۔ وہ ٹایاب کے چہرے کو دیکھ کر کچھ مٹی کی کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔ ٹایاب کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

”کیا ہوا ٹایاب؟“ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بیج رہے ہیں؟“ زمس نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ٹایاب کی ہم عمر ہونے کی وجہ سے وہ اسے تم کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی۔

”کچھ نہیں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ ٹایاب پکھا کھول کر پٹنگ پر گر سی گئی۔

”کوئی بات تو ہے۔“ زمس اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”چودھری سعاد سے آتنا سامنا تو نہیں ہو گیا؟ پریشان لگ رہی ہو۔“

”ہاں اس سے آتنا سامنا ہوا تو تھا لیکن میں اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔

”تو پھر پریشانی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گی؟“ زمس نے کہا۔

”دو تین دن پہلے عذرہ نے تمہیں بتایا تھا کہ اس روز جب میں اس کے ساتھ کھیتوں کی طرف گئی تھی تو ہم نے ایک سانپ اور نولے کو لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔“ ٹایاب بولی۔

”ہاں اور زمس نے یہ بھی بتایا تھا کہ تم نے نولے کو چتر مار کر بھاگ دیا تھا اور زخمی سانپ کی دبوکی کرنے کے لیے اسے پکڑنے چلی تھیں۔“ زمس نے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ عذرہ کی جگہ اگر میں تمہارے ساتھ ہوتی تو جس خوب ڈانٹنی۔ یہ رہمائی علاقہ ہے۔ کھیتوں، بھاریوں میں سانپ بچھو وغیرہ ہوتے ہیں۔ آئندہ ذرا ایسی چیزوں سے محتاط رہنا اور ہاں عذرہ نے بتایا تھا کہ وہ سانپ بہت خوبصورت تھا۔ اس قسم کے سانپ تو اور بھی خطرناک ہوتے ہیں۔“

”وہ سانپ واقعی بہت خوبصورت تھا۔“ ٹایاب نے کمراسٹیں لیٹے ہوئے جواب دیا۔

”اس کی رنگت سنہری تھی۔ بالکل سونے جیسی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے سونے کی موٹی سی زنجیر زمین پر دیکھ رہی ہو۔ وہ واقعی بہت خطرناک سانپ تھا۔“

سانپ اس قدر زہریلے ہوتے ہیں کہ ان کا ڈسپانی بھی نہیں مانگتا۔ زہر خون میں پھیل جاتے سے ہنم نیلا سیاہ پڑ جاتا ہے لیکن یہ تو آج تک نہیں شاکر کسی سانپ کے کانٹے سے انسان راگھ کا ڈبیر بن جائے۔“

”ایک چیز ہوتی ہے مکافات عمل مائی ڈیئر زمر!“ ثایاب نے کہا۔ ”اب یہ بات میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اسٹیشن ماسٹر کے گھر کو آگ لگا کر راشدہ اور عبدالحی کو زندہ جلائے والوں میں عبدالحی بھی شامل تھا۔ وہ آگ میں جل کر تو ضعیف مرا لیکن اس کی موت آگ میں جلنے والوں سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوئی ہوگی۔“

”تو کیا واقعی اسٹیشن ماسٹر کے گھر کو آگ سعادت نے لگوائی تھی؟“ زمر نے پوچھا۔ ”میرے پاس فی الحال اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ ”لیکن میں ثابت کر کے رہوں گی اور اس ظالم کو ان مظلوم میاں بیوی کے اگے پچھلے حساب پکانے ہوں گے۔“

”گویا تم نے باقاعدہ حاذ آرٹائی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ زمر بولی۔

”ہاں..... حاذ آرٹائی کے بغیر کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ ”میں نہ کسی کو تو آگے آتا ہی ہے۔ اگر خاموش رہے تو ظلم ہوتا جائے گا۔ معصوم لڑکیوں کی عزتیں لٹی رہیں گی اور گھر برباد ہوتے رہیں گے۔ میں نے وہ رات راشدہ کے پاس کزادی تھی۔ میں اس کی باتیں کبھی نہیں بھول سکتی۔“

”میرا خیال ہے گاؤں کے لوگ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔“ زمر نے کہا۔ ”میں تو ہر شخص بھردری جتانے کے لیے تمہارے پاس آ رہا ہے اور تمہارا ساتھ دینے کی یقین دہانی کرا رہا ہے لیکن چودھریوں کے سامنے کسی کی زبان نہیں کھلے گی۔ سب لوگ ان باپ بیٹوں سے ڈرتے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کے خلاف آواز اٹھائی تھی، بعد میں ان کا شر بھی گاؤں والے دیکھ چکے ہیں۔ سعادت اور اس کے آدمیوں نے حاکم علی کی بیٹی کو اغوا کیا۔ ڈیرے پر لے جا کر رات بھر اس کے ساتھ زیادتی کرتے رہے۔ صبح اس کی لاش کیتھن میں پڑی ہوئی لی تھی اور یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ سوروں اور جھیزوں نے اسے مار ڈالا۔ حاکم علی کیا گاؤں کے سب لوگ جانتے تھے کہ نادرہ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ حاکم علی نے نورپور قلعے میں رپورٹ درج کر دی۔ اس وقت بھی پولیس گاؤں میں آئی تھی۔ انہوں نے

واپس چلی جاؤں ورنہ مجھے عین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے انکار پر اس نے جیبر سے چاقو نکال لیا اور مجھ پر حملہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ وہ سنرا سانپ کیتھن سے نکل کر آگیا۔ کچھ دیر وہ میرے پیر کے قریب کٹھنی مارے بیٹھا رہا، پھر رینگتا ہوا عبدالرحمن کی طرف لپکا۔ عبدالرحمن ڈر کر بھاگا لیکن ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس سنرے سانپ نے اس کی پٹلی پر ڈر لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی اندر عبدالرحمن ختم ہو گیا۔“

”شکر کہ تم قریب کیتھن میں وہ سانپ تھیں بھی ڈس سکتا تھا۔“ زمر نے کہا۔ ”اچھا جان کا صدمہ دے رہا۔“

”بات بیس پر ختم نہیں ہو جاتی زمر۔“ ثایاب نے کہا۔ ”میں اپنی جگہ پر گم کھڑی تھی اور مزید حیرت کی بات یہ ہوئی کہ وہ سانپ رینگتا ہوا میری طرف آیا۔ میرا پٹلی سے پلٹ گیا اور مل کھانا ہوا پیچھے اتر کر کیتھن میں غائب ہو گیا۔“

”ہائے اللہ۔“ زمر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اس نے جنہیں ڈسا تو نہیں؟“

”اگر ڈس لیتا تو میں بھی عبدالرحمن کی طرح جلی ہوئی راگھ کا ڈبیر بن چکی ہوتی۔“

ثایاب نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ زمر نے اسے گھورا۔

”سانپ کے ڈسنے کے بعد عبدالرحمن کی لاش وہ منٹ کے اندر اندر جلی ہوئی راگھ ڈبیر بن گئی تھی۔“ ثایاب نے کہا۔ ”میں مہوت سی کھڑی دیکھ رہی تھی۔ پہلے اس کا ج نپلا ہوا اور پھر یہ تلاطم سیاہی میں بدلتی چلی گی۔ کچھ دیر بعد آس پاس کے کیتھن میں کا کرنے والے مزارے بھی وہاں پہنچ گئے۔ ڈیرے پر چودھری سعادت کو بھی اطلاع ہو گئی وہ بھی آگیا۔ وہ سمجھا تھا کہ شاید میں نے عبدالرحمن کو قتل کر دیا ہے۔ وہ لاش دیکھے بغیر مجھ سے الگ پڑا لیکن جب اس نے لاش دیکھی تو ایک لمحہ تو وہ بھی سامنے میں آگیا اور جب اس نے اپنے آدمیوں سے لاش اٹھانے کے لیے کہا تو ہاتھ لگاتے ہی وہ لاش اس طر کھنچ کر پیچھے بھر پڑی راگھ ہو۔ صرف اس کی کھوپڑی ایسی تھی جو نہیں بکھری تھی۔ اس چہرہ سیاہ ہو کر بت بھیانک ہو گیا تھا۔ مزار میں بھی عبدالرحمن کا یہ مشر دیکھ کر کانپ اٹتے تھے۔ میں وہاں سے چلی آئی۔ چند منٹ وہ لاش انہوں نے کیسے اٹھائی ہوگی۔“

”کیسا سانپ تھا وہ؟“ زمر نے قصہ سن کر ہی کانپ اٹھی تھی۔ ”یہ تو سنا ہے کہ بعد

بات ہوئی۔ عبدالرحمن کو ڈسنے کے بعد وہ سانپ میری ٹانگ سے لپٹ گیا اور بھر جب وہ رینگتا ہوا کھیت کی طرف جا رہا تھا تو میرے کان کے قریب کسی نے سرگوشی کی تھی۔ ”میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔“ اس وقت سے میرا ذہن بہت بری طرح الجھا ہوا ہے۔ کیا وہ سرگوشی اس سانپ نے کی تھی؟

”سانپ سرگوشیاں نہیں کرتے، پھنکارتے ہیں۔“ زکس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دیئے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ سنرا سانپ کوہ قاف کا کوئی شہزادہ ہے جسے کسی جادوگر نے جادو کے زور سے سانپ بنا دیا ہے۔“

”مجھے معلوم تھا کہ تم میرا مذاق اڑاؤ گی۔“ ثایاب نے اسے گھورا۔

”نہیں مائی ڈیڑھا میں قاف نہیں اڑا رہی۔“ زکس نے کہا۔ ”ہات دراصل یہ ہے کہ احسان فراموش تو انسان ہی ہے جسے خدا نے اشرف المخلوقات کا درجہ بھی دیا ہے اور ضروری نہیں کہ اس زہن پر بسنے والی دوسری مخلوقات بھی انسان کی طرح احسان فراموش ہوں۔ اگر تم نے ایک انسان کی جان بچائی ہوئی، جب عبدالرحمن تم پر چاقو سے حملہ کرنے والا تھا، اس وقت اگر وہ شخص جس کی تم نے جان بچائی تھی، شاید تجھیں بچانے کے لیے آگے نہ بڑھتا اور خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتا لیکن جس کی تم نے جان بچائی تھی، وہ ایک غیر انسانی مخلوق تھی اور ایسی خطرناک مخلوق سے خبر کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن وہ سانپ تمہارا احسان مند تھا۔ تم نے اس کی زندگی بچائی تھی۔ اسی احسان کا بدلہ چکانے کے لیے اس نے تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیا۔ حساب برابر ہو گیا۔“

”لیکن وہ سرگوشیاں؟“ ثایاب نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”خدا نے ہر جاندار کی کھوپڑی میں ایک چیز رکھی ہے جسے داغ کہتے ہیں۔“ زکس نے جواب دیا۔ ”داغ سے کام لینے اور سوچنے کی صلاحیت ہر جاندار میں ہے۔ سوچنے کا انداز مختلف ہو سکتا ہے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے اللہ نے بولنے کی قوت دی ہے جس سے وہ اپنی سوچوں اور اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ تم نے پالتو جانوروں کو مختلف انداز میں اپنے جذبات و احساس کا اظہار کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ مثلاً کتے یا بلی کو پیار کیا جائے تو وہ پیروں میں لوٹنے لگتے ہیں۔ اس وقت ان کے منہ سے کچھ ایسی آوازیں بھی نکلتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ جو جاندار منہ سے آواز

چودھری سعادت اور اس کے بندوں سے پوچھ کچھ کی اور گاؤں کے کچھ اور لوگوں بیانات بھی لیے اور جانچ ہو گاؤں والوں نے کیا کہا تھا۔ ہر شخص نے یہ کہا تھا کہ اچودھری سعادت یا اس کے بندوں پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ تاہم کو واقعی سوچوں نے ماہوگا اور پھر اس کے چند روز بعد حاکم علی اور اس کی بیوی ایسے غائب ہوئے کہ آج ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں جیسا کہ بات سمجھا رہی ہوں کہ گاؤں والوں پر بھروسہ کرنا۔ وہ کھل کر چودھری کے خلاف کوئی بات نہیں کریں گے۔“

”بھروسہ تو مجھے صرف اللہ پر ہے۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ ”میں گاؤں والوں پر نہیں کروں گی لیکن یہ بات بھی دعوے سے کہوں گی کہ بہت جلد یہ گاؤں والے اور پاس کی بستیوں کا ہر شخص کھل کر ان چودھریوں سے نفرت کا اظہار کرنے لگے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ زکس نے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔

سانپ والی بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔ کیا واقعی جو کچھ تم نے بتایا ہے، وہ سچ ہے۔ مطلب ہے عبدالرحمن کی لاش رکھ بن گئی تھی۔“

”مجھے سمجھوتہ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی کچھ دیر میں تمہیں کسی نہ کسی سے چل جائے گا لیکن ایک بات نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا رکھا ہے۔“ ثایاب نے کہا

”وہ کیا؟“ زکس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جس روز میں نے سانپ اور نیوے کی لڑائی میں سانپ کو بچایا تھا، اس وقت عجیب بات ہوئی تھی۔“ ثایاب نے کہا۔ ”نیوے کے بھاگ جانے کے بعد میں نے سنرے سانپ کو ڈنکی دیکھ کر اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تھا اور اس نے پھنکارتے ہوئے طرح بچن پھیلا لیا تھا جیسے مجھے ڈنسا چاہتا ہو لیکن پھر یکدم وہ ڈھسلا پڑ گیا اور پھر رینگتا کھیت میں گھس گیا۔ اس وقت میں نے اپنے کان میں ایک سرگوشی سنی تھی جیسے کسی کہا ہو۔ ”تم نے میری زندگی بچائی ہے، میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”تم نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، دہاں عذرہ کے سوا کوئی نہیں تھا اور وہ بھی مجھ سے کئی گز کدھی تھی۔ میں نے اس سرگوشی کو اپنا وابہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور عذرہ کو بھی نہیں بتایا کہ وہ میرا مذاق اڑائے گی۔ تم سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن آج، وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی، پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔“ آج پھر ایک

عمرے اور کرے لیکن وہ چونکہ قوت گویائی سے محروم ہے، اس لیے زبان سے کچھ نہیں کہہ سکا۔ البتہ اس کے دماغ کی فوہکونسی تمہارے دماغ سے کراگئی اور تم نے اسے سرگوشی کی طرح محسوس کیا۔“

”لیکن انسان اور جانور کے دماغوں کی فوہکونسی تو مختلف ہوگی۔“ ثایاب نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”یقیناً ایسا ہوگا۔“ زمرس نے جواب دیا۔ ”لیکن ہو سکتا ہے بعض جانداروں کے دماغ کی فوہکونسی انسانی دماغ کی فوہکونسی سے ملتی جلتی ہو اور یہ سانپ بھی ان میں سے ایک ہو سکتا ہے۔“

”لیکن دوسری مرتبہ وہ سرگوشی؟“ ثایاب پوئی۔

”یہ محض اتفاق ہوگا کہ جب کبھیوں میں عبدالرحمن تم پر حملہ کرنے والا تھا تو وہ سانپ بھی آس پاس ہی کہیں موجود تھا اور اس نے حمیس پچانے کے لیے تمہارے دشمن کو ڈس کر ہلاک کر دیا۔ پھر اپنائیت کے اظہار کے لیے وہ تمہاری ٹانگ سے لپٹا تھا اور جاتے ہوئے اس کے دماغ نے وہی کچھ سوچا تھا جو تم نے سرگوشی کی صورت میں محسوس کیا۔ اسے نیلی بیٹی کا کمال سمجھو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“

ثایاب کا ذہن الجھ گیا۔ عجیب منطقی تھی زمرس کی۔ نیلی بیٹی کے بارے میں اس نے بھی تھوڑا بہت پڑھا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس پر اسرارِ علم پر باقاعدہ تدریج ہو رہی ہے اور اس علم نے بہت ترقی بھی کی ہے۔ بہت سے ایسے ماہرین موجود ہیں جو نیلی بیٹی کے ذریعے اپنا پیغام ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں لیکن انسان اور کسی اور مخلوق کے مابین نیلی بیٹیک رابطہ، یہ بات ثایاب کے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ یقیناً معاملہ کچھ اور تھا جو اپنے اندر پر اسراریت لیے ہوئے تھا۔

ثایاب ابھی زمرس کی باتوں کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ وہ دو عورتیں تھیں جن میں سے ایک حویلی کے چھانک میں داخل ہوتے ہی چچ چپ کر کچھ کہہ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے گاؤں میں عبدالرحمن کی موت کی اطلاع پہنچ گئی ہے۔“ زمرس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

نہیں نکال سکتے، وہ کسی اور طریقے سے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے موقعوں پر ان کے دماغ میں یہ سوچ ضرور ہوتی ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

اب ایک اور چیز ہوتی ہے نیلی بیٹی۔“ زمرس بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”یہ ایک پراسرار علم ہے جو آج کے دور میں خاصی ترقی کر چکا ہے اور اس پر باقاعدہ مائنٹنگ انداز میں تدریج ہو رہی ہے۔ میں نے بھی اس موضوع پر چند کتابیں پڑھی ہیں۔ تم مجھے جابل، گنوار اور دیمائی عورت مت سمجھنا۔ میں نے بھی گریجوایشن کر رکھا ہے۔ ہر سال، نیلی بیٹی ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے زبان کو حرکت دینے بغیر ایک انصار دوسرے انسان کو پیغام دے سکتا ہے۔ اس میں فاصلے کی کوئی قید نہیں۔ دو گز سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو بھی زبان بلائے بغیر پیغام دیا جا سکتا ہے اور ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے کسی شخص کے دماغ کی لہروں میں بھی پہل پہل کی جا سکتی ہے۔

ہر دماغ کی ایک فوہکونسی ہوتی ہے۔ تم جانتی ہو ہمارے جسم میں دماغ ہی ایک ایسی چیز ہے جو پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ دماغی فوہکونسی ہوتی ہے جس سے ہمارے جسم کے مختلف اعضاء اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ دماغ کی فوہکونسی سے ہی ہم اپنا زبان کو حرکت دیتے ہیں اور اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہو ہے کہ زبان کو حرکت دینے بغیر ہمارا پیغام کسی دوسرے تک پہنچ جاتا ہے۔ تم نے اکثر نوٹ کیا ہوگا کہ جب تم نے کسی سے کوئی بات کہی تو اس نے جواب دیا میں بھی یہی سو رہا تھا، گویا زبان کو حرکت دینے سے پہلے ہی دماغی لہروں کے ذریعے وہ بات اس تک پہنچ گئی تھی۔“

جب یہ افشاء ہوا کہ زبان کو حرکت دینے بغیر دماغی لہروں کے ذریعے پیغام ایک سے دوسرے شخص تک پہنچ سکتا ہے تو اس پر تحقیقات شروع ہو گئیں اور اسے نیلی بیٹی کا نام دے کر باقاعدہ ایک علم کا درجہ دیا گیا اور اب یہ علم بہت ترقی کر چکا ہے اور اس مائنٹنگ انداز میں تدریج ہو رہی ہے۔

اب میں آتی ہوں تجھ پر۔ سنائی دینے والی ان سرگوشیوں کی طرف۔“ زمرس مسکراتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”تم نے جب اس سترے سانپ کو نیو لے سے پچایا تھا وہ یقیناً تمہارا احسان مند اور شکور ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات آئی ہوگی کہ وہ تمہا

”چودھری نے ایک ہندہ نورپور بھیجا ہے پولیس کو بلانے پر بتاؤ لی بی پولیس کیا کرے گی؟“ سردار لی بی نے کہا۔

ٹایاب کچھ کہتا چاہتی تھی کہ عذرہ ایک اور لڑکی سسلی کے ساتھ حویلی میں داخل ہوئی۔ سسلی اسی گلی میں رہتی تھی اور عذرہ بہت دیر سے اس کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اس وقت عذرہ کا چہرہ فرد جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے آتے ہی عبدالرحمن کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

”ٹایاب بائی! ایسا خوفناک چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”بس چہرہ ہی چہرہ رہ گیا ہے۔ باقی جسم تو راکھ کے ڈبھری کی صورت میں چادر میں رکھا ہوا ہے۔“

کچھ اور عورتیں بھی آگئیں اور پھر ہر عورت عبدالرحمن کے کتوت بیان کرنے لگی۔ گاؤں کے لوگوں کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ عبدالرحمن نے چاقو سے ٹایاب پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن دار کرنے سے پہلے ہی سانپ نے اسے ڈس لیا تھا۔ اس طرح وہ خود تو جہنم داخل ہو گیا تھا اور ٹایاب بچ گئی تھی۔ جو لوگ اس وقت کھیتوں میں موجود تھے انہوں نے لاش کے ہاتھ میں چاقو بھی دیکھا تھا۔ حویلی میں آنے والی عورتیں ٹایاب کی بلانیں لے رہی تھیں جبکہ دوسری طرف عبدالرحمن کی لاش پر آنسو بہانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اس کی لاش کی راکھ اور رو سیاہ کھوپڑی تماشائی ہوئی تھی اور دیکھنے والے عبرت حاصل کر رہے تھے۔

دو گھنٹے بعد نورپور سے دو پولیس والے بھی پہنچ گئے۔ عبدالرحمن کی لاش کی راکھ اور کونٹے کی طرح سیاہ چہرہ دیکھ کر پولیس والوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مارگریڈ کی کاکیں ہے۔ انہیں شبہ تھا کہ اسے جلا گیا ہے لیکن رمضان سمیت کم از کم درجن بھر آدمیوں نے بیان دیا تھا کہ اسے کسی بہت ہی زہریلے سانپ نے ڈسا تھا۔

کسی نے پولیس والوں کے کان میں یہ بات بھی ڈال دی کہ سانپ کے ڈسنے سے پہلے عبدالرحمن ٹایاب لی بی پر چاقو سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ چاقو آخر تک لاش کے ہاتھ میں تھا لیکن پولیس کو وہ چاقو نہیں مل سکا تھا۔

پولیس کو اپنی جیب گرم کرنے کے لیے ایک نیا راستہ مل گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ٹایاب اس قسم کا کوئی بیان دے دے تو چودھریوں سے کچھ مل سکتا ہے کیونکہ وہ

”سنو“ ٹایاب بھی اٹھ گئی۔ ”یہ باتیں کسی سے مت کہنا۔ میرا مطلب ہے سرگوشیوں والی باتیں۔“

زمرس نے جواب دینے کے بجائے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے پر ہی انکشاف کیا وہ دونوں کمرے سے باہر آگئیں۔ حویلی میں داخل ہونے والی ان دونوں عورتوں میں آ سردار لی بی تھی جو آگے والی گلی میں رہتی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”کیونکہ لی بی! سنا تم نے۔ قمر رب کا۔ جو جیسا کرتا ہے اس کے ساتھ ریا ہی ہے۔“

”کیا ہوا ماسی؟“ کیونکہ نے باورپہی خانے سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

”عبدالرحمن کو سسپ لڑ گیا ہے۔“ سردار لی بی نے کہا۔ ”رب کی لاشی ہے آ ہوئی ہے کیونکہ لی بی! اس نے بڑا ظلم کیا تھا لوگوں پر۔ مظلوموں کی ہائے لگی ہے اسے۔ نہیں کیسا سسپ تھا۔ اس کے ذہن نے عبدالرحمن کے سارے بدن کو کونٹے کی طرح ڈالا۔ پر کونٹہ بھی کہاں۔ وہ تو راکھ بن گیا ہے۔ لوگ اس کی جلی ہوئی راکھ اٹھا کر لا ہیں۔ وہاں چپال والی ٹیٹھک میں رکھی ہے۔ کیا بتاؤں کیونکہ لی بی۔ سارا بدن راکھ ہو ہے“ پر اس کا سر بچ گیا ہے۔ ایسا کالا سیاہ چہرہ اتنی ڈراؤنی شکل تو شیطان کی بھی نہ ہوگی۔ سارے پٹے لوگ آ آ کر اسے دیکھ رہے ہیں اور تپہ تپہ کر رہے ہیں۔“

”برے کا انجام تو برا ہی ہوتا ہے نا ماسی۔“ کیونکہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہو ہوئی۔ ”اللہ سے متانی ناگنی چاہئے۔ رب موت بھی دے تو سکون کی دے۔“

زمرس برآمدے میں کھڑی ٹایاب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سردار لی بی نے ٹایاب دیکھا تو ایک دم بول پڑی۔

”چھوٹی لی بی۔ تمہارے سامنے ہی تو عبدالرحمن کو سسپ لڑا تھا۔ بھائی رمضان بتا تھا کہ عبدالرحمن تھیں چاقو سے مارنے لگا تھا کہ وہ سسپ فرشتہ بن کر کہیں سے آ گیا عبدالرحمن کو ڈس کر چلا گیا۔ تم نے خود دیکھی تھی نا اس کی لاش۔“

”ہاں ماسی۔ یہ سب کچھ میرے سامنے ہی ہوا تھا۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ کیونکہ مز حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ٹایاب نے بات جاری رکھی۔ ”میں ابھی زمرس کو بتا رہی تھی۔“

”وہ پولیس والوں کے ساتھ کیس گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں جا کر ملتا ہوں اس سے اور تم.....“ اس نے ٹایاب کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”جہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن چونکہ تم لوگوں میں مقدمے بازی چلی رہی ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے چودھریوں کو تمہارے خلاف کچھ کرنے کا موقع مل جائے۔“

”آپ مطمئن رہیں بھائی صاحب۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”میں اپنی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہونے دوں گی۔“

”اگر سعادت کوئی غلط حرکت کرتا ہے تو ہم منت لیں گے اس سے، وہ ہمیں بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ عبدالرحمن تم پر حملہ نہیں کرنا چاہتا ہوگا۔ اس نے سعادت کے کہنے پر جہیں ڈرانے کے لیے چاقو نکال لیا ہوگا اور اس میں سمیتا ہوں کہ سعادت بھی اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ یہاں جہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے کیونکہ اس طرح وہ خود پھنس جائے گا۔ بہر حال میں ابھی جا کر معلوم کرتا ہوں کہ اس نے مجھے پیغام کیوں بھیجا تھا۔“ زمرؑ پانی پلاؤ اور سیکھنے تم! اہ جان کی روٹی بیچ دینا میں گھر ہی کا لوں گا۔“

زمرؑ پانی کا گلاس لے آئی۔ سکندر نے پانی پیا اور بار چلا گیا۔

ٹایاب کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ ایک بار پھر اس سحرے سانپ اور اپنے کازوں میں سنائی دینے والی ان سرگوشیوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ زمرؑ نے ان سرگوشیوں کے بارے میں ٹیلی فنی کے حوالے سے جو مشق چش کی تھی وہ اس کے حلق سے نہیں اتر رہی تھی لیکن اگر واقعی سانپ کے دماغ کی فوہیکونسی اس کے دماغ کی فوہیکونسی سے مل گئی تھی تو اسے دنیا کا انوکھا ترین واقعہ قرار دیا جاسکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ اور باتیں بھی اس کے ذہن کو الجھائے ہوئے تھیں۔

جس روز اس نے سانپ کو نونے سے بپایا تھا، سانپ زخمی ہو چکا تھا۔ اس نے سانپ کی پٹ پر ہاتھ رکھا تھا۔ سانپ زخمی ہو تو پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ اس نے ٹایاب کو ڈنٹے کے لیے پھن اٹھایا تھا، پھر دیکھا ہوا کھیت میں غائب ہو گیا تھا اور آج تو اس سے زیادہ حیرت ناک بات ہوئی تھی۔ اس نے اچانک ہی سانپ کو اپنے پیر کے

چودھری کا آدمی تھا۔ یہی سوچ کر پولیس والے ملک صاحب کی حویلی پہنچ گئے لیکن ٹایاب نے پولیس کو کوئی بیان دینے سے انکار کر دیا اور پولیس والے واپس لوٹ گئے۔

اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ملک صاحب کا بیٹا سکندر بھی آ گیا۔ وہ پینے میں تر ہو رہا تھا جیسے تیز دھوپ میں دوڑتا ہوا آیا ہو۔ اس کے چہرے پر کچھ غصہ کے تاثرات بھی تھے۔

”ٹایاب بمن۔“ وہ قریب پہنچ کر بولا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ عبدالرحمن نے تم پر چاقو سے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی؟“

”ہاں بھیا!“ ٹایاب کے بجائے زمرؑ بول پڑی۔ ”اگر اسے وہ سانپ نہ ڈس لیتا تو وہ کبیرٹ ٹایاب کو مار ہی ڈالتا۔“

”مجھے ٹایاب سے بات کرنے دو۔“ سکندر نے زمرؑ کو گھورا۔ ”اس سے پہلے کوئی بات ہوئی تھی؟“ وہ پھر ٹایاب کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں..... اس نے کہا تھا کہ چودھری سعادت کا حکم ہے کہ اگر میں ان زمینوں پر قدم رکھنے کی کوشش کروں تو مجھے ختم کر دیا جائے۔“ ٹایاب نے بتایا۔

”تھوڑی دیر پہلے مجھے ڈیرے پر سعادت کا پیغام ملا تھا۔ پیغام لانے والے شخص ہی نے بتایا تھا کہ عبدالرحمن نے تم پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کو سانپ نے ڈس لیا اور لاش راہ ہو گئی۔ مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا لیکن لاش کی راہ اور اس کا چرو دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا۔ اس علاقے کے سانپ عام طور پر اتنے زہریلے نہیں ہوتے۔ البتہ کبھی کبھار کوئی ایسا زہریلا سانپ اور نکل آتا ہے جس کے کاٹنے کا علاج بھی نہیں ہوتا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیا سانپ تھا جس کے زہر نے اسے جلا کر راہ کر دیا۔“

”وہ گولڈن سانپ تھا بھیا!“ اس مرتبہ بھی زمرؑ بولی۔ ”بالکل سونے کی طرح۔“

”تم تو ایسے کد رہی ہو جیسے اسے دیکھا ہو۔“ سکندر نے پھر اسے گھورا۔

”ٹایاب نے دیکھا تھا، اسی نے مجھے بتایا تھا۔“ زمرؑ نے جواب دیا۔

ٹایاب نے زمرؑ کا ہیرا دیا اور وہ سی کر کے رہ گئی۔

”سعادت نے آپ کو کیوں بلایا تھا؟“ ٹایاب نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

نایاب نے سر جھٹک کر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ وہ ہندو نہیں تھی جو اسے آواگون کے اس عقیدے پر یقین ہوتا۔ نہ ہی وہ سانپ کوئی شہزادہ تھا جسے چاؤ کے ذور سے سانپ بنا دیا گیا ہو۔ وہ محض سانپ ہی تھا جس کے ذہن میں ایسی تاثیر تھی کہ انسان کے جسم کو جلا کر راکھ کر ڈالا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ زمس کا یہ خیال درست ہو کہ وہ اس سانپ کے دماغ کی لہریں تھیں جو اس کے دماغ سے کھراگئی ہوں۔ اس نے زندگی بچانے پر نایاب کا شکر یہ ادا کیا ہو اور سوچ کی وہ لہریں سرکشی بن کر نایاب کو سنائی دی ہوں۔ ایسی بت سی مثالیں نایاب کے سامنے تھیں کہ کسی انسان نے کسی جانور پر ترس کیا کہ اس کی زندگی بچائی ہو اور بعد میں کسی موقع پر اس جانور نے کسی آڑے وقت میں اپنے صحن کی کسی طرح مدد کی۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے نایاب کی آنکھ لگ گئی اور وہ بسز پر آڑھی ترچھی پڑی سو گئی۔

تیسری قسط

ملک سکندر گیلوں میں سے ہوتا ہوا گاؤں کے مرکزی چوک پر پہنچ گیا۔ یہ بت بڑا ہلکا تھا۔ درمیان میں ایک بڑا سا چوڑا بنا ہوا تھا جس کے وسط میں گرگہ کا بت بڑا درخت تھا۔ چوڑے پر خوارچے والے اپنی دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ کوئی کچوڑے بیچ رہا تھا۔ کوئی گلے سڑے پھل لیے بیٹھا تھا۔ ایک طرف موہنی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی غلام نے اپنی دکان سجا رکھی تھی۔ پرانی سی کرسی اور اس کے سامنے ایک سانچورہ سی میز جس پر اس کی چڑیاں بچی ہوئی تھیں۔ درخت کے تنے پر ایک آئینہ لٹکا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک کیل سے چوڑے کا ایک لہبا سا گھوڑا لٹکا ہوا تھا جس پر غلام اپنا استرو تھیر کیا کرتا تھا۔

چوک کے چاروں طرف بھی دکانیں تھیں۔ گاؤں والوں کو اپنی ضرورت کی تقریباً ہر چیز یہاں مل جاتی تھی۔ ایک گلی میں دکانوں کے ساتھ ہی چوپال تھی۔ یہ بت بڑا کرہ تھا جس میں دریاں بھیجی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے لوگ فارغ اوقات میں یہاں بیٹھ کر کپ شپ کیا کرتے تھے۔ عام طور پر شام کے بعد یہاں رونق ہوتی تھی۔ دن میں اکا واکا لوگ ہی اوجھ

قریب کنٹلی مارے بیٹھے دیکھا تھا۔ پھر وہ اس کی ٹانگ سے لپٹ کر بچے اترتا تھا اور عبدالرحمن کے پیچھے لگ گیا تھا۔ عبدالرحمن کو ڈسنے کے بعد وہ دوبارہ اس کی ٹانگ سے لپٹا تھا اور اتر کر کھیت میں گھس گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی نایاب کو اپنے کان میں وہ سرکشی سنائی دی تھی۔ الفاظ بہت واضح تھے۔ کسی نے کہا تھا۔ ”میں احسان فراموش نہیں ہوں“ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔“

وہ سرکشی اب بھی نایاب کے کانوں میں گونج رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ واقعی سانپ تھا جس نے اسے عبدالرحمن سے بچا کر احسان کا بدلہ چکایا تھا یا وہ سانپ نہیں تھا کوئی اور چیز تھا۔

نایاب نے سر جھٹک دیا۔ ایسی کمائیاں اس نے بچپن میں سنی تھیں۔ کسی چادوگرنی نے شہزادے کو چاؤ کے ذور سے مینڈک، کھسی یا کوئی اور جانور بنا دیا اور اس شہزادے کو اصلی حالت میں آنے کے لیے کسی شہزادی کا انتہار آج کے جدید ترین سائنسی دور میں ان دیوالائی کمائیوں کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ آج کی نائیاں اور وادیاں بچوں کو جیوں پر یوں اور شہزادوں کی پر اسرار کمائیاں سنانے کے بجائے سائنس کے شعبے سے بازیوں کی کمائیاں سناتی ہیں۔ وہ بچوں کو بتاتی ہیں کہ انسان چاند پر کس طرح پہنچا۔ کوہ قاف کو پہلے بت پر اسرار سمجھا جاتا تھا جہاں جیوں اور پر یوں کی سلطنت تھی مگر آج کے بچے جانتے ہیں کہ کوہ قاف روس کے ایک پہاڑی سلسلے کا نام ہے، اس کی بلندی کیا ہے اور یہاں کون کون سی معدنیات پائی جاتی ہیں۔

لیکن دیوالائی کمائیوں پر یقین نہ ہونے کے باوجود نایاب کا ذہن بری طرح الجھتا جا رہا تھا اور پھر دقت! اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سانپ کی عمر سو سال ہو جائے تو اسے اتنی قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ ضرورت کے وقت انسان کا روپ دھار سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے بہت سی کمائیاں سنی تھیں اور فلمیں بھی دیکھی تھیں اور پھر اس نے ہندوؤں کے عقیدے کے بارے میں بھی بہت کچھ پڑھا تھا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ کسی کے مرنے کے بعد اس کی روح دوسرا جنم لیتی ہے۔ یہ دوسرا جنم انسان کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور کسی اور جانور کی صورت میں بھی۔ تو کیا وہ شہزاد سانپ جیسے جنم میں کوئی انسان تھا؟

”دیکھو سکندر۔“ سعادت بولا۔ ”تم ہمارے معاملات میں مداخلت کر رہے ہو۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ لڑکی اب میری بھانج نہیں رہی اور پھر اس پر حملہ کے حوالے سے تم مجھ پر الزام لگانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میرا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ غلط ہے کہ عبدالرحمن نے اس پر چاقو سے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ثایاب کو زینوں پر آنے سے منع کیا ہو گا۔“

”لیکن کم از کم ایک درجن آدمیوں نے وہ چاقو عبدالرحمن کی لاش کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔“ سکندر نے کہا۔ ”تم اس کے گھر کے دروازے تڑوا کر شاید یہاں سے بھی ایسی چیزیں غائب کرنا چاہتے ہو جن سے تمہارے کسی جرم کی قطعی کھلی ہو۔“

”دیکھو سکندر۔“ چودھری سعادت نے اسے گھورا۔ ”ہمارے گھرانوں کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ یہ دونوں خاندان کئی پیدائش سے یہاں آباد ہیں۔ میرا اور تمہارا بچپن ایک ساتھ گزرا ہے۔ ہمارے گھرانوں میں کبھی کوئی معمولی سی رنجش بھی نہیں ہوئی۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک رہے ہیں لیکن اب تم اس لڑکی کی وجہ سے تعلقات کیوں بگاڑ رہے ہو؟ پتہ نہیں وہ کون ہے؟ کس خاندان کی ہے؟ اس نے دولت کے لالچ میں میرے بھائی کو چھانسا لیا تھا لیکن سرفراز کی موت کے بعد ہمارا وہ رشتہ بھی ختم ہو چکا ہے جو اس نے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سرفراز کے ذریعے ہماری اس جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتی تھی جسے بنانے کے لیے ہمارے پردرگوں نے بڑی محنت کی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم یہ جائیداد آسانی سے اس کے حوالے کر دیں گے۔ ہمارا اس سے اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ تم لوگ اس کی حمایت کیوں کر رہے ہو؟“

”تمہارا اور اس کا رشتہ ختم نہیں ہوا۔“ سکندر نے جواب دیا۔ ”وہ تمہارے چھوٹے بھائی کی بیوہ ہے۔ تمہارے گھرانے کی عزت ہے مگر تم لوگوں نے اسے دودھ میں سے کھمی کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا۔ اگر اسے عزت و احترام کے ساتھ گھر میں رکھتے، اسے اس کا مقام دیتے تو یہ صورتحال پیدا نہ ہوتی۔ اسے اس کا جائز مقام مل جاتا تو وہ کبھی بھی جائیداد میں سے حصے کا نہ سوچتی مگر تم لوگوں نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے مجبور ہو کر اپنا حق حاصل کرنے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تم میں حوصلہ ہوتا تو عدالت کے فیصلے کا انتظار کرتے مگر تم اوجھے جھکڑوں پر اتر آئے۔ تم نے عبدالرحمن کے

ذریعے اسے قتل کروانے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے تم خود بھی اسے دھکا دیکھے ہو۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ چودھری سعادت نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس نے کن انگوٹھوں سے پولیس والوں کی طرف دیکھا اور پھر سکندر کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”تم اب جاؤ“ میں بعد میں تم سے بات کروں گا لیکن اس لڑکی کو یہ سمجھا دینا کہ آئندہ وہ میرے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرے۔“

”ایک بات میں بھی تمہیں سمجھا دینا چاہتا ہوں۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”ثایاب ہمارے ہمسایہ ہیں اور تم جانتے ہو کہ ہم ہمسایوں کی کتنی عزت کرتے ہیں۔ اگر اس لڑکی کو کسی بھی قسم کا گزند پہنچا تو اس کا نتیجہ بہت برا ہو گا۔“

”تم ان دو پولیس والوں کی موجودگی میں مجھے دھمکی دے رہے ہو۔“ چودھری سعادت نے کہا۔ ”یہ پولیس والے تمہارے خلاف قانونی کارروائی بھی کر سکتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں یہ پولیس والے تمہارے ذریعہ ہیں۔“ ملک سکندر نے جواب دیا۔ ”لیکن میں تمہارا مزارع نہیں ہوں جس کے ساتھ تم جو چاہو سلوک کر سکو۔“

”چودھری جی۔۔۔۔۔ ملک جی۔۔۔۔۔“ ایک پولیس والا ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ دونوں آپس میں کیوں لڑتے ہو جی۔ ہم تو آپ دونوں گھروں کے خادم ہیں جی! ہم کو چھ میں مت لاؤ جی!“

چودھری کچھ کھتا چھتا تھا لیکن اس شخص کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گیا جو تالے پر ہتھوڑی سے ضربیں لگا رہا تھا۔ تالا نوٹ کر کنڈے میں لٹک گیا تھا۔ اس شخص نے تالا نکال کر کنڈا کھول دیا۔

”آئیں جی۔۔۔۔۔ آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ اندر آئیں۔“ اس پولیس والے نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

وہ لوگ اندر آئے۔ وہ دونوں آدمی بھی ان کے ساتھ ہی اندر داخل ہوئے تھے جو برآمدے میں کھڑے تھے۔ ایک پولیس والے نے جی جلا دی۔ کمرے میں ٹیپ لائٹ کی نفرتی روشنی پھیل گئی۔

کمرہ خاصا بڑا تھا۔ سرخ فرش پر سفید سینٹ سے پھول بنے ہوئے تھے۔ گاؤں دیہاتوں میں قالین استعمال نہیں ہوتے۔ فرش کو ہی رنگ برنگ بنا کر قالین کا شوق پورا کر لیا جاتا

واقعہ یاد آگیا جب ماسٹر اچھ علی کی بوسہ کیتھن میں مٹی تھی اور عبدالرحمن کے ہتھے چڑھ مٹی تھی اور پھر اس نے دوپٹے سے گلے میں پھندہ ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔ پورے گاؤں کو پتہ چل گیا تھا کہ ماسٹر اچھ علی کی بوسہ عبدالرحمن اور چودھری سعادت کی بوس کا شکار ہوئی تھی۔ پولیس کو اطلاع دی گئی تھی اور پولیس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ ماسٹر اچھ علی کی بوس نے گھوٹلے بھڑوں سے تنگ آکر خودکشی کر لی تھی اور اس طرح یہ کیس ختم کر دیا گیا تھا۔

”یہ..... یہ دیکھ رہے ہو چودھری۔“ ملک سکندر وہ کنٹھا چودھری سعادت کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ کنٹھا کیا ثابت کر رہا ہے؟ میں نہیں جانتا یہ پولیس والے تلاشی کس لیے لیتا چاہتے تھے لیکن اچھا ہی ہوا کہ میں بھی پہنچ گیا اور یہ وہ شریف آدمی بھی میاں موجود ہیں اور دیکھو سنتری بادشاہ..... یہاں کیا کچھ ہے۔“

پولیس والا اب بھی ایک ایک زیور اٹھا کر دیکھ رہا تھا اور پھر ملک سکندر نے ہاتھ پدھا کر سونے کی ایک زنجیر اٹھالی۔ اس میں لاکٹ کی جگہ انگریزی کا حرف ایس لٹکا ہوا تھا۔ یہ لاکٹ خالص سونے کا تھا اور زنجیر سمیت اس کا وزن دو تولے سے زیادہ ہی تھا۔

”یہ دیکھ رہے ہو چودھری؟“ سکندر وہ لاکٹ چودھری سعادت کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم اپنے لاکٹ کو بھی نہیں پہچانتے۔“ ہمیں یاد ہو گا کہ چار سال پہلے ہم دونوں نے نورپور سے یہ لاکٹ بنوائے تھے۔ یہ دیکھو میرا لاکٹ میرے گلے میں موجود ہے۔“ اس نے اپنے گلے میں پڑا ہوا لاکٹ دکھایا۔ طلائی زنجیر میں بائیں دینا ہی انگریزی کا حرف ایس لٹکا ہوا تھا۔ یہ دونوں لاکٹ ہم نے اکٹھے ہی بنوائے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے پتہ چلا تھا کہ تمہارا لاکٹ چوری ہو گیا ہے اور تم نے اپنے ایک ٹوکرو کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ تم نے تو کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ تمہارا یہ یار غار ہی چور ثابت ہو گا۔“

چودھری سعادت کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ ہکے کسنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

”سنتری بادشاہ۔“ ملک سکندر بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ ساری چیزیں ان بے گناہ اور معصوم لڑکیوں کی ہیں جو عبدالرحمن اور اس کے ساتھیوں کی بوس کا شکار ہوئیں اور ان میں سے بعض نے خودکشی کر لی۔ علی بخش..... وہ بات کرتے ہوئے علی بخش کی طرف گھوم گیا۔ ”ان گھروں میں جا کر بتا دو کہ وہ میاں آکر اپنی اپنی چیزیں شناخت کر لیں۔“

”لیکن ملک جی۔“ پولیس والا بولا۔ ”ہم یہ چیزیں لوگوں کو واپس نہیں کر سکتے۔ اس کا

ہے۔ ایک طرف بڑی شاندار مسمری تھی جس پر آرام وہ بستر بچا ہوا تھا۔ یہ مسمری عبدالرحمن نے گاؤں کے بڑھتی سے بنوائی تھی۔ مسمری کے ساتھ ہی ایک چھوٹی میز تھی جس پر مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف کلائی کی ایک الماری الیٹانہ تھی سامنے والی دیوار پر باہر شریف کی تصویر والا ایک کیلنڈر لٹکا ہوا تھا۔ کیلنڈر اگرچہ دو سا پرانا تھا مگر باہر شریف کی رنگین تصویر کی وجہ سے لٹکا ہوا تھا۔

دونوں پولیس والے کمرے میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ایک پولیس والے۔ الماری کھول دی اور اس میں بھرے ہوئے کپڑے اٹھا کر تلاشی لینے لگا جبکہ دوسرا پولیس والا مسمری کا بستر اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ ملک سکندر کو حیرت تھی کہ ان پولیس والوں میں کس چیز کی تلاش تھی۔ عبدالرحمن سانپ کے ڈسنے سے ہلاک ہوا تھا۔ اس کی لاش پر اسرار طور پر راگ بین مٹی تھی۔ پولیس کو اطلاع دی گئی تھی۔ پولیس والوں نے لوگوں کی بات لے کر یہ تصدیق کر لی تھی کہ عبدالرحمن واقعی سانپ کے کاٹنے سے ہلاک ہوا تھا اس کے گھر کی تلاشی والی بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔

پولیس والے نے الماری کی ایک دروازہ کھول لی اور پھر اس کی آنکھوں میں چمک ابھرائی۔ اس دروازہ میں سونے کے کئی زیورات رکھے ہوئے تھے۔ پولیس والے نے پوری دروازہ باہر کھینچ کر مسمری پر رکھ دی اور ایک ایک زیور اٹھا کر دیکھنے لگا۔ ملک سکندر دوسرے دو آدمی اور چودھری سعادت بھی ان زیوروں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پولے والے نے سونے کا ایک کنٹھا اٹھایا تو ملک سکندر کے ساتھ کھڑا ہوا علی بخش اچھل پڑا۔ اے پولیس والے کے ہاتھ سے وہ کنٹھا چھپ گیا۔

”یہ..... یہ کنٹھا تو ماسٹر اچھ علی کی بوس کا ہے۔“ وہ چودھری سعادت کی طرف دیکھ ہوئے بولا۔ ”مجھے یاد ہے اس کے بیٹے کی شادی کے چند ہی روز بعد اس کنٹھے کا ایک ٹوٹ گیا تھا۔ ماسٹر اچھ علی یہ کنٹھا مرمت کرانے کے لیے نورپور گیا تھا تو میں بھی اس ساتھ تھا۔ یہ میاں سے ٹوٹا تھا اور یہ ٹانگا لٹکایا گیا تھا۔“ اس نے ایک ٹانگے کی طرف اشارہ کیا جو نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا۔

ملک سکندر نے علی بخش کے ہاتھ سے وہ کنٹھا لے لیا۔ اسے ڈیڑھ سال پہلے کا

فیصلہ تو تھانیدار ہی کرے گا۔

”ٹھیک ہے۔“ ملک سکندر بولا۔ تم میں سے ایک آدمی جا کر تھانیدار کو یہاں بلا لائے۔ یہ بات اب آسانی سے ختم نہیں ہو سکتی۔ اگر تھانیدار یہاں نہ آیا تو میں کل رات نورپور جا کر ڈپٹی کمشنر سے ملوں گا۔ تم ان تمام چیزوں کی لسٹ بنا کر میرے حوالے کرو اور یہ چیزیں اپنے قبضے میں رکھو۔“ اس نے سعادت والا لاکٹ بھی پولیس کے حوالے کر دیا اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو چودھری سعادت غائب تھا۔ صورتحال نے اسے بدحواس کر دیا تھا اور وہ خاموشی سے وہاں سے کھسک گیا تھا۔

دونوں پولیس والے انہیں میں کمرہ پھر کرنے لگے۔ وہ ملک چیلی کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے تعلقات بھی بہت اوپر تک تھے۔ سب ہی جانتے تھے کہ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر سے ملنا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ ڈپٹی کمشنر تک پہنچنے کی دھمکی ہی کافی ثابت ہوئی تھی اور ایک پولیس والا تھانیدار کو اطلاع دینے کے لیے فوراً ہی نورپور روانہ ہو گیا تھا۔ دوسرا پولیس والا ان چیزوں کی فہرست بنا رہا تھا۔ ملک سکندر نے فہرست پر دیکھا کہ اس نے اپنی جیب میں رکھ لی اور علی بخش کو وہیں رہنے کی ہدایت دیتا ہوا مکان سے باہر آ گیا۔

”اگر امانداری سے تحقیقات کی جائیں تو یہ ثابت ہو سکتا ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”نکل چودھری سعادت کو پتہ چل گیا تھا کہ نرین سے اترنے کے بعد وہ رات میں نے اسٹیشن ماسٹر کے گمر میں گزار دی تھی اور راشدہ نے مجھے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔“

”ہاں یہ ہے ٹایاب! سن!“ سکندر نے کہا۔ ”دیاننداری سے تحقیقات کن کرے۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور یہ چودھری لوگ جس طرح چہرہ فریج کر رہے ہیں، وہ تم دیکھ ہی رہی ہو۔“

”وہ لوگ تک چہرہ فریج کریں گے۔“ ٹایاب بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ پولیس کے حکم میں ابھی دیانندار لوگوں کا کال نہیں پڑا۔ میں کراؤں گی یہ تحقیقات۔“

”ٹایاب! سن۔ تم اپنے آپ کو ان معاملات میں زیادہ مت الجھاؤ۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”تم عورت ذات ہو۔ کہاں تک ان کا مقابلہ کرو گی۔“

”میری بات ہے کہ عورت کو کمزور سمجھ لیا گیا ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”عورت کمزور نہیں ہے۔ اگر وہ کچھ کرنے پر قائل جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ تاریخ خواتین کی بہادری اور جرات و ہمت کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ چاند بی بی، رضیہ سلطانہ اور جھانسی کی رانی کے نام فراموش نہیں کیے جاسکتے جنہوں نے اپنی دھیری اور جرات سے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔“

”ٹایاب! سن۔ وہ عام عورتیں نہیں تھیں۔“ سکندر نے کہا۔ ”وہ حکمران تھیں اور ان

”سکندر بھائی۔“ آپ کو یاد ہو گا کہ تقریباً پانچ سال پہلے سعادت نے راشدہ کو مزاحمت کرنے پر کھولتے ہوئے کڑھان میں پھینک دیا تھا۔“ ٹایاب نے سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ اسٹیشن ماسٹر کی بیوی راشدہ۔“ سکندر بولا۔ ”یہ تمہاری شادی سے چند ہفتے پہلے کی بات ہے۔ راشدہ بری طرح جل گئی تھی۔ اس کا پورا جسم ہی نہیں چہرہ بھی بڑھ

”سکندر بھائی۔“ آپ کو یاد ہو گا کہ تقریباً پانچ سال پہلے سعادت نے راشدہ کو مزاحمت کرنے پر کھولتے ہوئے کڑھان میں پھینک دیا تھا۔“ ٹایاب نے سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سکندر بھائی۔“ آپ کو یاد ہو گا کہ تقریباً پانچ سال پہلے سعادت نے راشدہ کو مزاحمت کرنے پر کھولتے ہوئے کڑھان میں پھینک دیا تھا۔“ ٹایاب نے سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ اسٹیشن ماسٹر کی بیوی راشدہ۔“ سکندر بولا۔ ”یہ تمہاری شادی سے چند ہفتے پہلے کی بات ہے۔ راشدہ بری طرح جل گئی تھی۔ اس کا پورا جسم ہی نہیں چہرہ بھی بڑھ

بیٹھے ہوئے تھے۔ چودھری سعادت موجود نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ملک سکندر اور قنادیار میں باتیں ہوتی رہیں۔ قنادیار کی باتوں سے ملک سکندر کو یہ اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ چودھری سعادت نورپور جا کر اس کی خدمت میں نذرانہ پیش کر آیا تھا۔

ملک سکندر بھی آسانی سے قنادیار کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے ہر حال اسے دو باتوں پر آمادہ کر لیا۔ ایک تو یہ کہ عبدالرحمن کے گھر سے برآمد ہونے والے زیورات ان لوگوں کو واپس کر دینے جائیں جن کی ملکیت تھی اور دوسرے یہ کہ عبدالرحمن کے خلاف ان سنگین جرائم کی باقاعدہ رپورٹس درج کی جائیں گی اور تحقیقات شروع کی جائے گی۔ ملک سکندر نے چودھری سعادت کو براہ راست عبدالرحمن کے جرائم میں لوٹ کیے جانے پر خند نہیں کی تھی۔ وہ براہ راست چودھری فیلی سے دشمنی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ تحقیقات کے دوران ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ چودھری سعادت خود ہی جھنجھ جائے گا۔

نایاب کو یہ سب کچھ معلوم ہوا تو وہ مسکرا کر رہ گئی تھی۔

چوتھی قسم

نایاب خوش نہیں تھی لیکن وہ کسی حد تک مطمئن ہو گئی تھی کہ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے چودھری سعادت قانون کے کھٹے میں آسکتا تھا لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ تحقیقات صحیح رخ پر اور دبانڈاری سے کی جائیں۔ نایاب اگرچہ سمجھ گئی تھی کہ سعادت نے پولیس آفیسر کی خدمت میں ہماری نذرانہ پیش کر کے اپنے لیے راہ ہموار کر لی تھی لیکن اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آسانی سے وہ سب کچھ نہیں ہونے دے گی جو چودھری سعادت چاہتا تھا۔

پرانے واقعات کے بارے میں تحقیقات کرنا اور ان میں چودھری سعادت کا لوٹ ہونا ثابت کرنا اگرچہ نایاب کے لیے بہت مشکل تھا لیکن اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی اور اس کی بیوی راشدہ کو زندہ جانے کا واقعہ تو بالکل نازہ تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اسٹیشن ماسٹر کے گھر کو آگ چودھری سعادت نے لگوائی تھی اور آگ لگانے والوں میں عبدالرحمن بھی شامل تھا

کے ساتھ اپنے عوام اور فوج کی طاقت تھی۔ گھروں کی چار دیواری کے اندر محدود رہنے والی ہماری عورتیں کیا کر سکتی ہیں۔ ان میں تو اتنی ہمت بھی نہیں کہ اکیلی یہاں سے نورپور تک چلی جائیں۔“

”میں نہ تو بزدل ہوں اور نہ اکلی۔“ نایاب نے جواب دیا۔ ”میرا خدا میرے ساتھ ہے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، وہ میرا ساتھ دیں گے۔“

”دیسے تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ کبھی حمیس اکیلا نہیں چھوڑیں گے لیکن بات یہ ہے نایاب بہن کہ تم دوسروں کے جھگڑوں میں اپنے آپ کو نہ پھنساؤ۔ چودھری سے تمہارا مقدمہ عدالت میں ہے اور ہمیں امید ہے کہ فیصلہ تمہارے ہی حق میں ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان جھگڑوں میں پڑ کر انہیں تمہارے خلاف کوئی اور کارروائی کرنے کا موقع مل جائے اور اس کا اثر تمہارے مقدمے پر پڑے۔“

”میں انہیں اپنی کوئی موقع فراہم نہیں کروں گی۔“ نایاب نے جواب دیا۔ ”بلکہ مجھے توقع یہ ہے کہ چودھری سعادت بوکھلا کر کوئی ایسی اوجھی حرکت ضرور کرے گا جس سے وہ خود پھنس جائے گا۔“

ملک سکندر کچھ کہتا ہی چاہتا تھا کہ سکندر اندر داخل ہوئی۔

”ارے بھئی باتیں ہی کرتے رہو گے یا کھانے کا بھی خیال ہے۔ میں نے کھانا لگا دیا ہے۔“ اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اُپا کو کھانا بھجوا دیا؟“ سکندر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”بہت دیر ہوئی۔“ سکندر نے کہا۔ ”پلٹے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

وہ لوگ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئے۔ عذرہ اور زمریں پہلے ہی سے وہاں موجود تھیں۔

کھانے کے دوران بھی عبدالرحمن ہی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ کھانے کے بعد سکندر اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ چار بیجے کے قریب علی بخش نے آکر بتایا کہ قنادیار آگیا ہے اور اسے بلایا جا رہا ہے۔

قنادیار کے ساتھ تین پولیس والے اور بھی تھے اور وہ عبدالرحمن کے گھر ہی میں

جواب دیا۔ ”بعد میں اشیش ماسٹر نے بتایا تھا کہ آپ کون ہیں۔ بہت پہلے آدمی تھے بچارے۔ کسی کے لیے دینے میں نہیں تھے۔ خدا جانے کس نے دونوں مہیاں بیوی کو جلا ڈالیں۔“

”اس روز تم نے کسی کو یہاں دیکھا تھا۔ کوئی مشتبہ آدمی؟“ ٹایپ نے پوچھا۔
 ”جس رات آپ یہاں رکے تھے، گاؤں سے چند عورتوں کے وہ آدمی آئے تھے۔ میں اس وقت اشیش پر بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے کوئی عورت تو نہیں اتری؟ میں نے نہ تو آپ کو نہیں سے اترے دیکھا تھا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ اشیش ماسٹر کے گھر میں ہیں۔ اس لیے میں نے لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا۔ بعد میں انہوں نے اشیش ماسٹر کو بھی گھر سے بلا کر آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔ پھر واپس چلے گئے تھے۔“

”کیا تم ان دونوں میں سے کسی کو جانتے ہو؟“ ٹایپ نے پوچھا۔
 ”ان میں ایک تو عبدالرحمن تھا جو اکثر اشیش پر آتا رہتا تھا۔ سنا ہے اسے سانپ نے ڈس لیا تھا اور اس کی لاش راکھ بن گئی تھی۔“ اس شخص نے پوچھا۔
 ”ہاں ایسے لوگوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔“ ٹایپ نے جواب دیا۔ ”اشیش ماسٹر کے گھر کو آگ کس وقت لگی تھی؟ کیا تم نے اس سے پہلے کسی کو دیکھا تھا؟“

”رات دو بجے مال گاڑی آئی تھی تو عبدالغنی اشیش پر ہی موجود تھا۔“ ہوائنٹس میں نے جواب دیا۔ ”گاڑی چلے جانے کے بعد وہ بھی اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں نے شور کی آواز سنی۔ میں اس وقت بچہ پر لیٹے لیٹے سو گیا تھا۔ میں نے اٹھ کر باہر نکلتا تھا تو پتہ چلا کہ دفتر کے دروازے کو باہر سے کسی نے کڑا لگا دیا تھا۔ میں اندر سے چنچن رہا لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں نے دفتری بیگ وٹو سے جھاک کر دیکھا تو مجھے تین چار آدمی نظر آئے۔ ایک آدمی گھوڑے پر سوار تھا اور تین اشیش ماسٹر کے مکان پر کوئی چیز، غالباً مٹی کا ٹیل چھڑک رہے تھے۔ پھر انہوں نے آگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھ کر اٹھی اور پورے کوارٹر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اندر سے اشیش ماسٹر اور اس کی بیوی کی چیزوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ وہ چاروں آدمی باہر کھڑے کھتے لگے اور ہندوؤں سے فاصلہ کرتے رہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر ایک طرف

اور ٹایپ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس واقعہ کو وہ دہنے نہیں دے گی اور ان دونوں بے گناہوں کا خون رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔

ملک صلاح الدین کے گھر میں شہر آئے جانے کے لیے ایک کار بھی تھی اور عام استعمال کے لیے یکہ بھی تھا۔ ان کے پاس تین چار ایسے گھوڑے بھی تھے۔ ٹایپ گھڑ سہاری جانتی نہیں تھی اور کار وہ استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دوسرے دن اس نے ملک صاحب کی اجازت سے یکہ تیار کروایا اور ریلوے اشیش کی طرف روانہ ہو گئی۔ کوچوان ملک صاحب کا ملازم خاص رسول بخش تھا۔

زمینداروں کے یکے اور آٹکے کاروں سے بھی زیادہ قیمتی سمجھے جاتے تھے۔ ملک صاحب کا یکہ بھی بہت شاندار تھا۔ شیشیں بہت آرام دہ تھیں جن پر شیل کے خوبصورت کور چڑے ہوئے تھے۔ ویسے بھی یکہ خوب سچا ہوا تھا اور گھوڑا بھی خوب تندرست اور پلا ہوا تھا۔

وہ آدھے گھنٹے میں ریلوے اشیش پہنچ گئی۔ رسول بخش نے یکے کو ایک درخت کے سائے میں کھڑا کر دیا۔ ٹایپ کے سے اتر کر عبدالغنی کے کوارٹر کی طرف دیکھنے لگی جو جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ تینوں کمروں کی چھتیں گر چکی تھیں۔ صرف دیواریں کھڑی رہ گئی تھیں۔

ٹایپ ایک طرف کھڑی ہونے لگی اس ڈھیر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک اویس عمر آدمی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ٹایپ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس شخص نے نیلی قبض اور اسی رنگ کا اونچا سا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ دو تین دن کا شیوہ بڑھا ہوا تھا۔ سر کے بال بھی بے حاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ وہ اشیش کا ہوائنٹس میں تھا۔

”ہی بی۔ آپ وہی ہیں نا جو اس رات اشیش ماسٹر صاحب کے گھر میں رہی تھیں؟“ ہوائنٹس میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”جیس کہیے پتہ چلا کہ میں نے رات یہاں گزار دی تھی۔ کیا تم نے مجھے دیکھا تھا؟“ ٹایپ نے اسے گھورا۔

”اس رات کو تو نہیں دیکھا تھا لیکن دوسرے دن صبح دس بجے کے قریب آپ کو اشیش ماسٹر کے دوست کے ساتھ گاڑی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ اس شخص نے

”وہ لوگ تقریباً ایک گھنٹے تک یہاں رہے تھے۔“ ہوائنٹس مین نے بتایا۔ ”کووارٹر مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں تھا۔ اسٹیشن ماسٹر اور اس کی بیوی کی چیخیں بھی بند ہو گئی تھیں۔ صبح چھ بجے کے قریب میری بیوی اپنے کووارٹر سے باہر نکلے اور جتنی ہوئی یہاں آگئی۔ دفتر کے دروازے کا کٹڑا اسی نے کھولا تھا۔“

نایاب کچھ دیر تک اور ہوائنٹس مین سے باتیں کرتی اور لمبے کے ڈھیر کی طرف دیکھتی رہی۔ بیکہ کی طرف واپس آئی تو نیا اسٹیشن ماسٹر مسافر خانے والے برآمدے میں کھڑا تھا۔ نایاب کچھ دیر تک اس سے باتیں کرتی رہیں اور پھر یکے پر سوار ہو گئی۔

اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ہوائنٹس مین نے گھوڑے کی نشانی کے بارے میں جو افکشاف کیا تھا وہ دلچسپ تھا۔ اس نشانی سے مجرموں تک پہنچا جا سکتا تھا۔ نایاب کو اگرچہ یقین تھا کہ عبدالرحمنی کے کووارٹر کو آگ چودھری سعادت ہی نے لگوائی تھی اور آگ لگنے والوں میں عبدالرحمن بھی شامل تھا۔ ہوائنٹس مین کی باتیں سننے کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرنا چاہتی تھی لیکن پہلے وہ تصدیق کر لیتا چاہتی تھی کہ چودھری سعادت یا اس کے آدمیوں میں سے کسی کے پاس ایسا گھوڑا ہے یا نہیں۔ یہ تصدیق کرنے کے لیے وہ گاؤں واپس آگئی۔

اور پھر یہ افکشاف نایاب کے لیے بڑا مستثنیٰ خیر ثابت ہوا کہ وہ گھوڑا عبدالرحمن کی ملکیت تھا۔ اس روز سے پھر کے وقت اس نے وہ گھوڑا رمضان کے پاس دیکھا تھا۔ ”بہت جائزہ اور خوبصورت گھوڑا ہے رمضان بھائی۔ یہ کس کا ہے؟“ نایاب نے کمری نظروں سے گھوڑے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی ایال اور گھٹنے سے اوپر کے بال سیاہ تھے۔

”عبدالرحمن کا ہے۔“ رمضان نے منہ ہاتھ ہوئے جواب دیا۔ ”اس کی طرح بدتمیز اور بد مزاج۔ کسی کو قریب ہی نہیں آئے دیتا۔ میرے ساتھ اس لیے شرافت کا مظاہرہ کرتا ہے کہ میں بھی گھماؤ اس کی مثل سہوا کرتا رہتا ہوں۔“

”پرسوں رات یہ گھوڑا کہاں تھا؟“ نایاب نے پوچھا۔

”پتہ نہیں چھوٹی بی بی، طویلے میں ہو گا۔“ رمضان نے جواب دیا۔

”میں۔ پرسوں رات یہ طویلے میں نہیں تھا۔ اسے پرسوں رات تین بجے کہیں اور

اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ میرا کووارٹر ہے اور اس کے ساتھ پانی والے کا۔ پانی والا آج کل چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ میری بیوی گھر آگئی تھی۔ مجھے اس کی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں لیکن وہ بہر حال محفوظ تھی۔“

”کیا تم نے ان آدمیوں میں سے کسی کی شکل دیکھی تھی؟“ نایاب نے پوچھا۔

”نہیں۔ انہوں نے چروں پر ڈھانٹے ہاتھ رکھے تھے۔“ ہوائنٹس مین نے جواب دیا۔ ”مجھے اس جگہ دھڑو سے سب کچھ نظر آ رہا تھا لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں خود بھی ڈر رہا تھا۔“

”کوئی اور ایسی نشانی جس سے ان میں سے کسی کی شناخت ہو سکتی ہو؟“ نایاب نے پوچھا۔

”ہاں! اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ جس شخص کو میں نے پہلے گھوڑے پر سوار دیکھا تھا“ اس کا گھوڑا سفید تھا مگر اس کی آگے والی دائیں ٹانگ پر گھٹنے سے ران تک سیاہ بال تھے۔ اس کی ایال کے بال بھی سیاہ تھے۔“

”کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو؟“ نایاب نے پوچھا۔ ”اور کیا پولیس کو تم نے یہ بات بتائی تھی؟“

”پولیس نے مجھ سے یہ بات نہیں پوچھی تھی اور مجھے بتانا یاد بھی نہیں رہا تھا۔“ ہوائنٹس مین نے جواب دیا۔ ”اور میں گھوڑے کی اس نشانی کے بارے میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ اسٹیشن ماسٹر کا کووارٹر آگ کی لپیٹ میں تھا اور شعلوں کی روشنی میں دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر ان آدمیوں کے چروں پر ڈھانٹے نہ ہوتے تو میں ان کی شکلیں بھی دیکھ لیتا۔“

”ریلوے کے آفیسر انکوائری کے لیے نہیں آئے؟“ نایاب نے پوچھا۔

”کل آئے تھے بی۔“ ہوائنٹس مین نے جواب دیا۔ ”پولیس بھی فور پور سے کل آئی ہوئی تھی۔ وہ لوگ کل شام پانچ بجے تک یہاں رہے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر بھی نیا آیا ہے اور اس وقت دفتر میں بیٹھا ہوا ہے۔“

”تم نے بتایا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر کے کووارٹر کو آگ لگنے سے پہلے کسی نے دفتر کے دروازے کو باہر سے کھڑا لگا دیا تھا“ پھر تم باہر کیسے نکلے تھے؟“ نایاب نے پوچھا۔

وہ حویلی سے نکل کر تیسرے مکان کے سامنے رک گئیں۔ اس مکان کا چھانک بھی بہت بڑا تھا جو کھلا ہوا تھا۔ یہ بہت بڑا گیراج تھا جہاں پچھلے ایک پرانی سی کار کھڑی تھی اور آگے سفید رنگ کی مرسڈیز تھی۔ رسول بخش کار صاف کر رہا تھا۔

نایاب نے اس رات دو کاروں چودھری امانت علی کی حویلی میں بھی دیکھی تھیں اور اب ملک صاحب کی یہ مرسڈیز دیکھ کر اسے واقعی حیرت ہوئی تھی۔ زمیندار بھی اب بہت بدل چکے تھے۔ کھیتی باڑی کے لیے جدید مشینیں تو آئی ہی تھیں، انہوں نے زندگی کی دوسری سولوں سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ بجلی نے ان کے لیے بہت سی آسائشیں مہیا کر دی تھیں۔ گاؤں کے گھروں میں بھی فریج اور ٹی وی موجود تھے اور سواری کے لیے شاندار اور قیمتی کاریں۔

نایاب کا خیال تھا کہ رسول بخش ہی ڈرائیونگ بھی کرے گا لیکن زمرس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس نے انجین اشارت کیا اور کار کو گاؤں کی کشادہ گلیوں میں سے نکالتے ہوئے ہائی وے کی طرف جانے والی سڑک پر لے آئی۔

نورپور بہت بڑا قصبہ تھا۔ وہاں اناج کی بہت بڑی منڈی تھی۔ اس کی آبادی تین ہزار سے اوپر ہی رہی ہوگی۔ باہر سے بھی کاروباری لوگ آتے رہتے تھے۔ بازاروں میں خاصی گھمگھمی تھی۔ آس پاس کے دیہاتوں کے لوگ صبح سویرے ہی یہاں آجاتے تھے۔ دن بھر خرید و فروخت میں مصروف رہتے اور پھر شام پانچ بجے کے بعد ان لوگوں کی واپسی شروع ہو جاتی۔

دو تین سڑکوں پر گھومنے کے بعد زمرس نے کار اناج کی آؤحت کی ایک بہت بڑی دکان کے سامنے روک لی۔ وہ تینوں بیٹے اتر آئیں۔ زمرس نے دروازہ لاک کر دیا تھا۔ کار کو دیکھ کر سفید مونچوں والا ایک آدمی دکان سے نکل آیا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی مگر صحت قابل رشک تھی۔

”السلام علیکم فضل چاہا!“ زمرس اور عذرہ نے بیک وقت سلام کیا۔ نایاب نے بھی سلام کیا تھا۔

”جیتی رہو۔“ فضل چاہا نے دعا دی۔ ”نھیک تو ہو تم لوگ۔ ملک صاحب کیسے ہیں؟ بہت دلوں سے ادھر میں آئے؟“

دیکھا کیا تھا۔“ نایاب نے کہا۔

رمضان حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا گیا۔

اس وقت سہ پہر کے پانچ بجے رہے تھے۔ نایاب کچھ چیزیں خریدنے کے بجائے نورپور جانا چاہتی تھی مگر ملک صاحب نے اسے روک دیا۔ نورپور چھ سات میل کے فاصلے پر تھا اور ملک صاحب کا خیال تھا کہ واپسی میں شام ہو جائے گی۔ اس لیے وہ اس وقت نہ جانا بلکہ صبح چلی جائے۔ نایاب نے ضد نہیں کی۔ اگر وہ ملک صاحب کو بتا دیتی کہ وہ نورپور کیوں جانا چاہتی ہے تو شاید وہ اسے صبح جانے سے بھی منع کر دیتے۔

وہ رات نایاب نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ راشدہ اور عبدالغنی کے چہرے بار بار اس کی نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بھرم رہی تھی۔ اس کے خیال میں وہ دونوں اس کی وجہ سے مارے گئے تھے۔ نہ وہ چودھری سعادت کو عبدالغنی کے گھر میں رات گزارنے کا بتائی اور نہ انہیں اس بے دردی سے جلا کر بہت کے کھاٹا اتار جاتا۔ وہ بے گناہ مارے گئے تھے اور نایاب نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کے قاتلوں کا سکھ کا سانس نہیں لینے دے گی۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ ان کی موت میں چودھری سعادت ہی کا ہاتھ ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں سے انہیں مویا کیا تھا۔ ان میں سے ایک اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا، باقی ابھی اس دھرتی پر دندناتے بھر رہے تھے اور ریلوے اسٹیشن کے ہوائنٹن میں سے یہ تعہد بھی ہو سکتی تھی کہ وہ کون لوگ بنے۔

اس کی آنکھ صبح سات بجے کھل گئی۔ اٹھنے کے فوراً ہی بعد نایاب کو پتہ چل گیا کہ زمرس اور عذرہ اس کے ساتھ نورپور جانے کو تیار ہو رہی تھیں۔

”جیس کیسے پتہ چلا کہ میں آج نورپور جانے والی ہوں۔“ نایاب نے عذرہ کو گھورا۔

”ایا جانے نہ بتایا ہے کہ آپ نورپور جا رہی ہیں۔ سوچا کیوں نہ ہم بھی اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔“ عذرہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد آٹھ بجے کے قریب وہ تینوں جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

”رسول بخش نے یکہ تیار نہیں کیا۔ کیسے جائیں گے؟“ نایاب نے پوچھا۔ ”کار پر۔“ زمرس نے جواب دیا۔ ”واپسی پر دوپہر تیز ہو جائے گی اور یکہ پر تو ہمارے دماغ پلپلے ہو جائیں گے۔ آؤ۔۔۔ کار گیراج میں ہے۔“

”میرا تعلق ہے۔“ ثایاب نے کہا۔ ”میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں میرا تیار کے چودھری امانت علی کی بھوتی ہو ہوں۔ سرفراز چودھری میرا شوہر تھا جسے دو سال پہلے گاؤں میں قتل کر دیا گیا تھا۔ میرا چودھری فیملی کے جائیداد کے سلسلے میں کیس چل رہا ہے۔“

”اوہ۔“ انسپکٹر چونک گیا۔

”سرخاڑ چودھری کے قاتلوں کا بھی آج تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ شاید اس لیے کہ صحیح راج پر اور غیر جانبداری سے تحقیق نہیں کی گئی۔ اس کے علاوہ بھی گاؤں میں آئے دن ایسی شکیں وارداتیں ہوتی رہی ہیں جن کے بارے میں اگر غیر جانبداری سے تفتیش کی جاتی تو مجرموں کو گرفت میں لایا جاسکتا تھا۔“

”لی۔ پی۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ تحقیقات میں جانبداری سے کام لیا گیا ہے؟“

انسپکٹر نے اسے گھورا۔

”اس کا ثبوت ہے میرے پاس۔“ ثایاب نے کہا۔ ”لیکن الیہ یہ ہے کہ ہمارے قانون کے محافظوں نے حقائق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس گاؤں کی سختی لڑکیاں ہیں جو ایک مخصوص گروہ کی ہوس کا شکار ہوئیں۔ کئی لڑکیوں نے مزید رسوائی سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی۔ مظلوموں کی نشاندہی بھی کی گئی لیکن پیسے کی چمک نے قانون کے محافظوں کی آنکھوں کو خیر کر دیا اور وہ مظلوموں کو نظر انداز کر کے انہی کو مورد الزام ٹھہراتے رہے جو مظلوم تھے۔“

”آپ تقریر اچھی کر لیتی ہیں۔“ انسپکٹر بولا۔ ”لیکن جوش خطبات میں آپ یہ بھول گئی ہیں کہ قانون کے محافظوں پر بے بنیاد الزام لگا رہی ہیں۔“

”میں اپنے الزامات ثابت کر سکتی ہوں۔“ ثایاب نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولتی چلی گئی۔ اس نے گاؤں میں ہونے والے کئی شکیں واقعات کی تفصیل بیان کر دی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں نے چودھری فیملی پر جائیداد کا کیس کر رکھا ہے اور وہ لوگ مجھے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ اس رات ٹرین لیٹ آئی تھی اور میں اسٹیشن ماسٹر کے گھر رک گئی تھی۔ چودھری سادات کے دو آدمی مجھے حراش کرتے ہوئے رات ساڑھے گیارہ بجے اسٹیشن پہنچے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے شاید ان کی نیت بھانپ لی تھی، اسی لیے اس نے میرے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اگر میں انہیں مل جاتی تو وہ مجھے قتل کر دیتے۔“

”گاؤں میں ہی کچھ مصروفیت ہے۔ ایک دو دن بعد آئیں گے۔“ زمرس نے جواب دیا۔ ”یہ ہماری کرن ہیں ثایاب بلکہ صحیح تعارف تو یہ ہے کہ چودھری انگل کی بھوتی ہو ہیں۔ آج کل گاؤں آئی ہوئی ہیں اور ہمارے پاس ٹھہری ہوئی ہیں۔“

”اوہ۔“ فضل چاچا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہم شاپنگ کرنے آئی ہیں۔ گاڑی بیس چھوڑ کر جا رہی ہیں۔“ زمرس نے کہا۔

”کوئی بات نہیں چڑ۔“ فضل چاچا نے جواب دیا۔

ثایاب نے عموں سے کہا تھا کہ فضل چاچا بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ تینوں مختلف دکانوں میں گھومتی رہیں اور پھر ثایاب اس طرح ٹھک کر رک گئی جیسے کوئی خاص بات یاد آگئی ہو۔

”تم لوگ چلو۔ میں نے ایک دکان پر اپنے ایک جانے والے کو دیکھا تھا۔ میں اس سے مل کر آئی ہوں۔ میری فکر مت کرنا۔ میں فضل چاچا کی دکان پر پہنچ جاؤں گی۔“ ثایاب نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ایک طرف مڑ گئی۔

وہ لوگوں سے پوچھتی ہوئی تقریباً پندرہ منٹ بعد تھانے پہنچ گئے۔ اتفاق سے اس وقت ایس ایچ او موجود تھا لیکن کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

”میں آپ سے ایک اہم معاملے پر بات کرنا چاہتی ہوں۔ صرف چند منٹ۔“ ثایاب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”میں اس وقت جلدی میں ہوں لیکن بہر حال، بیٹھے۔ آپ کے لیے چند منٹ تو نکال ہی سکتا ہوں۔“ ایس ایچ او دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میں چار دن پہلے میرا آباد کے اسٹیشن ماسٹر اور اس کی مظلوم بیوی کو ان کے گھر میں زندہ جلا دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں آپ کی تحقیقات کہاں تک پہنچی ہیں؟“ ثایاب نے اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھنے ہوئے پوچھا۔

ایس ایچ او نے گھور کر اس کی طرف دیکھا، پھر گھبراہٹ سے لپٹے ہوئے بولا۔

”آپ تک کی ہماری تفتیش یہ ہے کہ وہ آتش زنی کسی پرانی دھمکی کا نتیجہ تھی۔ ایسے کیسز چنگی بھاتے میں تو مل نہیں ہوتے لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ اس معاملے سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“

"لیکن اس نے ہمیں تو گھوڑے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔" انیسٹر بولا۔
 "اس سے اس قسم کی کوئی بات نہیں ہو چکی تھی۔" غایب نے کہا۔ "آپ وہیام
 اس کا بیان لیں تو وہ آپ کو سب کچھ بتا دے گا۔"
 "مجھے افسوس ہے بی بی۔" انیسٹر نے کہا۔ "اب ہم انیشین کے اس ہوائنٹس میں کا
 بیان نہیں لے سکتے۔"
 "کیوں؟" غایب نے اسے گھورا۔
 "آج صبح سویرے کسی نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔" انیسٹر نے جواب دیا۔
 "ہمیں ایک مختصر پہلے اطلاع ملی تھی۔ میرے دو آدمی وہاں جا چکے ہیں اور اب میں بھی
 وہاں جانے والا تھا۔"
 غایب سائلے میں اپنی تھی۔

پانچویں قسم

"یہ..... یہ کب کی بات ہے؟" وہ ہلکا کر رہ گئی۔
 "آج صبح چھ بجے کی۔" انیسٹر نے جواب دیا۔ "اس کی بیوی کے بیان کے مطابق وہ
 انیشین پر جانے کے لیے عام طور پر صبح ساڑھے چھ بجے گھر سے نکلتا تھا لیکن آج صبح چھ
 بجے کسی نے اسے آواز دی۔ وہ سمجھا کہ شاید انیشین ہاؤس کے آواز دی ہے، وہ اس وقت
 ناشتہ کر رہا تھا، اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے دو منٹ بعد گولیاں چلنے اور چیخنے کی آواز سنائی
 دی۔ اس کی بیوی دوڑ کر باہر آئی تو اس کا شوہر خون میں لٹ پٹ دروازے کے سامنے
 زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سر اور سینے میں گولیاں گئی تھیں۔ اس کی بیوی مدد کے لیے چیخنے
 لگی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ سوائے اس انیشین ہاؤس کے جو اپنے دفتر
 میں سو رہا تھا۔ گولیوں کی آواز سن کر وہ جاگا تھا اور پھر ہوائنٹس میں کی بیوی کے چیخنے کی
 آوازیں سن کر باہر آیا تو اس وقت تک ہوائنٹس میں ختم ہو چکا تھا۔
 انیشین اس وقت سسٹن پڑا تھا۔ پٹی ٹرین صبح آٹھ بجے آتی ہے اور جن لوگوں نے
 اس ٹرین پر جانا ہوتا ہے، وہ ساڑھے سات بجے کے گنگ ہنگ وہاں پہنچنا شروع ہوتے ہیں
 لیکن سوا سات بجے کے قریب علی پور کا ایک آدمی سائیکل پر وہاں پہنچ گیا۔ اس کا کوئی رشتہ

دوسرے دن جب چودھری سعادت کو پتہ چلا کہ اس رات میں انیشین ہاؤس کے گھر کی
 تھی تو اسی رات اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے انیشین ہاؤس کے گاڑ کو آگ لگا کر
 دونوں میاں بیوی کو زندہ جلا دیا۔ اگر آپ پانچ سال پہلے اس قتلے میں تھے تو آپ کو
 بھی معلوم ہو گا کہ چودھری سعادت نے انیشین ہاؤس والی کی بیوی راشدہ کے سا
 دست درازی کی کو شش کی تھی۔ اس کی مزاحمت پر چودھری نے اسے اٹھا کر کولتے ہو
 کرھاؤ میں پھینک دیا تھا۔ وہ بیچ تو گئی تھی لیکن اس کی حالت مرووں سے بدتر تھی
 چودھری کو اس بات کا فائدہ تھا کہ انیشین ہاؤس نے اس رات مجھے اپنے گھر میں پناہ کیوں
 تھی۔

دوسرے روز چودھری کے ایک گھر کے عید الرحمن نے کھیتوں میں مجھ پر چاقو سے
 کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے سانپ نے ڈس لیا اور یہی وہ شخص تھا جس نے آ
 رات پہلے انیشین ہاؤس کے گھر کو آگ لگا کر ان دونوں میاں بیوی کو زندہ جلا دیا تھا۔ میر
 پاس اس کا ثبوت موجود ہے۔"

انیسٹر خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل
 تھے۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا تھا کہ یہ لڑکی جوش رقابت میں الزامات عاید کر رہی ہے؟
 غایب کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی معلومات غامضی وسیع ہیں۔

"کیسا ثبوت؟" اس نے پوچھا۔

"میرے پاس ایک ایسا آدمی موجود ہے جس نے ڈھانڈ بندھا ہوا ہونے کے باوجود
 رات عید الرحمن کو پھانسی دیا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار تھا جس کی دائیں ٹانگ پر
 سے اوپر اور ایال کے بال کاٹے گئے۔ وہ گھوڑا اب بھی چودھری کے طویلے میں سو
 ہے۔" غایب نے کہا۔

"اور وہ آدمی کون ہے؟" انیسٹر بولا۔ "اگر ایسا کوئی گواہ موجود ہے تو ہم اس کی گواہی
 کی روایتی میں از سر نو تفتیش کرنے کو تیار ہیں۔"

"انیشین کا ہوائنٹس میں۔" غایب نے جواب دیا۔ "وہ اس رات دفتر میں سو رہا
 آگ لگانے سے پہلے ان لوگوں نے دفتر کے دروازے کو باہر سے کھڑا لگا دیا تھا۔ اس
 کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔"

انہی کے لئے اسے گھورا۔

”میں کل یہاں آنا چاہتی تھی مگر ملک صاحب نے مجھے نہیں آنے دیا۔ اگر میں انہیں یہاں آنے کی وجہ بتا دیتی تو مجھے نہ روکتے۔“ ثیاب نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے بی بی۔“ انہی کے ہونے کر سی سے اٹھ گیا۔ ”میں آپ کی بتائی ہوئی باتوں کو ذہن میں رکھوں گا لیکن آپ بھی ایک بات کا خیال رکھئے۔ مجھے کسی حد تک آپ کے اور چودھری فیملی کے تنازعات کا علم ہے۔ آپ لوگوں کے مابین متدے ہلائی بھی ہو رہی ہے۔ اس قسم کی باتیں آپ کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہیں۔ وہ لوگ آپ کے خلاف کسی قسم کی کارروائی بھی کر سکتے ہیں۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ ثیاب نے بھی کر سی پھوڑ دی۔ ”ویسے میرے خلاف بہت کچھ ہو رہا ہے۔ جس رات میں یہاں آئی تھی، اسی رات مجھے تلاش کیا جا رہا تھا۔ وہ تو انہیں ماسٹر عبدالغنی کی گھنڈی تھی جس سے میں تو بچ چکی لیکن اس کی پاداش میں ان دونوں میاں بیوی کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھوئے پڑے۔ پھر عبدالرحمن نے مجھ پر چاقو سے حملہ کرنے کی کوشش کی مگر اسے سانپ نے ڈس لیا۔ اس کے بعد بھی مجھے دھمکیاں مل رہی ہیں کہ میں یہ گاؤں چھوڑ کر چلی جاؤں لیکن میں بیدل نہیں ہوں۔“

”کیا آپ ان دھمکیوں کے حوالے سے کوئی رپورٹ درج کرانا چاہتی ہیں؟“ انہی کے پوچھا۔

”نہیں۔“ ثیاب نے سگراتے ہوئے غمی میں سر ہلا دیا۔ ”لیکن میں ایک دو دوڑ میں اعلیٰ حکام کو یہ درخواست دینے والی ہوں کہ میرے شوہر کے قتل کی تفتیش از سر نو کی جائے۔ بہر حال شکریہ۔ میں نے آپ کا وقت لیا، اس کے لیے بھی معذرت۔“

”کوئی بات نہیں۔ ہم تو خدمت گار ہیں۔ ہمارا وقت آپ ہی لوگوں کے لیے ہے۔“ انہی کے جواب دیا۔

ثیاب تھکتے سے باہر آگئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ فضل چاچا کی دکان پر پہنچ گئی۔ نرمس اور عطرہ ابھی تک نہیں پہنچی تھیں۔ وہ پھر بازار میں آگئی اور اتفاق سے وہ دونوں جلد ہی اسے مل گئیں اور وہ تینوں مختلف دکانوں پر گھوم پھر کر شاپنگ کرنے لگیں۔ جب وہ واپسی کے لیے روانہ ہوئیں تو دو دن سے بچے اور جب گاؤں کی حدود میں

دار آٹھ بجے کی ٹرین سے آنے والا تھا۔ انہیں باہر نے اسے اطلاع دینے کیلئے یہاں پہنچ دیا۔ انہیں باہر نے یہ رتھ بھیجا تھا جس میں اس نے لگھا ہے کہ کسی ماسٹرم غصے نے انہیں کے ہوائنٹس میں عبدالرشید کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ یہ دیکھتے اس کا رتھ میرے پاس موجود ہے۔“ اس نے میز پر بچہ دھک کے بیٹے رکھا ہوا ایک کانڈ اٹھا کر اس کو طرف پھینکا دیا۔

”انہی صاحب!“ ثیاب نے اس کانڈ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد کہا۔ ”ہوائنٹس میں عبدالرشید کے قتل میں بھی چودھری سعادت کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”دیکھیں بی بی!“ انہی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”یہ معاملہ ایک قتل کا ہے۔ کسی کو شبہ میں پکڑنے سے پہلے بھی ہم دم دلوں سوچتے ہیں اور پھر آپ جس شخص پر الزام لگا رہی ہیں، وہ اس علاقے کا محرز زمیندار ہے۔ اگر یہ الزام مجھ ثابت ہوا تو اس کی طرف سے رد عمل آپ کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور علاوہ اطلاع دینے پر آپ کے خلاف قانونی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے آپ جو بھی کرنا چاہتی ہیں، سوچ سمجھ کر کریں۔“

”میں بہت سوچ سمجھ کر بات کر رہی ہوں۔“ ثیاب نے کہا۔ ”ہات دراصل یہ ہے کہ کل میں انہیں پر کئی تھی اور یہ ساری تفصیل مجھے ہوائنٹس میں عبدالرشید نے ہی بتا دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ گھڑ سوار کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا لیکن شطوں کی روشنی میں اس نے گھوڑے کو دیکھا تھا۔ اس نے گھوڑے کی جو نشانیاں بتائی، میں نے اسے چیک کیا۔ کمر شام پانچ بجے کے قریب وہ گھوڑا میں نے چودھری کے ایک ملازم رمضان کے پاس دیکھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ گھوڑا عبدالرحمن کا تھا۔ میں نے اس سے چند سوال بھی کیے تھے۔ اس نے وہ باتیں چودھری سعادت کو بتائی ہوں گی اور چودھری سعادت خود حال سمجھ گیا۔ اس نے ہوائنٹس میں عبدالرشید کو مروا دیا کہ نہ وہ زعمہ رہے گا اور نہ پولیس کوئی بیان دے گا۔ وہ گھوڑا ابھی چودھری سعادت کے طوطے میں موجود ہے۔ اگر آپ اپنی تفتیش میں اس بات کو مد نظر رکھیں تو عبدالرشید کے قاتل تک پہنچنا آپ کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔“

”اگر یہ بات آپ کو کل ہی معلوم ہو گئی تھی تو آپ نے کل اطلاع کیوں نہیں دی؟

کھانے کے قہوڑی دیر بعد ہی ٹایاب سو گئی۔ تقریباً چوبیس کے قریب عذرہ نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

”کیا بات ہے؟“ ٹایاب بڑبڑا کر اٹھ گئی۔ ”سپیرے آگئے کیا؟“

”سپیرے نہیں ٹایاب بائی۔ شرے ایک آدمی آیا ہے۔ الطاف نام ہے اس کا۔ کتا ہے انکل ارشارہ نے بھیجا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ عذرہ نے کہا۔

”الطاف۔“ ٹایاب اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ الطاف کون ہو سکتا ہے۔ اس کے داغ میں تیز سنناٹ ہو رہی تھی اور اس وقت کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سر کو دو تین جھٹکے دیئے اور عذرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”توکن ہے الطاف، کہاں سے آیا ہے؟“

”شرے آیا ہے۔ آپ کے ڈیڑی نے اسے بھیجا ہے۔“ عذرہ نے جواب دیا۔

”اوہ۔“ ٹایاب کے داغ کو جھٹکا سا لگا۔ اب اس کا ذہن کچھ کام کرنے لگا تھا۔ الطاف اس کے والد کا گھریلو ملازم تھا۔ ”اسے بٹھاؤ۔ میں منہ ہاتھ دھو کر آ رہی ہوں۔“ وہ بیڑ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

”میں نے اسے جھٹک میں بٹھا دیا ہے۔“ عذرہ نے کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

”اور آپ یہ کیوں پوچھ رہی تھیں کہ سپیرے آگئے کیا؟“

”کچھ نہیں۔ شاید میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ وہ کمرے سے نکل کر غسل خانے میں آ گئی۔ منہ پر لٹھڑے پانی کے چھینٹوں سے اس کے حواس کچھ بحال ہوئے اور وہ سوچنے لگی کہ ڈیڑی نے الطاف کو کیوں بھیجا ہے۔ بھر یہ سوچ کر سر جھٹک دیا کہ خیریت معلوم کرنے کو بھیجا ہو گا۔ وہ صرف دو دن کا کمرہ کر آئی تھی اور اب کئی دن ہو گئے تھے اور اس نے کوئی اطلاع بھی نہیں بھجوائی تھی۔

سورج غروب ہونے والا تھا۔ آسمان پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کمرے میں آکر بال درست کیے اور بیٹھک میں چلی آئی۔ الطاف اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اٹھ گیا۔ الطاف تقریباً بیٹھائیس سال کی عمر کا قدرے بھاری بھر کم آدمی تھا۔ کپڑے سفید تھے اور سر کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ گزشتہ پندرہ سولہ سال سے ان کے ہاں ملازم تھا۔ گھر کے زیادہ کام کاج اسی نے سنبھال رکھے تھے۔

داخل ہوئیں تو دھائی بج چکے تھے۔ گاؤں کے باہر میدان میں بہت سے لوگوں کو جمع دیکھ کر وہ تینوں چوک گئیں۔ نرمس نے گاڑی روک لی اور ایک آدمی کو قریب بلا کر پوچھا۔

”رہے چاہا۔ کیا بات ہے؟ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں؟“

”بی بی بی۔ کیتھن میں وہ زہریلا سانپ ہے نا جس نے کل میدانِ وطن کو ڈس لیا تھا۔ اس لیے کوئی بھی کیتھن میں جانے کو تیار نہیں ہے۔ سب لوگ صبح سے یہاں جمع ہیں۔ جب تک اس خطرناک سانپ کو پکڑنے کا بندوبست نہیں ہوتا، کوئی بھی کام پر نہیں جائے گا۔“ دے چاہا نے بتایا۔

”اوہ۔ میں کبھی حتی کچھ اور ہو گیا ہے۔“ نرمس نے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھ دی۔

ملک صاحب گھر پر ہی تھے۔ ان کی اور چودھروں کی زمینیں ملی ہوئی تھی، اس لیے اس کے کارندے بھی کیتھن پر نہیں گئے تھے۔ کچھ دیر بعد سکندر بھی آ گیا۔

”چودھری سادات دو آدمیوں کو لے کر سپیروں کی ہمتی لے گا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس سپیرے مان گئے تو ان کے ذریعے سانپ کو پکڑنے کی کوشش کی جائے گی۔“

ٹایاب اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کے پیچھے ہی نرمس چلی آئی۔

”اس سانپ نے ہمیں بچایا تھا۔ اگر وہ پکڑا گیا تو کیا ہو گا؟“ نرمس نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ میرا کوئی رشتہ دار تو ہے نہیں جو مجھے اس کی فکر ہو۔“ ٹایاب بولی۔

”اس نے ہمارے کان میں سرگوشی کی تھی کہ وہ ہماری حفاظت کرے گا۔“ نرمس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اگر وہ پکڑا گیا تو۔۔۔“

”ختم کر دے یا نہیں۔“ ٹایاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔“

”اوہ۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ ہم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ بھوک تو آگئی ہے۔“ نرمس نے کہا۔

”بھائی نے کھانا تو پکا رکھا ہو گا۔ میں ابھی دیکھتی ہوں۔“ نرمس نے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

اور پھر آگے گئے بعد وہ تینوں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔

”حالا کہ ایسی صورت میں پولیس کو سب سے پہلے اسی پر شبہ ظاہر کرنا چاہئے تھا۔“

”شکورا ایسا نہیں کر سکتا جی! آپ جانتی ہیں کہ وہ بچپن ہی سے آپ کے گھر کی خدمت کرتا رہا ہے۔ اسے تو آپ کے ہاں رہتے ہوئے میں بائیس سال ہو چکے ہیں جی! آپ کی تو ساری زندگی اس کے ساتھ گزری ہے۔ آپ اسے اچھی طرح جانتی ہیں جی! اس نے تو گھر میں کبھی ایک پیسہ کا نقصان نہیں کیا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا جی!“

”میں یہ نہیں کہہ رہی کہ آگ اس نے لگائی ہوگی۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”لیکن اسکے غائب ہو جانے سے پولیس کو سب سے پہلا شبہ اسی پر ہونا چاہئے تھا یا پھر یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ.....“ وہ بات کرتے کرتے رک گئی، پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں کل تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

ٹایاب کافی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی، پھر اٹھ کر باہر آگئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سیکندہ سمجھ گئی کہ کوئی گزیر ضرور ہے۔

”کیا بات ہے ٹایاب؟ گھر میں خیریت تو ہے نا؟“ سیکندہ نے پوچھا۔

”کل بچلے کو کسی نے آگ لگا دی۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔

”ہائے اللہ۔“ سیکندہ ہاتھ ملے لگی۔ ”کس نے لگائی آگنی؟ کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں بھائی۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”پولیس کا کہنا ہے کہ آگ اتفاقاً طور پر لگی تھی جبکہ پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ جب آگ لگی تو انہوں نے پڑول کی بو محسوس کی تھی۔ ہمارا وہ ملازم بھی لاپتہ ہے جسے بچلے کی دیکھ بھال کے لیے وہاں رکھا تھا۔“

”کس ایسا تو نہیں کہ وہی آگ لگا کر بھاگ گیا ہو؟“ سیکندہ بولی۔

”نہیں بھائی..... شکر بچپن سے ہمارے گھر پر پلا بڑھا ہے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ بہر حال، یہ تو وہیں جا کر پتہ چلے گا کہ اصل صورتحال کیا ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ زمر اور عذہ بھی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ بچلے میں اشتہاد کی کاسن کر وہ بھی تسمف کا اظہار کرنے لگیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ملک صاحب اور سکندر بھی آگئے۔ انہیں اس سانحے کا پتہ چلا تو وہ بھی افسوس کا اظہار کرتے گئے۔

”خیریت الخاف، کیسے آئے؟“ ٹایاب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”بس پر آیا ہوں جی..... بڑا لمبا سفر ہے جی۔“ الخاف نے جواب دیا۔

ٹایاب اس کی سلامتی پر دل ہی دل میں مسکرا دی۔

”نیسو..... ڈیڈی کیسے ہیں؟“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”صاحب تو ٹھیک ہیں جی پر.....“

”کیا ہوا..... خیریت تو ہے نا؟“ ٹایاب اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ جی..... کل صبح آپ کے بچلے کو آگ لگ گئی تھی۔ پورا بچلہ جل کر راکھ ہو گیا جی۔“ الخاف نے کہا۔

”وہ.....“ ٹایاب اچھل پڑی۔ ”کیسے لگی آگ؟“

”پتہ نہیں جی۔“ الخاف نے جواب دیا۔ ”کل صبح چار بجے اچانک ہی آگ بڑھ اٹھی تھی۔ پولیس والے کہتے ہیں کہ آگ بجلی کے شارٹ سرکٹ سے لگی تھی مگر پڑوس کا کہنا ہے کہ آگ اتفاق سے نہیں لگی بلکہ لگائی گئی تھی۔ پڑوسیوں نے پڑول کی بو محسوس کی تھی۔ صاحب نے پولیس میں رپورٹ لکھوا دی ہے اور آپ کو فوراً بلوایا ہے۔ صا آپ کی طرف سے بھی پریشان ہیں۔ آپ نے بھی اپنے بارے میں کوئی اطلاع بھجوائی۔“

”مجھے اطلاع بھجوانے کا موقع نہیں ملا۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”شکور کہاں تھا۔ ا۔ میں بچلے کی دیکھ بھال کے لیے کہہ کر آئی تھی۔“

”شور اس روز رات کا کہنا تھا کہ بچلے پر چلا گیا تھا لیکن پھر پتہ نہیں کہاں چلا پڑوس والے بچلے کے ملازم نے بتایا تھا کہ شکر رات گیارہ بجے تک بچلے کے گیٹ پر اس سے باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ اندر چلا گیا تھا اور گیٹ وغیرہ بھی بند کر لیا تھا لیکن اس بعد پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔“

”وہ آگ میں گھر کر جل تو نہیں گیا؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”نہیں جی۔“ الخاف نے جواب دیا۔ ”پولیس اور فائر بریگیڈ والوں نے لمبے میں طرح دیکھا تھا۔ اس کی لاش بھی نہیں ملی۔“

”بچلے کا ملازم لاپتہ ہے اور پولیس کہتی ہے کہ آگ اتفاقاً لگی ہے۔“ ٹایاب بڑ

کر فیصلہ ان کے حق میں نہیں ہوگا۔ اسی لیے چودھری سعادت اوجھی حرکتوں پر اتر آیا تھا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے ٹایپ کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ ملک صاحب اور سکندر صبح چھ بجے جب کیمڑوں پر گئے تو ٹایپ اس وقت بھی جاگ رہی تھی۔

صبح سات بجے کے قریب زمرس اور عذرہ بھی اٹھ کر کمرے سے چلی گئی تھیں۔ ٹایپ بھی اس وقت اٹھنا چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے رات ہی کو بتا دیا تھا کہ آج وہ شردا واپس چلی جائے گی اور وہ اٹھ کر تیار ہونے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ آٹھ لگ گئی۔

اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے فضا میں بین کی آواز گونج رہی ہو۔ وہ شاید کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ بین کی آوازیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی یہ آوازیں تیز ہو جاتیں اور کبھی بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتیں۔

اور پھر ٹایپ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ چند منٹ کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ رات بھر جاگتے رہنے سے اس کے داغ میں سنناٹا ہو رہی تھی۔ اس نے سر کو ایک دو جھٹکے دیئے۔ بین کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے بیک وقت بہت سی بینیں جگ رہی ہوں اور پھر دفعتاً وہ اچھل پڑی۔

رات کو سکندر نے بتایا تھا کہ چودھری سعادت سپیروں کی بہتی میں بات کر کے آیا تھا اور سپیرے اس خطرناک سانپ کو بچرنے کے لیے صبح ہی بچھ جاتیں گے۔

ٹایپ ایک جھٹکے بچھنے سے اتر آئی۔ اس نے چپل پہنی اور کمرے سے باہر آئی۔ برآمدے میں رک روہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بین کی آوازیں اب واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

زمرس اس وقت باہر پہی خانے میں تھی۔ وہ باہر نکلی تو ٹایپ اس کی طرف توجہ دینے بغیر چوہلی کے پھاٹک کی طرف چلے گئی۔ زمرس نے اسے آواز بھی دی مگر ٹایپ نے مڑ کر نہیں دیکھا اور پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

وہ گلیوں میں تیز تیز چلتی ہوئی گاؤں سے باہر آئی۔ میدان میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ بچے بھی تھے اور ایک طرف عورتیں بھی کھڑی تھیں۔ بعض مکانوں کی چھتوں پر بھی

الطاف کے لیے ساتھ والے مکان میں شب بھری کا بندوبست کر دیا گیا۔ رات کا کھانا کھا کر وہ تو سونے کے لیے اس مکان میں چلا گیا۔ ٹایپ وغیرہ ملک صاحب والے کمرے میں بیٹھے رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔

ٹایپ کو یقین تھا کہ اس کے بچنے کو آگ کا قاعدہ منصوبے کے تحت لگائی گئی تھی اور اس میں یقیناً چودھریوں کا ہاتھ تھا۔ چودھری سعادت اس سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ ایک تو ان میں جانبداروں کے لیے مقدمہ چل رہا تھا اور دوسرے وہ کئی روز سے یہاں آئی ہوئی تھی اور بقتل فتنے سعادت کے بننے پر مونگ دل رہی تھی۔ اس نے یہاں بھی ٹایپ کے خلاف ایک دو انتقامی کارروائیاں کی تھیں مگر اسے ناکامی ہی کا منہ دیکنا پڑا تھا۔ یہاں اس کا بس نہیں چلا تھا تو اس نے شردا کے بچنے کو آگ لگا دی۔ شردیں بھی اس کے آوی موجود تھے۔ اس مقدمے کے لیے کسی کو یہاں سے بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ بہر حال اصل صورتحال کا علم تو شردی بچ کر ہی ہوتا۔

ملک صاحب اور سکندر کا بھی یہی خیال تھا کہ بچنے کو آگ جلان بوجھ کر لگائی گئی تھی اور اس میں چودھری سعادت کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

رات بارہ بجے کے قریب ٹایپ عذرہ اور زمرس کے ساتھ اپنے کمرے میں آگئی وہ دونوں بینیں تو تھوڑی دیر بعد سو گئیں مگر ٹایپ جاگتی رہی۔ کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ بار بار سعادت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ٹایپ کو ابھی طرح معلوم تھا کہ اس کی شادی سے لے کر اب تک سعادت کا کردار مفلکی رہا تھا۔ اس نے شادی کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی اور شادی کے بعد بھی وہی سب سے زیادہ مخالفت کرتا رہا تھا۔ گو کہ چودھری امانت علی بھی شروع ہی سے شادی کی مخالفت کرتا رہا تھا۔ البتہ ایک دو مواقع ایسے آئے تھے جب اندازہ ہوا تھا کہ وہ بیٹے کی خوشی کی خاطر اس شادی کو قبول کر لے گا مگر یہ چودھری سعادت ہی تھا جس نے ہر موقع پر ماں باپ کو چھوٹے بھائی کے خلاف بھڑکایا تھا اور ان کے دلوں میں ٹایپ کے لیے بھی نفرت پیدا کی تھی۔ اس جیسے شخص سے کبھی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

ٹایپ وہ جھگڑا قانونی طور پر اپنے نام منتقل کروا چکی تھی جس کا ان لوگوں کو بہت دکھ ہوا تھا۔ عدالت میں چلنے والے مقدمے کی صورتحال کا بھی انہیں کچھ کچھ اندازہ ہو چکا تھا

عورتیں نظر آ رہی تھیں۔

ٹایاب ادھر ادھر دیکھے بغیر چلتی رہی۔ میدان میں سے گزر کر وہ جیسے ہی آگے بڑھا ایک دو آدمیوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

”جھوٹی بی بی! آگے مت جائیے۔ پیڑے اس خطرناک سانپ کو پکڑنے کی کوشش رہے ہیں جس کے کانٹے سے انسان کی لاش بھی جل کر راکھ بن جاتی ہے۔“

مگر ٹایاب نے کسی کی بات پر توجہ نہیں دی۔ وہ اس طرح چل رہی تھی جیسے کوہِ اسرارِ قوت اسے کشاں کشاں لے جا رہی ہو۔ ایک درخت کے نیچے چارپائی پر چودھ سعادت بھی اپنے تین ہمار آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کے پاس دو بندوق بھی تھیں۔ انہوں نے ٹایاب کی طرف دیکھا مگر کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

پندرہ میں سہیرے تھے جو کھنڈروں پر گھومتے ہوئے بین بجا رہے تھے۔ طرف بین کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ٹایاب کھیت کے کنارے پر پہنچی ہی تھی کہ ملا سکندر ایک طرف سے دوڑتا ہوا آیا اور اس نے ٹایاب کا بازو پکڑ لیا۔

”پگل ہو گئی ہو۔“ وہ اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”دیکھ نہیں رہیں سہیرے بین جا رہے ہیں۔ میاں ایک نہیں کئی سانپ نکل آئیں گے اور وہ سانپ ہم انہیں کھیتوں میں موجود ہے جس نے عبدالرحمن کو کاٹا تھا۔ تم اس طرف کیوں آئی ہو واپس چلو۔“

ٹایاب نے گردن گھما کر سکندر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چمڑا لیا اور آگے چلے گئی۔ سکندر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ٹایاب! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ واپس چلو میاں سے۔“ ٹایاب نے امر مرتبہ پھر جھٹکے دے کر اپنا ہاتھ چمڑا لیا اور کھیت میں گھس کر گھنڈنڈی پر دوڑنے لگی۔ سکندر چند لمحوں پہنچ گیا مگر حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

ٹایاب کھیتوں میں دوڑتی رہی۔ سکندر اس سے کئی گز پیچھے رہ گیا۔ وہ دوڑتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا جو وہ اس طرح کھیتوں میں دوڑی جا رہا

ہے۔ کھیتوں کے باہر میدان میں کھڑے ہوئے لوگ بھی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بھی بہت سے یہی سوچ رہے تھے کہ شاید جھوٹی بی بی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

ٹایاب دوڑتی ہوئی اس جھوٹی سی ندی کے کنارے پر پہنچ گئی جس کے دوسری طرف ملک صلاح الدین کی اراضی شروع ہو جاتی تھی اور ایک کھیت کے برابر گلر زوہ خجراور دریاں جگہ جگہ تھی جہاں اس روز اس نے سنری سانپ کو نونولے سے پچایا تھا۔

اس خجری کھیت میں تین پیڑے مختلف جگہوں پر کھڑے بین بجا رہے تھے۔ ان تینوں کی نظریں ایک ہی جگہ مرکوز تھیں۔ ایک پیڑے نے ٹایاب کو اس طرف آتے ہوئے دیکھ لیا۔ ٹایاب ندی کے دوسری طرف تھی۔ وہ ندی میں اتر کر اس طرف آنے لگی تو وہ سہیرا بین منہ سے ہٹا کر چیخا۔

”بی بی آگے مت آنا۔ پراں رہو۔ یہی وہ خطرناک سانپ ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔“

ٹایاب اس کے چیخنے کی پروا کیے بغیر ندی میں سے نکل کر آگے بڑھتی رہی۔ اس دوران سکندر بھی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے چھلانگ لگا کر ندی پار کی اور پھر اس طرح رک گیا جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہو۔

اس پھولے سے بھر میدان کے وسط میں سنری سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا ہن پھیلا ہوا تھا اور وہ اس طرح جھوم رہا تھا جیسے نشے میں ہو۔ دوسرے دونوں پیڑے مسلسل بین بجا رہے تھے۔ تیسرا سہیرا اب بھی پیچھے چکر ٹایاب کو دور رہنے کو کہہ رہا تھا۔ سکندر نے دوڑ کر ٹایاب کو پکڑنا چاہا مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گئی اور پھر جو کچھ بھی ہوا، وہ سکندر اور ان تینوں پیڑوں کے لیے حیرت انگیز تھا۔

ٹایاب نے آگے بڑھ کر خونخوار نظروں سے پیڑوں کی طرف دیکھا اور پھر جھٹک کر دونوں ہاتھوں سے اس سنری سانپ کو اٹھا لیا۔ سانپ کے منہ سے پھنکار سی نکلی اور وہ ٹایاب کے بازو سے پلٹتا چلا گیا۔

سہیرے بین بجاتا بھول گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ٹایاب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سکندر پر بھی سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی اور پھر ایک دم جیسے وہ ہوش میں آ گیا۔

”لیکن سانب نے اس لڑکی کو کاٹا کیوں نہیں؟“ چودھری سعادت دھاڑا۔

"کیا کہہ رہے ہو سکندر!" ملک صاحب کے لیے میں حیرت تھی۔
 "میں سچ کہہ رہا ہوں اباجی۔" سکندر نے جواب دیا۔ "میں ٹایاب کا پیچھا کرتا ہوں اس طرف آیا ہوں۔ پتہ نہیں وہ کہاں غائب ہو گئی۔"
 "جاؤ جیٹا اسے تلاش کرو۔ کوئی حادثہ نہ پیش آجائے اسے۔ اوئے رسول بخش۔ تم بھی جاؤ ڈھونڈو اسے۔" ملک صاحب نے کہا۔

رسول بخش اپنا کام چھوڑ کر اٹھ گیا۔ سکندر نے اسے بائیں طرف بھیج دیا اور خود باغ کے اوپر سے گھومتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ وہ ٹایاب کو آوازیں بھی دے رہا تھا مگر کسی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ سکندر پیسے میں شرابور ہو رہا تھا۔ وہ ٹائیپ کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ ٹایاب کہاں غائب ہو گئی۔ وہ موت کو ساتھ لے کر بھاگی تھی۔ اگر اس سانپ نے راستے میں کہیں اسے ڈس لیا تھا تو اس کی لاش کھیتوں میں کہیں پڑی ہوگی اور لاش کا پتہ اس وقت تک نہیں لگے گا جب تک فصلیں نہیں کٹیں گی اور فصلیں تیار ہونے میں ابھی دو سینیے باقی تھے۔

سکندر تقریباً دس منٹ تک وہاں بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر اس نے دوبارہ تلاش شروع کر دی۔ اس مرتبہ تھوڑی ہی دیر بعد اسے دو تین اور آدمی نظر آئے۔ وہ بھی ٹایاب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

"کچھ پتہ چلا ملک جی چھوٹی بی بی کا؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

"نہیں یار۔" ملک سکندر کے لیے میں یاپی تھی۔ "پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے۔"

"رب نہ کرے اسے سانپ نے کاٹ نہ لیا ہو۔" اس شخص نے کہا۔

"وہ جی چودھری کہہ رہا تھا کہ چھوٹی بی بی بھی ناگن تھی جو انسان کے روپ میں آئی ہوئی تھی اور وہ اپنے عاشق کو لے کر کھیتوں میں غائب ہو گئی ہے۔" ایک آدمی نے کہا۔

"چودھری کی تو غیرت مر گئی ہے۔" ملک سکندر نے جواب دیا۔ "اپنے ہی گھر کی عزت کو یوں رول رہا ہے۔"

لوگ آہستہ آہستہ کھیتوں میں پھیلنے جا رہے تھے۔ بعض لوگ تو بہت دور نکل گئے تھے لیکن ٹایاب نہ تو کہیں زندہ نظر آئی تھی اور نہ ہی کہیں اس کی لاش لی تھی۔ وہ سنرا سانپ بھی کسی کو دکھائی نہیں دیا تھا۔

ملک سکندر کے دماغ میں آنکھیاں سی چلی رہی تھیں۔ اس نے ٹایاب کو وہ خطرناک زہریلا سانپ اس طرح دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے دیکھا تھا جسے کوئی ماں اپنے بچے کو اٹھا کر گود میں سکیٹی ہے اور پھر وہ سانپ ہل کھاتا ہوا اس کے بازو پر پلٹ گیا تھا۔ سکندر نے سچ کر اسے سانپ پھینک دینے کو کہا تھا مگر ٹایاب کھیتوں میں ایک طرف دوڑتی چلی گئی تھی۔ سکندر نے اس کے پیچھے بھاگنا چاہا تھا مگر وہ اپنی جگہ سے ایک اچھ بھی نہیں ہل سکا تھا۔ لگا تھا جیسے زمین نے اس کے زیر پکڑ لیے ہوں۔ وہ اپنی جگہ پر بے حس و حرکت اور ہسوت سا کھڑا ٹایاب کو کھیتوں میں دوڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور جب وہ کیڑو والے باغ کے قریب پہنچ کر لگا ہوں سے اوچھل ہو گئی تو سکندر کو بھی جیسے ہوش آ گیا۔ وہ تینوں سیڑیے اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔

سکندر نے سیڑیوں کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے اسی طرف دوڑنے لگا جس طرف ٹایاب گئی تھی۔ وہ جلد ہی کیڑو والے باغ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر ٹایاب کو آوازیں دیتا ہوا باغ میں داخل ہو گیا۔ بہت بڑا باغ تھا۔ سکندر نے پورا باغ دیکھ ڈالا لیکن ٹایاب کہیں نظر نہیں آئی، نہ ہی اس کی طرف سے کوئی جواب ملا تھا۔ سکندر باغ کی دوسری طرف نکل آیا۔ اس طرف بھی انہی کی زمینیں تھیں۔ وہ اوپر سے گھوم کر اپنے ڈیرے پر آ گیا۔ ملک صلاح الدین چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور رسول بخش زمین پر بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ملک صلاح الدین سکندر کو یہاں دیکھ کر اٹھ گیا۔

"اباجی ادھر ٹایاب تو نہیں آئی؟" سکندر نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"نہیں۔ یہاں تو نہیں آئی۔ اسے تو آج شہر واپس جانا تھا مگر تم اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟" ملک صاحب نے پوچھا۔

"بات یہی ایسی ہو گئی ہے اباجی۔" سکندر نے کہا اور پھر اسے وہ سب کچھ بتائے جو اسے اگرچہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”یہ تمہارا واثم ہے چودھری!“ ملک سکندر نے کہا۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ نایاب بہن

”چند روز پہلے تباب نے ایک نیولے سے اس کی جان بچائی تھی۔ اگر وہ نیولے کو نہ

ہے۔ ٹایاب نے اس خوبصورت سانپ کی جان بچائی تھی اور اس سانپ نے اپنی مافی لہروں کے توسط سے ٹایاب کا شہر یہ ادا کیا تھا۔ یہ بات واقعی حیرت انگیز ہو سکتی ہے کہ ان کی مافی لہروں کی فزیکل سائنس کیسے ٹل گئی۔ آج صبح سانپ نے اپنی مافی لہروں کے ذریعے ٹایاب کو پتلا دیا ہوگا کہ وہ خطرے میں ہے اور ٹایاب اسے بچانے کے لیے دوڑ گئی۔

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ غائب کہاں ہو گئی۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”میں نے تو ملیوں دور تک کا علاقہ دیکھ ڈالا ہے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ گاؤں میں عجیب سی افواہیں پھیل رہی ہیں۔ چودھری سعادت نے یہ بات پھیلا دی ہے کہ وہ انسان نہیں ناگن تھی جس نے عورت کا روپ دھار رکھا تھا۔ اسے اپنے عاشق یعنی اس سانپ کی تلاش تھی۔ اسی لیے وہ کھیتوں میں پھرتی رہتی تھی اور بالاخر وہ سانپ کو لے کر غائب ہو گئی۔“

”اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ سیکند نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ کہنت تو دعائیں مانگ رہا ہوگا کہ اب وہ کبھی واپس نہ آئے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ اس کے غائب ہو جانے پر بہت خوش ہے۔“ سکندر بولا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے گلی میں اس سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے دونوں گھروں کے تعلقات میں ٹایاب کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہوا تھا۔ اب وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے تو ہمیں اپنے تعلقات بحال کر لینے چاہئیں۔ اس خوشی میں اس نے کل رات دعوت کی ہے اور مجھے بھی بلایا ہے۔“

”لغت ہو اس پر۔“ سیکند بولی۔ ”اس کا مشق عبدالرحمن سے بھی برا ہوگا۔“

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ ٹایاب کو کہاں تلاش کیا جائے؟“ زمرس بولی۔

”سارا دن تو اسے تلاش کرتے ہوئے گزر گیا۔ صبح دوبارہ کوشش کی جائے گی۔ زیادہ وسیع رقبے پر چھال کیا جائے گا۔“ سکندر نے کہا۔ ”میں ابھی رسول بخش کو بھیجا ہوں کہ وہ اس کی طرف۔ شاید وہ اسے تلاش کر لے۔“

”اچھا آپ منہ ہاتھ دھوئیں۔ میں روٹی پکا رہی ہوں۔ صبح سے آپ نے کچھ بھی نہیں کھایا۔“ سیکند نے کہا۔

مار بھگتی تو وہ اس سانپ کو مار ڈالتی۔“ زمرس نے کہا اور پھر اسے اس واقعے کی تفصیل بتانے لگی جو اس نے پہلے غدرہ سے اور پھر خود ٹایاب سے سنا تھا۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”ٹایاب نے مجھے بتایا تھا کہ جب اس نے نیلے سے اس سانپ کی جان بچائی تھی تو ٹایاب کو اپنے کان میں ایک سرگوشی سنائی دی تھی۔“ تم نے میری زندگی بچائی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“ اور پھر جب اس روز کھیتوں میں عبدالرحمن نے ٹایاب پر چاقو سے حملہ کرنا چاہا تو اسی سانپ نے عبدالرحمن کو ہلاک کر دیا تھا اور ٹایاب کے پیچ پر لوٹا ہوا کھیت میں غائب ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی ٹایاب کو ایک سرگوشی سنائی دی تھی۔ ”میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔“ اس رات میں اور ٹایاب دیر تک اس موضوع پر بات کرتی رہی تھیں۔ میں ٹایاب کا مذاق اڑا رہی تھی کہ وہ کوئی شہزادہ ہوگا جسے جادو کے زور سے سانپ بنا دیا گیا ہوگا۔ وہ سانپ کوئی شہزادہ ہو یا نہ ہو، کوئی پراسرار بات ضرور ہے۔ اسی لیے میں کہہ رہی ہوں کہ وہ سانپ ٹایاب کو نہیں ڈسے گا۔“ وہ چند لمبے کو خاموش ہوئی، پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”آج اسے شہر واپس جانا تھا لیکن صبح اٹھتے ہی اس نے کھیتوں کی طرف سے بین کی آواز سنی تو اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر باہر کی طرف چل پڑی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے لیکن وہ جواب دینے بغیر تیزی سے باہر نکل آگئی۔ میرا خیال ہے، اسے کوئی سرگوشی سنائی دی رہی تھی۔“

”حیرت کی بات ہے۔“ ملک سکندر اس کے خاموش ہونے کے بعد بولا۔ ”میں نے جب اسے کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا تو اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا لیکن اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے اس طرح آگے بڑھ گئی تھی جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو۔ اس کا مطلب ہے اس وقت وہ اپنے حواس میں نہیں تھی لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے کیسے پتہ چلا کہ وہ سانپ مصیبت میں ہے اور وہ اسے بچانے کے لیے پہنچ گئی تھی۔“

”نیلے بیٹھی بھائی صاحب!“ زمرس نے کہا۔ ”اس روز ہم رات بھر یہی باتیں کرتے رہے تھے۔ ٹایاب کے کانوں میں سنائی دینے والی سرگوشیوں کے بارے میں ہم نیلی بیٹی کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے اس معاملہ میں کوئی پراسرار بات نہیں

ساتویں حصہ

ٹایاب کو خود پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ بین کی آواز سننے کے بعد وہ گھر سے نکلی تھی۔ بین کی آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ناپیدہ قوت اسے کھینچ کر لے جا رہی ہو۔ گھٹن کے باہر چند آدمیوں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ سنی اس کی سن کر بھاگ کر آگے بڑھتی رہی اور پھر ملک سکندر نے بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکنا چاہا تھا۔ ٹایاب کو اس کا چہرہ بالکل اجنبی لگا تھا۔ اس نے گھور کر سکندر کی طرف دیکھا اور ایک جھٹکے سے ہاتھ چمڑا کر آگے بڑھ گئی۔ ملک سکندر نے اسے دوبارہ پکڑ لیا۔ ٹایاب نے اس مرتبہ بھی جھٹکے سے اپنا ہاتھ چمڑایا اور کمبلیوں کی طرف دوڑنے لگی۔ اسے احساس تھا کہ کوئی اجنبی اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے آ رہا ہے۔

ٹایاب دوڑتی رہی۔ نفا میں چاروں طرف بین کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ کچھ سہیرے تھے جو کمبلیوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ٹایاب کو وہ محض بیہوشوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ کسی کا چہرہ واضح نہیں تھا۔

سہیرے حالانکہ چاروں طرف تھے۔ بین کی آوازیں مختلف سمتوں سے آ رہی تھیں لیکن ٹایاب ایک لگے بندھے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی ناپیدہ ہاتھ اس کا ہاتھ پکڑے اسے مخصوص راستے پر دوڑائے لیے جا رہا ہو۔

بالآخر وہ کلرزدہ کیت کے قریب پہنچ گئی جہاں اس روز اس نے سٹری سانپ کو نیولے سے پھانسا تھا۔ راستے میں تین چار فٹ چوڑی ندی تھی۔ ٹایاب ندی میں اتر کر دوسری طرف آگئی۔

تین سہیرے اس کلرزدہ زمین پر مختلف جگہوں پر کھڑے بین بجا رہے تھے اور اس جھونے سے کلرزدہ میدان کے وسط میں وہ سٹری سانپ کھڑی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بیکھا ہوا تھا اور وہ اس طرح مجھوم رہا تھا جیسے نشے میں ہو۔ ٹایاب حیرتی سے آگے بڑھی۔

ملک سکندر صحن میں بیٹھ چپ کی طرف چلا گیا اور منہ ہاتھ دھوئے لگا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد دیر تک ٹایاب ہی کے بارے میں ہاتھیں ہوتی رہیں۔ پھر باقی لوگ تو سو گئے مگر ملک سکندر جاگتا رہا۔ وہ زبردستی کی تائی ہوئی باتوں پر غور کرتا رہا۔ اسے یہ سب کچھ بہت حیرت انگیز اور پراسرار لگ رہا تھا۔ اگر واقعی یہ سب کچھ درست تھا تو انسان اور سانپ کی دافنی لہروں کی فوٹو منسی لئے کو دنیا کا انوکھا ترین واقعہ کہا جا سکتا تھا۔

سکندر رات بھر بھی سب کچھ سوچتا رہا لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور پھر فجر کی اذان کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ رات بیت گئی تھی اور وہ ایک لمحہ کو بھی نہیں سو سکا تھا۔

اذان ختم ہونے کے بعد وہ بہتر سے اٹھنے کی تیاری کر رہی رہا تھا کہ باہر پھاٹک کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ شاید گلی میں کسی اور گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا ہے لیکن آواز دوبارہ سنائی دی تو احساس ہوا کہ انہی کے گھر کے پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“

سکندر سوچتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ ابھی وہ صحن کے وسط میں تھا کہ دروازہ تیسری مرتبہ کھٹکھٹایا گیا۔

”آ رہا ہوں بھئی۔“

وہ آگے بڑھنے ہوئے ہوا۔ اس نے آہنی کڑا پٹا کر دروازہ کھول دیا اور پھر ایک دم اچھل پڑا۔

اس کے سامنے ٹایاب کھڑی تھی۔



وہ کھڑدوں میں پہنچ گئی۔ ہر طرف ٹوٹی ہوئی دیواریں اور لمبے کے ڈھیر تھے۔ بعض جگہوں پر تو آگے بڑھنے کا راستہ بھی نہیں تھا لیکن سڑا ساپ اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔

کئی آڑے تڑپے تنگ راستوں سے گزر کر وہ ایک جگہ رک گئی۔ آگے بڑھنے کا راستہ نہیں تھا۔ اس جگہ شاید کسی زمانے میں کوئی کمرہ رہا ہوگا۔ تین طرف ٹھٹھ دیواریں تھیں۔ وہ دیوار مکمل طور پر ٹوٹی ہوئی تھی جس طرف سے ٹایاب اس کو ملنی میں پہنچی تھی۔ فرش ٹوٹا چھوڑا تھا۔

ٹایاب ایک جگہ پر کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ سنہری ساپ کمرے کے ایک کونے میں رک گیا اور بار بار ایک جگہ زمین پر پھین مارنے لگا۔ وہ بار بار ٹایاب کی طرف بھی دیکھ رہا تھا اور پھر وہ ساپ فرش کی ایک دراڑ میں گھس گیا۔ ٹایاب اپنی جگہ پر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ ساپ دراڑ سے باہر نکلا اور پھر دوبارہ اندر گھس گیا۔ وہ بار بار یہ عمل دہرا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ زمین پر پھین بھی مارنے لگتا۔ آخر میں وہ ساپ ٹایاب کے پیچ سے لپٹ گیا اور دوبارہ اس جگہ جا کر زمین پر پھین مارنے لگا۔

اور پھر ٹایاب اچھل پڑی۔ اس کے کان میں ایک سرگوشی سنائی دی جیسے کوئی کہہ رہا

ہو۔

”اس پتھر کو بیل سے ہٹاؤ۔“

ٹایاب نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس پاس کوئی نہیں تھا۔ ساپ ایک ہی جگہ زمین پر پھین مار رہا تھا۔ ٹایاب نے تھکے قدم اٹھاتی ہوئی اس جگہ پہنچ گئی۔ ساپ ایک بار پھر دراڑ میں گھس کر باہر نکلا۔ وہ دراڑ تقریباً ایک انچ چوڑی تھی۔ ٹایاب نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس دراڑ میں پھنسا لیں اور اس پتھر کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ سل نما وہ پتھر خاصا بڑا تھا اور بڑی مضبوطی سے اپنی جگہ پر بنا ہوا تھا لیکن ٹایاب کی ذرا سی کوشش سے وہ پتھر اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اس نے اب دونوں ہاتھ دراڑ کے اندر ڈال دیئے اور زور لگانے لگی۔ تھوڑی سی دیر میں چار مربع فٹ کی وہ بیماری سل اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ ٹایاب نے اسے ایک طرف اونٹھار دیا اور خود بھی پیچھے ہٹ گئی۔

پتھر کے نیچے سے برآمد ہونے والے غلا سے دھول کا باہل سا اٹھا تھا اور اس کے

ایک سپرہا بین منہ سے ہٹا کر ٹایاب کی طرف لپکا اور پیچ کر اسے ساپ سے دور کر دیا۔ کو کما لیکن ٹایاب نے جیسے سا ہی نہیں۔ وہ آگے بڑھتی رہی اور پھر اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے ساپ کو اس طرح اٹھا لیا جیسے کسی شیرخوار بچے کو اٹھایا جاتا ہے۔ اس نے ساپ کو سینے سے لگا لیا اور اسے سسلانے لگی۔ ساپ ایک دفعہ پھٹکارا اور پھر اس کے پا سے لپٹا چلا گیا۔ اس وقت ٹایاب نے ایک اور آواز سنی۔ کوئی اس کا نام لے کر پیچ ہوئے کہہ رہا تھا کہ ساپ کو پیچھ کر دور نہ دو ورنہ وہ کاٹ لے گا۔

ٹایاب نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سکندر تھا جو چند قدم دور کھڑا تھا لیکن اس کا چہرہ ٹایاب نے لیے بالکل اجنبی تھا۔ سکندر نے اس وقت پیچ کر کچھ اور بھی کہا تھا مگر ٹایاب ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ سکندر بھی اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا لیکن ٹایاب نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ٹایاب کھیتوں میں حیرت انگیز تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ کوئی اس کا نام لے کر نہ رہا تھا۔ آوازیں اس کی سماعت سے گرا رہی تھیں لیکن اس نے نہ تو پیچھے مڑ کر دیکھا نہ رکی۔ وہ مسلسل دوڑتی رہی۔ ساپ کبھی اس کے بازو سے لپٹ جاتا اور کبھی گردن سے ٹک جاتا۔ کوئی پر اسرار قوت راستے کی نشاندہی کر رہی تھی اور وہ تیز رفتاری سے نوڈر تھی۔

وہ کیوں والے باغ میں پہنچ گئی۔ وہاں بھی نہیں رکی۔ باغ کے دوسری طرف پہنچ

بھی وہ دوڑتی رہی۔

تقریباً ایک گھنٹے تک مسلسل دوڑتے رہنے کے بعد وہ رک گئی۔ وہاں کھیت ختم رہے تھے اور سانے وہ ٹیلا تھا جہاں قدیم کھنڈرات تھے۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑی اور ادھر دیکھتی رہی پھر کھیتوں سے باہر آگئی۔ ٹیلے کے قریب پہنچ کر وہ ایک بار پھر رک گئی۔ ستر ساپ اس کی گردن میں جھول رہا تھا اور پھر ساپ اس کے جسم پر رینگتا ہوا پیچھے اترتا اور ٹیلے پر کھنڈروں کی طرف رینگنے لگا۔

ٹایاب بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتے گئی۔ وہ ننگے پیر تھی۔ اس کے چہل کبھی گرے تھے۔ ٹیلے پر چلتے ہوئے اس کے پیروں میں تکر چبھ رہے تھے لیکن اسے جیسے کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ ساپ کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے پتا نہ ہو کہ اس پر تو بڑی کیفیت طاری تھی۔

ہوئے اس کے کندھے اور بازو بھی دیواروں سے رگڑ کھا رہے تھے۔ ٹایاب چلتی رہی اور بالآخر وہ ایک کھلی جگہ پر نکل آئی۔

یہ ایک بہت بڑا سال تھا جس میں لڑائی روشنی بجلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے یہ پراسرار روشنی دیواروں سے پھوٹ رہی ہو۔ ہر طرف کھڑکوں کے جالے لٹے ہوئے تھے۔ اس جگہ زمین پر ایک سانپ اور دو چھوٹے بچے ہوئے نظر آئے۔ اگر ٹایاب اپنے حواس میں ہوئی تو پہچانی ہوئی یہاں سے بھاگ جاتی لیکن وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ اس کا ذہن مکمل طور پر کسی پراسرار قوت کے کنٹرول میں تھا۔ کوئی ٹیڑھا قوت تھی جو اس سے یہ سب کچھ کروا رہی تھی اور اسے یہاں تک لے آئی تھی۔

اس ہال کے اختتام پر وہ ایک بار پھر دائیں طرف مڑ گئی۔ یہ راستہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ اس کے اختتام پر ایک اور کمرہ تھا جس میں ایک طرف چارپائی کے برابر ایک چوڑا بنا ہوا تھا۔ وہ شہری سانپ اس چوڑے پر چڑھ گیا اور زمین پر پھین مارنے لگا۔

ٹایاب اس چوڑے پر پہنچ گئی۔ اس پر غصہ کی سی طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ روشنی صرف اس جگہ تھی جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے کا باقی حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ٹایاب کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ اس کے لیے بیٹھے رہتا مشکل ہو گیا۔ وہ چوڑے پر ایٹ گئی اور پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

ٹایاب تقریباً چار گھنٹے تک سوئی رہی۔ اسے سوتے میں یوں لگا جیسے اس کے جسم پر کوئی چیز ریک رہی ہو۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ جس جگہ لیٹی تھی، صرف اسی جگہ روشنی تھی جیسے اسپاٹ لائٹ کی زد میں ہو۔ اس کے علاوہ اطراف میں گہری تاریکی تھی۔ اس کے دماغ میں تیز سنناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ وہ رات کو گھر میں سوئی تھی اور صبح آٹھ بج کر گھر میں تھی لیکن اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ شاید وہ پھر سو گئی تھی لیکن یہ تاریکی کیسی تھی۔ یہ کوئی جگہ ہے اور وہ یہاں کیسے پہنچی تھی۔

ٹایاب اس وقت مکمل طور پر حواس میں تھی۔ اس کے دماغ میں سنناہٹ بدھتی جا رہی تھی۔ اسے ایک بار پھر محسوس ہوا جیسے کوئی چیز اس کے جسم پر ریک رہی ہو اور پھر

ساتھ ہی گرم ہوا ٹایاب کے چہرے سے کرائی تھی اور اسی لیے وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔ وہ سانپ بھی اس کے پیروں کے آس پاس ریک رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد دھول بیٹھ گئی۔ اب اس خلا سے گرم ہوا بھی خارج نہیں ہو رہی تھی۔ وہ سنہرا سانپ رینگتا ہوا اس خلا میں اتر گیا۔ ٹایاب بھی خوبی انداز میں چلتی ہوئی اس خلا کے کنارے پر پہنچ گئی۔ اس خلا میں چمڑکی میڑھیوں نظر آ رہی تھیں اور وہ سانپ رینگتا ہوا میڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ ٹایاب بھی خلا میں اتر گئی اور میڑھیوں پر غلط انداز میں قدم رکھتی ہوئی آہستہ آہستہ پیچھے اترنے لگی۔

وہ چوڑے میڑھیوں اترتی تھی۔ آگے بہت وسیع و عریض ہال تھا جس میں لاتعداد ستون نظر آ رہے تھے۔ کھڑکوں کے جالوں نے ان ستونوں کے درمیان دیواریں سی بنا رکھی تھیں۔ وہ سانپ زمین پر رینگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ٹایاب بھی ہاتھوں سے جالے ہٹاتے ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اس کے سر کے بالوں میں اور لباس پر جالے چپک گئے تھے۔ وہ جالے ہٹاتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ چلنے میں اس کے اپنے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ کوئی تادیبہ قوت اسے آگے لے جا رہی تھی۔

ٹایاب کی یہ کیفیت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ نہ تو سمجھتا تھا کہ اسے واقف تھی اور نہ ہی اس کا دماغ اپنے کنٹرول میں تھا۔ کوئی پراسرار قوت تھی جس نے اس کے دماغ پر بھی قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ سانپ کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔

وہ اس خلا میں اترنے کے بعد تھ خالے میں بہت اندر آگئی تھی لیکن محسوس کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ تاریکی بھی نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے ہیکلی سی چاندنی بجلی ہوئی ہو۔ اس بدمعاش روشنی میں نہ تو واضح طور پر کچھ نظر آ رہا تھا اور نہ ہی تاریکی کا احساس تھا۔ لگتا تھا جیسے دھند بجلی ہوئی ہو لیکن سونے کی طرح چمکتا ہوا وہ سانپ اس دھندلی فضا میں بھی صاف نظر آ رہا تھا۔

وہ سانپ دائیں طرف مڑ گیا۔ ٹایاب بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ یہ ایک ٹھک سا راستہ تھا جو آگے جا کر دائیں طرف مڑ گیا تھا۔ وہ راستہ بھی چار فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ بیس گز چلنے کے بعد راستہ پھر دائیں طرف مڑ گیا۔ یہ نیا راستہ اتنا ٹھک تھا کہ ایک بھاری بھر کم آدمی بمشکل چل سکتا تھا۔ ٹایاب تناسب جسم کی مالک تھی۔ چلنے

اور پھر اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہا تھا اور اب وہ غرور نہ ہی بیٹھی سوچ رہی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے اور وہ یہاں کیسے پہنچی۔ وہ تو صبح کے وقت گھر سے نکلی تھی۔ اس کے چاروں طرف یہ تاریکی کیوں ہے اور یہ پراسرار روشنی کیسی ہے جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ وہ سوچتی رہی مگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

دھنسا۔ وہ ہلکی سی پھکار سن کر چونک گئی۔ اس نے گردن ہٹا کر دیکھا۔ وہ سنتری سانپ اس کے قریب کٹنی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہن پھیلا ہوا تھا اور وہ شاخہ زبان مسلسل حرکت کر رہی تھی۔

”دیکھو۔“ غایب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے لیے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ ”میں نہیں جانتی کہ تم واقعی سانپ ہو یا کوئی اور پر اسرار چیز لیکن اس روز تم نے مجھے میرے ایک دشمن سے بچا کر اسے ختم کر دیا تھا۔ میں تمہاری احسان مند ہوں۔ میرے کانوں میں وہ پراسرار سرگوشیاں شاید تمہاری خاموش آواز تھی۔ تم نے کہا تھا کہ میری حفاظت کرو گے۔ میرے محافظ ہو گے۔۔۔ مجھے نہیں معلوم یہ کوئی جگہ ہے اور میں یہاں کیسے پہنچی ہوں۔ یہاں سے نکلے میں میری مدد کرو۔“

”درو نہیں۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔“ غایب کو سرگوشی سنائی دی۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

غایب کمری نظروں سے سانپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی دو شاخہ زبان مسلسل حرکت کر رہی تھی اور پھر سانپ کا چہن سمٹ گیا اور وہ دل کھاتا ہوا ایک طرف دیکھنے لگا۔ غایب چوڑے سے اتڑ آئی اور سانپ کے پیچھے پیچھے چلے گئی۔ کمری تاریکی کے باوجود اسے اپنے سامنے کا راستہ صاف نظر آ رہا تھا اور پھر ایک جگہ سے راستے سے گزر کر وہ ایک اور کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کمرے میں پراسرار نقری روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف کونوں کے جالے نظر آ رہے تھے اور سامنے ایک چوڑا تھا۔ چوڑے پر نظر پڑتے ہی غایب اچھل پڑی۔ وہ اس طرح رک گئی جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں۔ وہ متوحش نظروں سے چوڑے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

چوڑے پر ایک نامن کی بہت بڑی موڑتی رکھی ہوئی تھی۔ وہ نامن بھی سنتری رنگ

اس کے منہ سے بے اختیار تیز جھج نکلی۔ سنبرا سانپ اس کے سینے پر رنگ رہا تھا۔ اس نے سانپ کو پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ وہی سانپ تھا جسے اس نے نیلے سے بنایا تھا اور پھر اس سانپ نے اسے بچانے کے لیے عبدالرحمن کو ڈس لیا تھا اور اس کی لاش راگھ کا ڈھیر بن گئی تھی۔

غایب کا جسم سینے میں شرابور ہو گیا۔ ایک انعامنا سا خوف اس پر غالب آنے لگا تھا۔ وہ متوحش لگا ہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی مگر گھٹا ٹپ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور اسے حیرت تھی کہ اس پر پڑنے والی روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔ روشن کا کوئی منبع بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نقری روشنی کا ایک ہالہ تھا جو اسے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ وہ سانپ بھی اگرچہ تاریکی میں تھا مگر صاف نظر آ رہا تھا۔

غایب کو اب سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ جب صبح وہ اٹھی تھی تو اسے کھیتوں کی طرف سے بین کی آواز سنائی دی تھی بلکہ ٹینڈ میں بھی اسے بین کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں اور آگے کھلنے کے بعد بھی اس نے یہ آوازیں سنیں تو چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی اور پھر اسے یاد آ گیا تھا کہ گزشتہ رات ملک سکندر نے بتایا تھا کہ چدرہی سعادت سیہوں کی بستی کیا تھا اور اس خطرناک زہریلے سانپ کو پکڑنے کے لیے صبح سیہرے آنے والے تھے کیونکہ مزارعوں اور کارندوں نے کھیتوں پر جانے سے انکار کر دیا تھا۔

غایب اس وقت آنکھیں کھولے بستر پر لیٹی یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ اس کے کان میں ایک پراسرار سرگوشی سنائی دی۔

”یہ لوگ مجھے گھیر رہے ہیں۔ مجھے بھجھاؤ۔۔۔ بین کی آواز میرے اعصاب کو کمزور کر رہی ہے۔ اس آواز کے سامنے میں اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ میری مدد کرو۔ مجھے بچاؤ۔“

یہ سرگوشی بار بار غایب کے کانوں میں گونج رہی تھی اور پھر اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ گئی۔ اس وقت اسے یوں لگے جیسے وہ اپنے آپ میں نہ رہی ہو۔ اس کا دماغ اپنے کنٹرول میں نہ رہا ہو۔ وہ اسی کیفیت میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ برآمدے میں زمر نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے لیکن وہ اس کی طرف توجہ دینے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ وہ لوگوں کے روکنے کے باوجود کھیتوں میں دوڑتی چلی گئی تھی اور اس نے سیہوں کے سامنے اس سانپ کو بھی اٹھا لیا تھا

”رائی شہا۔“ ٹایاب چونک گئی۔ ”تم کون ہو؟“

”میں شیتا ہوں۔ رائی شہا کے خزانوں کی محافظ۔“ شہس کی سرگوشی ٹایاب کی سماعت سے کھڑکی۔ ”رائی شہا سے ایک غلطی ہو گئی تھی جس کا خفیہانہ اسے بھگتنا پڑا۔ وہ خود بھی جل مری اور اس کی ریاست بھی تباہ ہو گئی۔ لوگ جانتے تھے کہ رائی شہا نے بت دیا خزانہ جمع کر رکھا تھا۔ وہ اس خزانے کو تلاش کرتے رہے لیکن میں نے کسی کو خزانے کے قریب نہیں آنے دیا۔ میں اب بھی اس خزانے کی حفاظت کر رہی ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ رائی شہا واپس ضرور آئے گی۔ ہمارے درمیان ہونے والے ایک عہد کے مطابق میں آج سے خزانے کی مالک بن چکی ہوں اور اس میں سے ایک حصہ نذرانے کے طور پر تمہاری خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں نے رائی شہا کے بارے میں کچھ سنا تھا۔“ ٹایاب بولی۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ اسے ایک بندر سے شوق ہو گیا تھا اور وہ اس کے ساتھ۔۔۔۔۔“

”یہ ایک طویل داستان ہے۔“ آواز سنائی دی۔ ”رائی شہا اس بندر کو جہان کا اوتار سمجھتی تھی لیکن میں اس کی حقیقت سے واقف تھی۔ میں نے رائی شہا کو خیرباد کر دیا تھا لیکن وہ میری بات نہیں مانی اور اس کے ساتھ اس کی سلطنت بھی تباہ ہو گئی۔ وہ بندر فرار ہو گیا۔ وہ اس سرزمین پر موجود ہے اور میری اولاد آج بھی اسی کی تلاش میں ہے۔“

”اور۔“ ٹایاب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”یہ تمہارا بیٹا ہے؟“ اس نے ناگن کی گود میں بیٹھے ہوئے شہسے سانپ کی طرف اشارہ کیا۔

”سینکڑوں سال سے ہماری نر نسل سے صرف ایک نر سانپ پیدا ہوتا ہے۔ یہ میرے بعد گیارہویں نسل ہے۔“ سرگوشی نے کہا۔

”گھریا تم سانپوں کی ملکہ ہو اور یہ شہزادہ۔“ ٹایاب نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ سرگوشی سنائی دی۔ ”تم نے اس نر دھولے سے اس کی جان بچائی تھی۔ ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ تمہارے دشمن نے تم پر حملہ کرنا تھا تو تجھ نے اسے شتم کر دیا اور آج پھر یہ معیت میں تھا۔ تم نے اسے آج بھی بچا لیا۔ تمہارا یہ احسان نسل در نسل ہمارے سر پر رہے گا۔ یہ خزانہ اب تمہارا ہے، جب چاہو اسے لے جا سکتی ہو۔“

”نہیں نہیں۔ مجھے یہ خزانہ نہیں چاہئے۔“ ٹایاب بولی۔ ”میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“

کی تھی اور اس کے پھیلے ہوئے پھن پر دونوں طرف ویسے ہی خوبصورت فھن تھے جو وہ شہسے سانپ کے پھن پر دیکھ چکی تھی۔ وہ اگرچہ مورتی تھی لیکن لگتا تھا جیسے زندہ ناگ، کھلی مارے اور پھن پھیلانے بیٹھی ہو۔

ناگن کی مورتی کے سامنے چوتھے پر ہیرے جواہرات اور طلائی عروق اور طلائی نفرتی زیورات بکھرے ہوئے تھے۔ بعض ہیرے تو کھڑکے انڈے سے بھی بڑے تھے اور ان سے رنگ برنگ کرئیں چھوٹ رہی تھیں۔ ٹایاب کے خیال میں یہ خزانہ اربوں روپے مالیت کا ہو سکتا تھا۔ چوتھے پر وائیں بائیں کناروں پر وہ یاد باگ بھن پھیلانے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اس خزانے کے محافظ تھے لیکن وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ ان میں سے کون سے بھی حرکت نہیں کی تھی۔

ٹایاب اس شہسے سانپ کی طرف دیکھ رہی تھی جو چوتھے پر چڑھ کر ہیرے جواہرات کے ڈھیر پر رینگتا ہوا ناگن کی مورتی پر چڑھ گیا تھا اور اس سے لپٹ کر بل کھا ہوا کبھی اوپر جا رہا تھا اور کبھی نیچے آ رہا تھا۔ بالآخر وہ ناگن کے کھلی والے حصے پر بیٹھ گیا اور پھن پھیلانے ٹایاب کی طرف دیکھنے لگا۔

ٹایاب پر خوف سا طاری ہو رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ وہ عجیب و غریب حالات کا شکار ہو کر یہاں پہنچ گئی تھی اور اب خوفزدہ سی ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ یہاں سے بھاگ جا چاہتی تھی اور پھر وہ واپس جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ ایک سرگوشی اس کی سماعت سے کھڑکی۔ اس مرتبہ آواز نسوانی اور بہت شیریں تھی۔ ٹایاب کو یہ آواز کانوں میں رس گھولتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اس کے واپس جانے کے لیے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ شیریں آواز کہہ رہی تھی۔

”رک جاؤ ٹایاب۔۔۔۔۔“ ایک لمحہ کے وقفے سے وہ سرگوشی دوبارہ سنائی دی۔ ”تم نے وہ مرتبہ میرے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ میں تمہاری بے حد شکر گزار ہوں۔ تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ میں تمہارے اس احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتی لیکن اعما، تفکر کے طور پر حقیر سا نذرانہ پیش کرنا چاہتی ہوں۔ یہ رائی شہا کے خزانے کا ایک حصہ ہے جو میں تمہاری نذر کر رہی ہوں۔“

ری تھی۔

فضا میں اب بھی بہت دھندلا سا اجالا پھیل رہا تھا۔ پھر گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز سن کر ٹایاب کو عجیب سا سکون ملا تھا۔

اذان ختم ہو گئی۔ وہ گلیوں میں چلتی رہی اور بالا خر ملک صلاح الدین کی حویلی کے سامنے رک گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دروازے پر دستک دینے لگی۔ چند منٹ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔

وہ ملک سکندر تھا جو اس طرح حیرت سے ٹایاب کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔



میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ ٹایاب آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔

اس وقت اس کے دماغ کو جھٹکا سا لگا اور وہ اپنی جگہ پر لڑکھڑا کر رہ گئی۔ وہ ایک بار پھر اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سلی جلی رہی تھیں۔ غصہ کی طاری ہونے لگی۔ اس کی نظریں ناگن پر جمی ہوئی تھیں اور پھر اسے یوں لگا جیسے وہ کسی کھونٹے والے بھولے پر بیٹھی ہوئی ہو۔ بھولا آہستہ آہستہ گردش کر رہا تھا۔ ٹایاب آہستہ آہستہ بھوم رہی تھی۔ وہ چوتڑا ناگن اور جواہرات کا وہ ڈھیر اس کی نظریں کے سامنے محدود ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بتدریج تاریکی پھیلنے چلی گئی اور وہ آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ کر گرد آلود فرش پر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

ٹایاب کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک کھلی جگہ پر پایا۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور متحوش لگا ہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ نہیں سکتی تھی لیکن محضی ہوا کے جھوکوں سے اس کے حواس بتدریج بحال ہونے لگے۔ وہ ایک بار پھر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

وہ کھنڈروں والے ٹیلے کے دامن میں پڑی تھی۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ بعض ستاروں کی پوزیشن سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ رات کا آخری پھر تھا اور پھر اپنے قریب ہی پتھار کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ اس نے گردن کھما کر دیکھا۔ وہ سنرا سانپ بچو اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے منہ سے ایک بار پھر پتھار کی آواز نکالی اور تجزی سے رینگتا ہوا کھنڈروں کی طرف غائب ہو گیا۔

ٹایاب تقریباً پانچ منٹ تک وہاں بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس خانے میں کبھی کسی بھیڑیے کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔

ٹایاب اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ اس نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا اور ایک طرف چل پڑی۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ بری طرح تھک گئی مگر رکے بغیر چلتی رہی اور بالا خر نہر پار کر کے گاؤں میں داخل ہو گئی۔ گاؤں پر بھی سناٹا طاری تھا۔ پھر ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ ٹایاب دیوار کے ساتھ لگ کر چل

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں اور اسے پریشان مت کرنا دینی طور پر اب سیٹ نظر آ رہی ہے۔“

سکندر کمرے سے نکلتا چاہتا تھا کہ ملک صلاح الدین کھٹکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے آگے بڑھ کر ٹایپ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ٹایپ بیٹا۔ ہم تو پریشان ہو گئے تھے۔ کہاں چلی گئی قیسی تہ۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”سب۔۔۔ ہاؤس کی۔۔۔ ہاؤس کی۔“ ٹایپ کے منہ سے بے ربط سے الفاظ نکلے۔

”میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ واپس آ کر بات کرتا ہوں۔ اللہ کا شہر ہے تم زندہ ہو اور خیریت سے گھر واپس آ گئی ہو۔“ ملک صاحب نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ سکندر چنڈ پپ سے ہاتھ میں پانی پیا مبرا تھا۔ ملک صاحب ہاتھ دھو کر صابن سے دھو کر آئے تو انہوں نے بھی دھو لیا اور دونوں ہاتھ پانی نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے۔ سکندر نے باہر جانے سے پہلے سیکنڈ لور زمرس وغیرہ کو سمجھا دیا تھا کہ کسی کو ٹایپ کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔

مسجد میں میں بائیس آدمی تھے۔ جامعہ نماز پڑھنے کے بعد کچھ لوگ تو قرآن حکیم کی تلاوت کرنے بیٹھ گئے اور کچھ چلے گئے۔ ملک صاحب بھی عام طور پر نماز کے بعد کچھ دیر مسجد میں بیٹھا کرتے تھے لیکن آج وہ نماز پڑھتے ہی مسجد سے باہر آ گئے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی آدمی ان سے ٹایپ کے بارے میں ضرور پوچھے گا اور وہ مسجد میں بیٹھ کر جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ کچھ یہی صورت حال سکندر کی تھی۔ وہ بھی نماز پڑھتے ہی مسجد سے باہر آ گیا اور کسی سے بات کے بغیر ملک صاحب کے ساتھ گھر کی طرف چل پڑا۔ کچھ لوگوں کو ان کے طرز عمل پر حیرت بھی ہوئی تھی۔ آج وہ دونوں کسی سے بات کے بغیر چلے گئے۔

”آج تو سکندر اور ملک بی چپ چاپ ہی چلے گئے۔ حالانکہ ملک بی تو تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم سے کپ شپ کرتے تھے۔“ ذہری نازی ایک شخص نے مسجد میں بیٹھے ہوئے اپنے دو ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہتھیارے چھوٹی بی بی کی دج سے پریشان ہیں۔“ شاب الدین نے کہا۔ ”یہ تو بڑی

ٹایپ دروازے کے سامنے کھڑی تھی اور ملک سکندر چینی پینٹی سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ٹایپ ہی تھی یا کوئی اور۔

ٹایپ کا لباس گرد آلود تھا جیسے مٹی میں لوٹ کر آئی ہو۔ بال بکھرے ہوئے جن میں نیلے اور کھڑی کے بال چپکے ہوئے تھے۔ کمرے کے بالے لباس پر بھی نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر بدخواہی اور خوف کے طے چلے تاثرات تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ برہنہ پا تھی اور سروی سے اس کے ہونٹ نیچے ہو رہے تھے۔

”ٹایپ تم! سکندر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”آؤ بہن۔ اندر آؤ۔“ اس نے دروازے سے ہٹ کر ٹایپ کو اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

ٹایپ اندر آ گئی۔ وہ سروی سے غور رہی تھی۔ اس کے اندر آتے ہی سکندر نے دروازہ بند کر دیا اور ٹایپ کو بازو سے پکڑ کر برآمدے کی طرف لے جاتے ہوئے سیکنڈ لور آؤازیں دینے لگا۔

”سیکنڈ۔۔۔ سیکنڈ۔ باہر آؤ۔ دیکھو ٹایپ آ گئی ہے۔ زمرس۔۔۔ عذرہ دروازہ کھولا بھی۔“

سب سے پہلے سیکنڈ باہر آ گئی تھی۔ ٹایپ کی حالت دیکھ کر وہ بھی بھونچکا سا رہی۔ اسے یہ بھی اندازہ لگاتے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ ٹایپ سروی سے غصہ رہی تھی۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی اور بیڈ پر بٹھا کر کھیل اودھ دیا۔ اس دوران زمرس اور عذرہ بھی آ گئیں۔ زمرس تو آتے ہی ٹایپ سے پت لگئی۔

”کہاں چلی گئی قیسی تم ٹایپ۔۔۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟“

”ہپ۔۔۔ پتہ نہیں میں کہاں تھی۔“ ٹایپ نے پھکاتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر تم گرم چائے بنا کر پلاؤ اسے۔ سروی سے غصہ رہی ہے۔“ سکندر نے سیکنڈ کو

"اچھا ٹھیک ہے۔ کسی کو نہیں بتائیں گے۔ آپ بھی بیٹھ کر ناشتہ کر لیں۔" سکیئہ نے کہا۔

سکندر اس کے پیچھے ہی باورچی خانے میں آگیا اور سکیئہ کے قریب ہی بیڑھی پر بیٹھ گیا۔ سکیئہ نے ناشتہ تیار کر کے پہلے ملک صاحب کو لے جا کر دیا اور پھر شوہر کے لئے ناشتہ تیار کرنے لگی۔ نرگس اور عذرا وینڈ پپ پر کھڑی منہ ہاتھ دھو رہی تھیں۔ اس وقت وہ کاندے حویلی میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک مرد تھا اور ایک اوسط عمر عورت۔ مو تو بھینسوں کے لئے چارہ تیار کرنے لگا اور عورت نرگس کے پاس آگئی۔

"پھولٹی بی بی کا کچھ پتہ چلا نرگس بی بی؟" عورت نے پوچھا۔
 "نہیں ماسی۔" نرگس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "وہ بھاری تو پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئی ہے۔"

وہ عورت کچھ دیر تک کھڑی باتیں کرتی رہی پھر آگن کی صفائی وغیرہ میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد سکندر ناشتہ کر کے کچن سے باہر چلا گیا۔

"میں ڈیرے پر جا رہا ہوں۔" باہر بجے آجاکوں گا اور میری باتوں کا خیال رکھنا۔" سکندر نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کاندے حویلی سے باہر چلا گیا۔

آج کھیتوں میں لوگ نظر آ رہے تھے۔ کل ان سب کو پتہ چل گیا تھا کہ ٹایپ اس خطرناک سانپ کو لے کر کہاں گئی تھی اور پھر نہ تو ٹایپ کا پتہ چلا تھا اور نہ سانپ کا۔ اس لئے لوگ بے فکر ہو گئے تھے اور وہ دن کے ٹانے کے بعد آج کھیتوں پر آگئے تھے۔

سکندر بھی ڈیرے پر آ کر روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ملک صاحب بھی آگئے۔ ملک صاحب اگرچہ بوڑھے ہو چکے تھے مگر کھیتوں پر باقاعدگی سے آتے تھے۔ ان کا مکان تھا کہ زمیندار کے بیڑوں کی مٹی زمین کے لئے سونا ہوتی ہے اور پھر ان کی قابل رشک صحت کا راز بھی یہی تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتے تھے۔

سورج سر پر آچکا تھا۔ سکندر گاؤں واپس آگیا۔ ٹایپ ابھی تک سو رہی تھی۔
 "اس کو جا کر دیکھو تو سہی۔ طبیعت تو خراب نہیں اس کی۔ بخار تو نہیں ہو رہا ہے؟" سکندر نے سکیئہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

جراثیمی کی بات ہوئی ہے۔ پھولٹی بی بی کا اس طرح غائب ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ ملکہ دور تک کا علاقہ دیکھ لیا گیا مگر اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔"

"پریشانی کی بات تو ہے۔" تیسرے آدمی نے کہا۔ "پھولٹی بی بی ان کے ہاں ٹھہرا ہوئی تھی۔ ذرا داری تو ان پر غائب ہوئی ہے نا۔"

"ہاں جی۔ پرانی بیٹی ہے۔ ملک جی کو پریشانی تو ہونی چاہئے۔" شاب الدین نے کہا۔
 "ملک جی تو پریشان ہیں پر جن کی بہو ہے انہیں ذرا بھی فکر نہیں۔" نذیر بولا۔

"نہیں کیا فکر ہو گی۔" شاب الدین بولا۔ "چھوڑی سعادت تو پھولٹی بی بی کے" ہو جانے پر خوشیاں منا رہا ہے۔ رات کو تو میں نے سنا تھا کہ وہ جشن منانے کی تیاری کر رہے۔ آج اس نے اپنے دوستوں کو حویلی میں دعوت پر بلایا ہے۔"

"عجب زنانہ آگیا ہے۔" تیسرا آدمی بولا۔ "کسی کے مرنے پر اس طرح خوشیاں مناتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔ بے حسی کی انتہا ہو گئی۔ خون سفید ہو گیا ہے ان کا۔"

"کون کہہ سکتا ہے کہ پھولٹی بی بی واقعی مر گئی ہے یا زعمہ ہے۔" نذیر نے کہا۔
 "اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" شاب الدین نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "خدا کرے۔"

وہ زعمہ ہو اور خیریت سے ہو۔"
 "آئین۔" شم آئین۔" باقی دونوں آدمیوں نے کہا اور یہ محفل برخاست ہو گئی۔

سکندر اور ملک صاحب گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ ٹایپ جانے پہنچنے کے بعد سو گئی تھی سردی سے کانپ رہی تھی۔ نرگس نے اسے لٹاف اڑھا دیا تھا۔

"پتہ نہیں بھاری رات بھر کھیتوں میں پڑی رہی ہے۔ اسے سوتے دو۔ اس کی ذہ پوری ہو جائے تو بھر ہے۔" ملک صاحب نے کہا پھر سکیئہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ "لاؤ مجھے ناشتہ دے دو۔"

"جی۔ آپ بیٹھے۔ میں آپ کے کمرے میں ہی ناشتہ لے کر آ رہی ہوں۔" سکیئہ۔

کچن کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا۔
 "اس کمرے کا دروازہ بند ہی رکھنا سکیئہ۔" سکندر نے کہا۔ "آج سارا دن کسی کو

نہیں بتانا کہ ٹایپ واپس آگئی ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ چھوڑی سعادت آج کیا کر رہے۔"

”میں نے تمہارے لئے کپڑے استری کر رکھے ہیں۔ چلو۔۔۔ نماز کر پڑے بدل لو۔۔۔ پھر کھانا کھائیں گے۔ تم صبح چہ بیچے سے سو رہی ہو۔ بھائی جان پریشان ہو رہے ہیں۔“

زمر نے کہا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

”میں نے واقعی تم لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔“ ثانیاب نے کہا۔

کمرے سے باہر آکر وہ غسل خانے میں گئی۔ استری کئے ہوئے کپڑے کوئی پر لٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت بھی اس کے دماغ میں سنسنات سی ہو رہی تھی۔ مگر لفظے پانی کے غسل سے اس کے حواس بحال ہو گئے۔ نہانے کے بعد اس نے صاف کپڑے پہنے اور سر پر تولیہ لپیٹ کر باہر آئی۔ عذرہ نے اسے دیکھتے ہی کھانا لگا دیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

”ثنیاب بہن۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”عذرہ اور زمر نے مجھے اس سترے سانپ کے بارے میں بتایا تھا جسے تم نے کیتوں میں ٹولے سے پھینکا تھا اور پھر اس سانپ نے تمہاری مدد کی تھی اور عبدالرحمن کو اس طرح ڈسا تھا کہ اس کا جسم راکھ بن گیا۔ تم نے ہی بتایا تھا کہ یہ سب کچھ دو منٹ کے اندر اندر ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس سانپ کے ذہن میں ایسی تاثیر تھی کہ اس نے دو منٹ کے اندر ایک انسانی جسم کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”کلی ہم لوگوں نے جو کچھ دیکھا وہ بہت ہی حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھا۔ ہمیں ڈر نہیں لگا تھا؟“

”کیسا ڈر؟“ ثانیاب نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ لوگوں نے کیا دیکھا تھا؟ کیا میں نے کوئی غیر معمولی حرکت کی تھی؟“

”غیر معمولی؟“ سکندر نے اسے گھورا۔ ”وہ انتہائی حیرت انگیز واقعہ تھا۔ تم نے اس خطرناک سانپ کو اٹھا لیا تھا۔ لیکن تم کیتوں میں کیسے پہنچ گئی تھیں اور تم نے بلا خوف اس سانپ کو اٹھائیے لیا تھا؟“

ثنیاب کے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ ”مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ صبح جب بین کی آواز سے میری آنکھ کھلی تھی تو مجھے یوں لگا رہا تھا جیسے کوئی مجھے مدد کے لئے پکار رہا ہو۔ پھر جب میں اپنے کمرے سے نکلی تھی تو مجھے زمر نے مدد کے کی کوشش کی

”ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا۔“ قریب کھڑی ہوئی زمر نے کہا۔ ”بھار نہیں ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے۔ رات بھر جاگتی رہی ہے اس لئے سو رہی ہے۔“

”پتہ نہیں اس نے کہاں اور کن حالات میں رات گزاری ہے۔ میں تو صبح اس کی حالت دیکھ کر ڈر گیا تھا۔“ سکندر نے کہا۔ ”جاگ جائے تو پتہ چلے کہ اس کے ساتھ کیا جتنی تھی۔“

ثنیاب چونکہ سکندر اور یکینہ والے کمرے میں سو رہی تھی اس لئے سکندر ملک صاحب والے کمرے میں آکر بیٹھ کر لپٹ گیا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب یکینہ نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہے۔

”زمر۔“ سکندر نے کہا۔ میرا خیال ہے اب ثانیاب کو بھی جگا دو۔ صبح چہ بیچے سے سوئی ہوئی ہے۔“

”چھا۔ میں دیکھتی ہوں۔“ زمر کہتے ہوئے دوسرے کمرے میں گھر گئی۔

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی ثانیاب نے کسمار کر کھٹ بدلی اور لحاف اتار کر پھینک دیا۔ زمر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

”ثنیاب۔“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”مفتا نہیں ہے کیا۔ دھیر ہو رہی ہے۔ ہمیں ہموک بھی لگی رہی ہوگی۔ اٹھ جاؤ۔ کھانا تیار ہے۔“

ثنیاب نے آنکھیں کھول دیں اور زمر کی طرف دیکھنے لگی۔ پہلے تو اسے یہ چہرہ دھندلا سا لگا پھر دھند بھٹ گئی اور اس نے زمر کو پہچان لیا۔ ثانیاب کے ہونٹوں پر خفیت سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر زمر کی گردن میں حائل کر دیئے اور اسے سمجھ کر اپنے اوپر گرا لیا اور اس کے منہ پر بوسے دینے لگی۔ زمر بھی اس سے پرست گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

”اب اٹھ جاؤ نا۔ کھانے پر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ زمر نے اپنے آپ کو اس سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

ثنیاب چند لمحوں کے بعد اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنے آپ کو دیکھ کر اسے حیرت ہو رہی تھی۔

تھی۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔ البتہ بعد کے کچھ ایسے واقعات ہیں جو اس وقت بھی مجھے یاد ہیں اور میرے لئے حیران کن ہیں۔ لیکن پہلے آپ یہ بتائیے کہ میں نے کیا کیا تھا؟

”ہوں۔“ سکندر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”تم نے جو کچھ بھی کیا وہ سب کے لئے حیرت انگیز اور سستی خیز تھا اور ناقابل یقین تھی۔“ وہ چند لمبے خاموش ہوا پھر اسے کل کے واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”تمہاری تلاش میں کل شام تک ملیں دور تک کا علاقہ چھان مارا گیا۔ لیکن تمہارا کوئی سراغ نہیں ملا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ دوڑتے ہوئے راستے میں اس سانپ نے تمہیں ڈس لیا ہوگا اور تمہاری خاستر لاش کھیتوں میں کہیں پڑی ہوگی اور وہ اس وقت ہی لے گی جب ڈھائی مہینے بعد فصلیں کٹیں گی۔ چہرہ پر مسرت کہ تو تمہاری موت کا یقین ہو چکا ہے۔ وہ تو جشن منانے کی تیاری کر رہا ہے۔ آج رات اس نے اپنے دوستوں کی دعوت کی ہے۔ مجھے بھی بلایا ہے۔ مجھے یادہ اس نے کل شام ہی کو دیدیا تھا۔ گویا اسے کل ہی یقین ہو گیا تھا کہ تم اب اس دنیا میں نہیں رہیں اور جائیداد کے سارے جھگڑے ختم ہو گئے ہیں۔“

”تلاش کے دوران ان میں اس کے ہاتھ لگ جاتی تو شاید وہ مجھے ماری ڈالتا۔“
 ”تایاب نے کہا۔“ کیا آپ لوگ میری تلاش میں ان کھنڈروں کی طرف بھی گئے تھے؟“
 ”کھنڈروں کی طرف؟“ سکندر چونک گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ وہ نیلے والے کھنڈروں کی طرف؟ لیکن وہ تو گاؤں کے دوسرے طرف ہیں جبکہ ہم ہمیں اس طرف تلاش کرتے رہے تھے جس طرف تم بھاگی تھیں۔“

”میں انہی کھنڈروں کی بات کر رہی ہوں۔“ تایاب نے کہا۔ ”آپ نے جو کچھ کہا ہے اگر وہ سچ ہے اور ظاہر ہے آپ نے غلط بیانی یا مبالغہ سے کام نہیں لیا ہوگا اور سب کچھ سچ ہی ہوگا۔ لیکن مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے جیسے میں بے تماشہ دوڑی جا رہی ہوں۔ کوئی ٹاپیدہ قوت مجھے دوڑتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی اور بالاخر میں کہیں کمرنگی تھی۔ چند لمحوں کے لئے میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے اپنے آپ کو اس نیلے کے دامن میں پڑے ہوئے پایا تھا۔ میرے قریب ہی وہ سانپ بھی کٹلی مارے بیٹھا تو اور پھر جب وہ ان کھنڈروں کی طرف رینگنے لگا تو میں بھی اس کے پیچھے چل پڑی

تھی۔ اس وقت میرا ذہن پھر ماؤف ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ احساس نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں اور اس کے بعد جب میں اپنے حواس میں آئی اور جو کچھ بھی دیکھا نہایت حیرت انگیز اور ناقابل یقین تھا۔ مجھے اب بھی لگتا ہے۔ جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔“
 ”کیا دیکھا تھا؟“ سکندر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کینڈہ وغیرہ خاموش بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ کھانا تو پیسے وہ سب لوگ بھول گئے تھے۔

”اس سے پہلے میں ان کھنڈرات کے بارے میں کچھ باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔“
 ”تایاب بولی۔“ میں جب اسٹیشن سے گاؤں کی طرف آ رہی تھی تو اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی نے ایک آدمی بھی میرے ساتھ کر دیا۔ میں اس کا نام بھول گئی ہوں لیکن شاید وہ پہلے ریلوے پولیس میں ملازم تھا اور آج کل گاؤں دیہاتوں میں وکٹروں پر مال چلائی کرتا ہے۔ بہر حال اس شخص نے راستے میں ان کھنڈروں کے بارے میں مجھے ایک کہانی سنائی تھی۔ رانی شپا کی کہانی جو ایک وسیع و عریض ریاست کی مالک تھی اور اس کی محل نما حویلی اسی نیلے پر تھی۔“

”ہاں یہ کہانی ہم نے بھی کئی بار سنی ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”لیکن ان کھنڈروں کے بارے میں بہت سی من گھڑت کہانیاں مشہور ہیں۔ قصے کہانیوں میں دلچسپی لینے والا کوئی بھی شخص آسانی سے کوئی پر اسرار کہانی گھڑ سکتا ہے لیکن ان کھنڈروں کے بارے میں جو بھی کہانیاں مشہور ہیں ان میں قابل یقین کوئی بھی نہیں ہے۔“
 ”لیکن میرا خیال ہے رانی شپا کی کہانی من گھڑت نہیں ہے۔ مبالغہ آرائی تو ہو سکتی ہے لیکن اس میں تھوڑی بہت حقیقت ضرور ہے۔“ تایاب نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ سکندر نے اسے گھورا۔
 ”گزشتہ رات اس کی کچھ تعریف ہوئی ہے۔“ تایاب نے کہا۔ ”یہ سچ ہے کہ وہ علاقہ کسی زمانے میں رانی شپا نامی کسی عورت کی ملکیت ہو کر آتا تھا۔ اسے ہندو سے عشق ہو گیا تھا جسے وہ ہونمان کا اوتار سمجھتی تھی اور اس سے بیک غلط ہوئی تھی جس سے اس کی ریاست تباہ ہو گئی اور اسے بھی زندہ جلا دیا گیا۔“

”تایاب!“ سکندر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔“

سانپ اس وقت بھی میرے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اگرچہ تاریکی میں تھا لیکن مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ سونے کی طرح چمکتا ہوا۔

جب اس سانپ نے رینگنا شروع کیا تو میں ایک بار پھر اس کے پیچھے چل پڑی۔ تنک سے راستوں سے ہوتے ہوئے وہ سانپ مجھے ایک اور کمرے میں لے گیا۔ یہ بہت بڑا ہال تھا۔ کمرہ چھت کو سارہ دینے کے لئے لاتعداد ستون تھے۔ ہر طرف کھڑیوں کے جالے لگے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں لٹری روشنی چیلی ہوئی تھی اور سامنے ایک چوڑے پر ہیرے جواہرات کا ڈیسر لگا ہوا تھا۔ اس ڈیسر کے پاس ایک ٹائمن کی مت بڑی مورفی تھی۔ اس ٹائمن کا رنگ بھی سنری تھا اور وہ چمن پھیلانے جیسی تھی۔ ٹایاب ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ سب لوگ پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ جیسے اس کی باتوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ ٹایاب کچھ دیر خاموش رہی پھر اٹھیں جانے لگی کہ اس تہ خانے میں اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ آخر میں وہ کمرہ رہی تھی۔ میں اس تہ خانے سے باہر نکلتا چاہتی تھی۔ لیکن ابھی دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم سے جان نکلی جا رہی ہو۔ میرے اندر کمرے رہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ جب دوبارہ آکھ کھلی تو میں اس ٹیلے کی ڈھلان پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ سٹرا سانپ بھی میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور پھر وہ سانپ رینگنا شروع کیا۔

میں اس دیرانے میں کھڑی رہی۔ سردی اور خوف سے میرا دل بھی کانپ رہا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کس جگہ پر ہوں۔ ہر طرف سے بجھڑیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں بزدل نہیں ہوں لیکن اس وقت میں خوف سے کانپ رہی تھی اور پھر میں محض اندازے کی بناء پر ایک طرف چلنے لگی۔ رات کی تاریکی آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔ پھر مجھے دور سے گاؤں کے مکان دکھائی دیئے۔ میں ٹھیک راستے پر آ رہی تھی۔ گاؤں میں داخل ہو کر گھروں میں گھومتی ہوئی یہاں پہنچ گئی۔

وہ سب خاموشی سے ٹایاب کی طرف دیکھنے لگے۔ زرمس اور عذرہ کے چہروں پر سنسنی کے عجیب سے تاثرات تھے۔ لیکن اور سکندر بھی عجیب سی کیفیت میں جھلا تھے۔

”اب تو مجھے بھی وہ سب کچھ خواب ہی لگتا ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”ایک اور بات بتائیے۔ کیا ان کھنڈروں کے حوالے سے کسی دلفینے کا بھی ذکر کیں ملتا ہے؟“

”کسی بھی کھنڈر کے حوالے سے ایسی باتیں گفزی جاسکتی ہیں۔“ سکندر نے کہا۔ ”ان کھنڈروں کے بارے میں بھی ایسی باتیں سننے میں آتی رہی ہیں۔ اب جان بتاتے ہیں کہ ان کی جوانی میں ایک پائلٹ کسی دلفینے کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ ایسے دیران کھنڈروں میں زیر پے پچھو اور سانپ بھی ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ہمارے دن تک ان کھنڈروں میں گھومتے اور کھدائی کرتے رہے۔ ان کے پاس کوئی نقشہ بھی تھا۔ پانچویں دن دو آدمیوں کو سانپ نے ڈس لیا۔ ایک تو وہیں مر گیا دوسرے کو کار میں ڈال کر فور ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ لیکن وہ بھی نہیں بچ سکا۔ پائلٹ کے باقی آدمی اسی روز بویا ہسپتال کر چلے گئے۔ وہ آخری پائلٹ تھی جو کسی دلفینے کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ اس کے بعد کسی کو خزانے کی تلاش میں اس طرف آتے نہیں دیکھا۔ اس سے پہلے سنا ہے کہ کئی لوگ خزانے کی تلاش میں یہاں آچکے ہیں لیکن یہاں کوئی خزانہ نہیں ہے۔ سب من گھڑت کہانیاں ہیں۔“

”لیکن اگر میں یہ کہوں کہ ان کھنڈروں میں کسی جگہ بہت سی قیمتی خزانہ موجود ہے تو آپ کا رد عمل کیا ہوگا؟“ ٹایاب نے کہا۔

”کیا.....؟“ وہ سب اچھل پڑے اور عجیب سی نظروں سے ٹایاب کی طرف دیکھنے لگے جیسے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

”یہ بچ ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”ان کھنڈروں کے نیچے کسی جگہ اتنا خزانہ موجود ہے جس کا آپ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھا ہے۔ میرے جواہرات“ سونے چاندی کے ظروف اور بہت کچھ۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ٹیلے پر میں اسی شہرے سانپ کے پیچھے چل پڑی تھی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں ان کھنڈروں میں داخل ہوئی تھی اور جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے اپنے آپ کو ایک تاریک تہ خانے میں ایک چوڑے پر پڑے ہوئے پایا۔ میں شاید وہاں سو گئی تھی۔ جب آکھ کھلی تو میرے چاروں طرف تاریکی تھی لیکن میں خود روشنی میں تھی۔ لٹری روشنی کا ایک حلقہ مجھے اپنی لپیٹ میں لے ہوئے تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کوئی جگہ ہے اور میں وہاں کیسے پہنچی تھی۔ وہ سنری

سے بند کر لیا۔ وہ بستر پر لیٹ کر سوئے گی کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے کیا واقعی وہ سب کچھ حقیقت ہے یا وہ کوئی خوفناک اور طویل خواب دیکھ رہی ہے۔ اسے یہ تو یاد تھا کہ وہ بین کی آواز سن کر مریض کمرے سے نکلی تھی اور سکندر نے جو کچھ بتایا تھا وہ اسے بالکل یاد نہیں تھا اور پھر اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے اپنے آپ کو نیلے کے دامن میں پڑے ہوئے پایا تھا۔ اس کے بعد اس کا ذہن پھر غوطہ کھایا تھا۔ اسے نیلے پر کھنڈروں کے تہ خانے میں ناگن والا کمرہ اور زر و ہوا پر کا ڈھیر تو یاد تھا۔ لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ وہ اس تہ خانے میں داخل کیسے ہوئی تھی اور باہر کیسے کئی تھی۔ اسے ابھی طرح یاد تھا کہ وہ ناگن والے کمرے میں فرش پر ڈھیر ہو گئی تھی۔ لیکن باہر آنا اسے یاد نہیں تھا۔ اسے باہر کون لایا تھا۔ کسی نے اسے اٹھا کر نیلے پر اس جگہ ڈال دیا تھا یا تنہا کیفیت میں اس سنہرے ناگ کے پیچھے چلے ہوئے باہر آئی تھی۔

وہ جیسے جیسے سوچتی اس کا ذہن الجھتا جاتا۔ کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کبھی تو وہ سوچتی کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھ کھلے گی تو یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

وہ ابھی یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ یوں لگا جیسے کسی نے انگلی سے بہت آہستگی سے دروازہ بجایا ہو۔ اس نے اٹھ کر بوٹ بننا دیا۔ دروازہ آہستگی سے کھلا اور زرگس اندر داخل ہوئی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر کے بوٹ چڑھا دیا۔

”جو بھی سنسنی خیز خبر ہے۔“ زرگس نے اس کے ساتھ پلنگ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”وہ کیا؟“ ٹایاب نے سوالیہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا اس سنہرے ناگ نے پھر کسی کو ڈس لیا ہے؟“

”نہیں۔“ زرگس بولی۔ ”چوبدری سعادت نے نور پور تھانے میں تمہاری آگشدرگی کی رپورٹ لکھوائی ہے۔ اس نے اپنی رپورٹ میں اس سنہرے ناگ اور عبدالرحمن کی موت کا حوالہ دے کر یہ بھی لکھوایا ہے کہ تم اس خطرناک سانپ کو اٹھا کر کھیتوں میں بھاگ گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے تم کسی حادثے کا شکار ہو چکی ہو۔ اس نے کہا ہے کہ پولیس تمہاری آگشدرگی کی تحقیقات کرے اور تمہیں مرود قرار دیا جائے۔“

”ٹایاب بہن۔“ بالا کر سکندر کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ ”بعض باتیں دراصل بڑی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ اس بات کی گواہی تو پورے گاؤں والے دے سکتے ہیں کہ تم اس خطرناک سانپ کو سپیروں کے سامنے سے اٹھا کر بھاگی تھیں اور پھر اس طرح غائب ہو گئی تھیں کہ ڈھونڈنے سے بھی تمہارا پتہ نہیں چلا تھا۔ سب لوگ تمہاری طرف سے باپوس ہو چکے تھے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ تمہیں سانپ نے ڈس لیا ہو گا اور تمہاری لاش کھیتوں میں کہیں پڑی ہوگی۔ لیکن مجھے اور میرے گھر والوں کو یقین تھا کہ تم زندہ ہو اور جہاں بھی ہوگی خیریت سے ہوگی۔ ہماری دعا میں پوری ہوئی اور تم خیریت سے واپس آ گئیں۔ لیکن تم جو کچھ بتا رہی ہو وہ بہت ہی حیرت انگیز اور ناقابل یقین سا لگتا ہے۔“

”ابھی آپ نے یہ بات تسلیم کی تھی کہ یہ علاقہ کسی زمانے میں رانی ٹپا کی ریاست میں شامل تھا اور اس کا ٹوٹی ٹال ٹکڑا اس نیلے پر تھا۔“ ٹایاب نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔ ”ان کھنڈروں میں خزانے کی باتیں بھی کھنص قفسے نہیں ہیں۔ لوگ کسی خزانے کی تلاش میں میاں آتے رہے ہیں۔“

”وہ تو درست ہے لیکن....“ سکندر چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اس سنہرے سانپ کو لے کر بھاگی ہو تو وہ ڈوٹے ڈوٹے اس نیلے پر پہنچ کر تھک کر گر گئی ہو۔ مان لیا کہ تم نے اس زہریلے سانپ کی جان بچائی تھی اور اسے احسان سمجھ کر اس نے تمہیں ڈسا نہیں۔ تم تھکن سے بے حال تھیں۔ وہیں پڑے پڑے سو گئیں اور یہ سب کچھ تم نے خواب میں دیکھا ہو۔“

”خواب۔“ ٹایاب نے اسے گھورا۔ ”نہیں سکندر بھائی وہ خواب نہیں تھا۔ ان کھنڈروں میں تہ خانے میں ہیں جو کچھ دیکھا وہ حقیقت تھا۔ ناگن کی وہ مورچی، وہ خزانہ.... سب کچھ میں نے جاکتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آپ کو یقین کرنا ہو گا کہ وہ خواب نہیں تھا۔“

”اگر وہ خواب نہیں تھا تو سب کچھ حیرت انگیز اور سنسنی خیز ہے۔“ سکندر بولا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسی جوبلی کے چمکناک پر دستک کی آواز سنائی دی۔ ”تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ.... کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم واپس آ گئی ہو۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔“

ٹایاب کھانا کھا چکی تھی۔ وہ اٹھ کر زرگس والے کمرے میں چلی اور دروازہ اندر

”پولیس مجھے مردہ کیسے قرار دے سکتی ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”کوئی چیز بھی کم یا چوری ہو جائے تو اس کی تحقیقات و تحقیقات میں بھی وقت لگتا ہے۔ میں تو ایک انسان ہوں۔ میری لاش دیکھے بغیر مجھے مردہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔“

”میں سب کچھ ممکن ہے۔“ زمرس نے کہا۔ ”لاکھ دو لاکھ روپے پولیس کی خزانہ دینا چہدہری سعادت پیسے غصے کے لئے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اتنی بڑی رقم مل جانے پر تو پولیس سامنے کھڑے ہوئے کسی غصے کے بارے میں بھی یہ ثابت کر سکتی ہے کہ وہ مرچکا ہے۔“ زمرس نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا معاملہ تو بڑا سیریس ہے۔ تم ان کی جائیداد میں آدھا حصہ طلب کر رہی ہو اور اس سلسلے میں عدالت میں کیس بھی چل رہا ہے اگر یہ لوگ جنہیں مردہ ثابت کر دیں تو وہ کیس ختم ہو جائے گا اور ان کی جائیداد تقسیم ہونے سے بچ جائے گی۔“

”ایک زندہ انسان کو کیسے مردہ ثابت کیا جاسکتا ہے؟“ ٹایاب نے اسے گھورا۔

”اس کے بہت سے طریقے ہیں۔“ زمرس نے کہا۔ ”چہدہری سعادت کے آدمی اب بھی تمہاری تلاش میں ہیں۔ کئی آدمی مختلف ہسپتالوں کی طرف جا کر تمہارا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ تو تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم ان کھنڈروں سے نکل کر خیریت سے یہاں پہنچ گئیں اور کسی نے جنہیں دیکھا نہیں۔ اگر تم کسی کی نظروں میں آجاتی تو جنہیں ختم کر دیا جاتا اور تمہاری موت کو حادثہ ثابت کرنا مشکل نہ ہوتا۔“

”شاید تم ٹھیک کر رہی ہو۔“ ٹایاب کے منہ سے گمراہی نکل گیا۔ اس کا ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ وہ سیدھی سادھی بات کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ ”جنہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے زمرس کی طرف دیکھنے لگی۔

”انور بھائی نے۔“ زمرس نے کہا۔ ”وہ ہمارے تایا کے بیٹے دیکل ہیں اور نور پوری میں رہتے ہیں۔ وہ کسی آدمی کی ضمانت کے سلسلے میں تھانے گئے تھے۔ اسی وقت چہدہری سعادت بھی تھانے پہنچا تھا اور کافی دیر تک وہاں بیٹھا تھا۔ ان سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اور بھائی کا کہنا ہے کہ وہ دوسری میز پر سب انسپکٹرز کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور انہوں نے چہدہری سعادت کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ ان باتوں میں چونکہ اباجان اور سکندر بھائی کا نام بھی آیا تھا اس لئے انور بھائی اپنا کام ہو جانے کے باوجود وہاں بیٹھے رہے تھے۔

ان کی چہدہری سعادت کی طرف تھی۔ اگر سعادت انہیں دیکھ لیتا تو ایسی باتیں کبھی نہ کرتا۔ پھر تھانیدار اسے لے کر کہیں چلا گیا تو انور بھائی بھی تھانے سے باہر نکلے اور اپنے کام ٹھانے کے بعد ہمیں یہ سب کچھ بتانے کے لئے یہاں آئے ہیں۔“

”کیا انہیں بتا دیا ہے کہ میں یہاں ہوں۔“ ٹایاب نے پوچھا۔

”سکندر بھائی نے انہیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ تم یہاں ہو۔“ زمرس نے جواب دیا۔

”تمہارے بارے میں عام طور پر اب بھی یہی سمجھا جا رہا ہے کہ ہمیں سانپ نے ڈس لیا ہو گا اور تمہاری لاش کیمٹوں میں پڑی ہوگی۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کو یقین ہے کہ تم زندہ ہو۔ لیکن تمہاری گمشدگی ان کے لئے معرہ بنی ہوئی ہے۔ ایسے لوگ بہر حال تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔“

”گھوڑا صرف چہدہری فیملی اور اس کے حواریوں کو یقین ہے کہ میں مرچکا ہوں یا وہ لوگ میرے مرنے کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔“ ٹایاب نے کہا۔

”ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ زمرس نے کہا۔ ”تم یہیں بیٹھی رہو۔ میں دیکھ کر آتی ہوں اور کیا باتیں ہو رہی ہیں۔“

زمرس چلی گئی۔ اس نے دروازہ بجھوڑ دیا تھا۔ ٹایاب بند پر لیٹ گئی اور اس تازہ ترین صورت حال کے بارے میں سوچنے لگی۔ چہدہری سعادت بہت جلد کل گیا تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہر صورت میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ٹایاب مرچکا ہے۔ اس کے لئے وہ پولیس کا سامرا لے رہا تھا۔ اس روز ٹایاب پولیس آفسر سے ملی تھی تو وہ اسے بہت معقول آدمی لگا تھا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ عبدالغنی راشدہ اور ہوائنٹنس میں عبدالرشید کے کیس کی تحقیقات کرے گا۔ لیکن ٹایاب کو یہ بھی اندازہ تھا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ اگر پولیس آفسر چہدہری سعادت کے شہری جال میں آگیا تو پھر اس سے صحیح رخ پر تحقیقات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن ٹایاب نے بہر حال یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ان تینوں بے گناہوں کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لے گی۔ خواہ اس کے لئے اسے کیسے ہی حالات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ وہ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے سوچتی۔

اسے شام چھ بجے عذرہ نے بگایا تھا۔ ٹایاب کے داغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ وہ

کافی دیر اس طرح بستر پڑی رہی۔ پھر اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ غدرہ نے اس کے لئے چائے بنا دی اور وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔ ملک صلاح الدین بھی کیتوں سے آچکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی کمرے سے نکل کر ٹایاب کے پاس بیٹھ گئے۔

”کیسی طبیعت ہے اب بیٹی!“ انہوں نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو ٹھیک ہوں انکل۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”سکندر نے مجھے تمہارے بارے میں کچھ عجیب و غریب سی باتیں بتائی ہیں۔“ ملک صاحب نے کہا۔ ”مجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس قسم کی باتیں پہلے بھی سننے میں نہیں آتی تھیں۔“

”باتیں چاہے عجیب و غریب ہوں یا انوکھی۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”حقائق کو تو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا نا انکل۔“

”یہ تو درست ہے بیٹا۔ میں بھی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر رہا۔“ ملک صاحب بولے ”گڈوں کے سمت سے لوگوں نے دیکھا تھا کہ تم پیروں کے سامنے سے وہ خطرناک سانپ اٹھا کر بھاگ گئی، دو اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تم زندہ سلامت میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہو اور اس سانپ نے تجس کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ تو ایسی حقیقت ہے جس سے کسی صورت بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر ان کھنڈروں کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا ہے وہ کچھ عجیب سا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ حقیقت ہو۔ مگر بعض حقائق ایسے ہوتے ہیں جن پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”لیکن میں نے جو کچھ بتایا ہے وہ جو فیصد درست ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”کل صبح گھر سے نکلنے کے بعد سے آج صبح واپس آنے تک اگرچہ میرے ساتھ بعض عجیب واقعات پیش آئے ہیں جن کے بارے میں میں خود بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن کھنڈروں کے نیچے تہہ خانے میں میں نے جو کچھ بھی دیکھا ہے اسے نہیں جھٹلایا جاسکتا۔ مثلاً رانی ٹنپا کی کمانی مجھے اسٹیشن سے یہاں آتے ہوئے راستے میں اس آوی نے سنائی تھی جو مجھے چھوڑنے آیا تھا۔ تہہ خانے میں اس پر اسرار آواز نے اس کمانی کی تصدیق کر دی۔ مجھے یہ کمانی اس باگن نے سنائی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ بندر اب بھی اس

علاقے میں موجود ہے جس کی وجہ سے رانی ٹنپا اور اس کی ریاست تپاں کا شکار ہوئی تھی۔ یہاں ایک دو باتوں کے سلسلے میں میں بھی ابھن کا شکار ہوں۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”مثلاً میرے کانوں میں سہرے ناگ کی سرگوٹیوں کے بارے میں نرمی نے نیلی بیٹی کا سہارا لیا اور یہ قہجرہ پیش کی کہ سانپ اور میرے دماغ کی لہروں کی فریکوئنسی مل گئی ہوگی۔ مان لیا کہ ایسا ہوا ہوگا۔ مگر تہہ خانے میں وہ نسوانی سرگوٹیاں۔ بیٹنا وہ ناگن مجھ سے مخاطب تھی۔ لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو پتھر کی موتی تھی۔ وہ سوچ نہیں سکتی۔ اس لئے اس کے دماغ کی لہروں کی فریکوئنسی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب ہے کوئی پراسرار قوت بھی ان معاملات میں ملوث ہے۔ ایک اور بات بھی میرے لئے ابھن کا باعث بنی ہوئی ہے۔ مجھے یہ تو یاد ہے کہ میں اس ناگ کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی کھنڈروں تک گئی تھی۔ لیکن مجھے یہ بائبل یاد نہیں کہ میں ان کھنڈروں کے نیچے کیسے گئی اور پھر باہر کیسے آئی؟“

”مجھے تو یہ سب کچھ ہی پراسرار لگ رہا ہے۔“ ملک صاحب نے کہا۔ ”بہر حال‘ چودھری سعادت کے حوالے سے اب تک جو صورت حال سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے تجس مرہہ تسلیم کر لیا ہے اور یہ مشہور بھی کر دیا ہے۔ کہ تم مرچکی ہو۔ وہ پولیس سے بھی تساری موت کی تصدیق کرنا چاہتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب تجس زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تجس زندہ دیکھ کر وہ اس بات نہ جو جائے گا اور ہو سکتا ہے وہ تم پر کوئی وار کرنے کی کوشش بھی کرے۔“

”آپ مطمئن رہے انکل۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چودھری سعادت کچھ بھی کر لے۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اب میرے خلاف اس کے عوام کیا ہیں۔ لہذا میں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب اسے جین سے بیٹھے نہیں دوں گی۔ میں پورے دھوکے سے کہہ سکتی ہوں کہ اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی اس کی بیوی راشدہ اور ہوائنسن مین عبدالرشید کے قتل میں اس کا ہاتھ ہے۔ یہ پولیس کو چاہے کتنا بھی کھلا دے۔ میں اس کیس کی تحقیقات کرانے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کروں گی۔“

”ویسے میں سمجھتا ہوں کہ تم جب تک ہمارے ہاں ہو وہ کوئی ممانعت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ لیکن اس صبحے آوی کا کوئی مجبورہ نہیں ہے۔ ناگت تو دماغی اصل ایسے

یہاں۔ لیکن رانی شہا ایک رازش کے جال میں پھنس گئی۔ لوگ رانی کو بہت نیک اور پاکباز سمجھتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ رانی پورن ہاشمی کی رات کس طرح گزارتی ہے تو انہوں نے رانی کے عمل کو آگ لگا کر اسے زندہ جلا دیا اور بھریرہ ریاست بھی تباہ ہو گئی۔ تھیں معلوم ہے پرانے زمانے میں لوہاریں کی حویلیاں اور راجہ مہاراجاؤں اور شہنشاہوں کے محلات بہت مشہور ہوا کرتے تھے۔ یہ محلات اور حویلیاں دراصل سازشوں کے مرکز ہوتے تھے۔ ان میں ایسے ایسے پراسرار اور خفیہ راستے اور سرنگیں ہوتی تھیں کہ عام آدمی توہر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ راجے، مہاراجے اپنے خزانے ان خفیہ تہ خانوں میں چھپا کر رکھتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی راجہ کو قتل کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا جاتا مگر اس کا خزانہ پوشیدہ رہتا اور نیلے والے کھنڈروں کے نیچے تہ خانے میں وہ خزانہ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خزانہ رانی شہا ہی کا ہوگا۔ اور اس نے تہ خانے میں چھپا رکھا تھا۔ رانی اور اس کی ریاست تو ختم ہو گئی مگر وہ خزانہ اب بھی تہ خانے میں موجود ہے اور شیتا ناہی ناگن اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ ناگن شیتا اور رانی شہا میں شاید کوئی معاہدہ ہوا ہوگا۔ اسی لئے تو وہ ناگن کہہ رہی تھی کہ اب وہ آدھے خزانے کی مالک بن چکی ہے جس میں سے کچھ حصہ اس نے مجھے پیش کر دیا تھا۔ اگر وہ اصل خزانے کا ایک معمولی سا حصہ تھا تو مجھے حیرت ہے کہ اصل خزانہ کتنا بڑا ہوگا۔“

”اس نے وہ خزانہ آپ کو دے دیا تھا۔“ عذرہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو آپ وہ خزانہ لے کر کیوں نہیں آئیں۔“

”مجھے تو خود معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ خزانہ کیسے لائی۔ ویسے۔۔۔“

نایاب ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”ویسے اس ناگن نے مجھے کہا تھا کہ میں چپ چاہوں خزانہ لے جا سکتی ہوں۔“

”کاش! آپ کو وہاں کا راستہ معلوم ہوتا ہے۔“ عذرہ نے گمراہ ساں بھرتے ہوئے کہا۔ نایاب کچھ کہنا چاہتی تھی کہ حویلی کے دروازے پر دنگ کی آواز سنائی دی۔ زمرس اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئی۔

وہ سکندر تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد ملک صاحب بھی آگئے۔ زمرس تو اٹھ کر اپنی بھابھی کے ساتھ کھانے وغیرہ کی تیاری کرنے لگی اور عذرہ، نایاب کا داغ چائے گئی۔

یہ لوگ ہوتے ہیں جو موقع ملنے ہی ڈس لیتے ہیں۔ بہر حال، تھیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ملک صاحب کہتے ہوئے اٹھ گئے۔ اس وقت مغرب کی اذان کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ ”یکندہ بیٹے میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ سکندر آجائے تو اسے کہنا وہ گھر ہی رہے۔“

ملک صاحب حویلی سے باہر چلی گئے۔ ان کے چاہنے ہی عذرہ نے حویلی کا باہر والا دروازہ بند کر دیا تھا۔

”کیا مجھے اسی طرح چھپ کر رہنا پڑے گا۔“ نایاب نے زمرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سکندر بھائی نے کہا تھا کہ آج کے دن تم پر کسی کی نظر نہیں پڑنی چاہئے۔“ زمرس نے مسکراتے ہوئے۔ ”چہ نہیں ان کے ذہن میں کیا ہے۔“

”ہاں یہاں بہت پھرجو رہے ہیں۔ چلے اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“ پھرجو واقعی بہت ہو رہے تھے۔ وہ اٹھ کر کمرہ میں آگئیں۔ عذرہ کہہ کرید کہ ان کھنڈروں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

”اس ناگن کو دیکھ کر آپ کو ڈر نہیں لگا تھا نایاب بائی؟“

”ڈر لگا تھا۔ لیکن یہ جان جا کر اطمینان ہوا کہ وہ ناگن اصل نہیں پتھر کی مورٹی تھی۔“ نایاب نے جواب دیا۔

”کیا واقعی آپ نے وہاں اتنا بڑا خزانہ دیکھا تھا؟“ عذرہ نے دوسرا سوال داغ دیا۔

”ہاں بھئی۔ بہت بڑا خزانہ تھا۔ ڈھیر لگا ہوا تھا۔ سونے کے زیورات بھی تھے۔ اسے بڑے بڑے جگمگاتے ہوئے بھرے اور ایک تاج بھی تھی بہت ہی خوبصورت۔ لعل و جواہر جڑے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ رانی شہا کا تاج ہوگا۔“ نایاب نے کہا۔

”یہ رانی شہا کون تھی بائی۔“ عذرہ نے پوچھا۔ ”ہم نے تو اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔ ہاں البتہ یہ سنا تھا کہ ان کھنڈروں میں کوئی خزانہ چھپا ہوا ہے۔“

”رانی شہا۔“ نایاب کے منہ سے گمراہ ساں نکل گیا اور پھر اسے وہ کہانی سناتے ہی جو گاؤں کی طرف آتے ہوئے اس نے اشیش بن مشر عبدالحی کے دوست سے سنی تھی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”سنا ہے۔ یہ بہت بڑی ریاست ہوا کرتی تھی۔ بڑی خوشحالی تھی

آٹھ بجے تک کھانا کھا لیا گیا۔ کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد سکندر کہیں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

”چلو، ٹایپ بی بی!“ جمیں چوہدری سعادت کی دعوت میں لے چلوں۔ سنا ہے اس نے نور پور سے باورچی کو لاکر دیکیں بکوائی ہیں۔“ سکندر نے کہا۔
”لیکن آپ نے تو کھانا کھالیا ہے۔ دعوت میں جاکر کیا کریں گے اور پھر میں کیسے چلوں۔ مجھے تو آپ نے صبح سے گاؤں والوں سے چپا رکھا ہے۔“ ٹایپ نے کہا۔

”اسی لئے تو چھپایا گیا تھا۔“ سکندر نے جواب دیا۔ ”چوہدری سعادت آج گاؤں والوں کے سامنے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ کہ تم مرہٹے ہو۔ اس نے نور پور کے تھانیدار کو بھی دعوت میں بلایا ہے۔ لوگوں کی باتوں سے وہ تھانیدار پر بھی یہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ کہ تم اب اس دنیا میں نہیں رہی ہو۔ تھانیدار کی رپورٹ سے وہ مقدمے پر بھی اثر انداز ہونا چاہتا ہے۔“

”اگر وہ تھانیدار میرے بارے میں ایسی کوئی رپورٹ دے گا تو دنیا کا سب سے بڑا احتیاج ہوگا۔“ ٹایپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال۔ میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ مجھے تیار ہونے میں چند منٹ لگیں گے۔ اپنے سرسال جا رہی ہوں۔ کپڑے تو ڈھنگ کے ہونے چاہئیں نا۔“ آخری الفاظ اس نے مسکراتے ہوئے کہے تھے۔

”جمیں میرے ساتھ نہیں چلنا۔“ سکندر نے کہا۔ ”میں ابھی جا رہا ہوں۔ تم آؤ گے گھنٹے بعد آ جانا۔ دعوت کا انتظام حویلی میں کیا گیا ہے۔ تم وہیں آ جانا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ چلنے میں بھی آتی ہوں۔“ ٹایپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
سکندر چلا گیا۔ اس کے تقریباً“ پندرہ منٹ بعد ٹایپ نے زمر سے کہڑوں کا ایک جوڑا لے لیا اور ان دونوں کو کمرے سے نکال کر کہڑے تبدیل کرنے لگی اور پھر ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ درواگی کے لئے تیار تھی۔ اس نے ایک چادر اس طرح اوڑھ لی تھی کہ اس کے کہڑے بھی چھپ گئے تھے اور چوہ بھی۔ صرف آنکھیں برہنہ تھیں۔

”خیال رکھنا ٹایپ۔“ زمر نے کہا۔ ”اگر کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو فوراً“ وہاں سے نکل آنا۔“

”تم فکر مت کرو مائی ڈیئر!“ ٹایپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک چوہدری

سعادت تو کیا اس جیسے دس آدمی بھی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

وہ حویلی سے باہر آگئی۔ زمر اس اندر دھڑکے میں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ گلی کے موڑ پر پہنچ کر ٹایپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے دوسری گلی میں مڑ گئی۔

ملک صاحب والی گلی میں دو بنگلوں پر بلب لگے ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے وہ گلی روشن تھی۔ لیکن دوسری گلی میں اندھیرا تھا۔ اس سے آگے والی گلی میں بھی تاریکی تھی۔ وہ کئی مرتبہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے پہنچی تھی۔ راستے میں دو چار آدمیوں کا سامنا بھی ہوا تھا۔

کئی گلیاں گھومنے کے بعد ٹایپ چوہدری امانت علی کی حویلی والی گلی میں آگئی۔ حویلی کے چھانک کے سامنے دو سو واٹ کا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی گلی میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ گلی میں پولیس کی جیب بھی کھڑی تھی جس کا مطلب تھا کہ نور پور کا تھانیدار بھی آیا ہوا تھا۔

حویلی کا چھانک کھلا ہوا تھا۔ اتفاق سے اس وقت چھانک پر کوئی نہیں تھا لیکن اندر بہت سے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ٹایپ چھانک میں داخل ہو گئی۔

لان میں دریاں جمی ہوئی تھیں۔ ان پر چالیں بچاس آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے چند کرسیاں تھیں جن پر گاؤں کے وہ معززین بیٹھے ہوئے تھے جو چوہدری قبیلے کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ تھانیدار بھی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ دوسری کرسی پر چوہدری سعادت نظر آ رہا تھا۔ لان میں تین چار بنگلوں پر لگے ہوئے پلڑے پر بلب روشن تھے۔

یہ لوگ بہت پہلے کھانا کھا چکے تھے اور اب باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور چوہدری سعادت ساتھ والی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھانیدار سے کچھ کہہ رہا تھا۔ تھانیدار سادہ لباس میں تھا۔ چند منٹ بعد چوہدری سعادت اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”بھائیو! تھانیدار صاحب یہ جانتا چاہے ہیں کہ کل اس گاؤں میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ آپ میں سے کوئی ایک آدمی اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور تفصیل سے بتائے۔“

کہا۔

”تم کون ہو بی بی۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ ثایاب زندہ ہے؟“ یہ سوال اس سے تھانیدار نے کیا تھا۔

”تم تو قانون کے محافظ ہو تھانیدار می۔“ ثایاب نے کہا۔ اس کا ہات کرنے کا انداز دہشتوں جیسا ہی تھا۔ ”بے گناہوں اور مظلوموں کو تحفظ فراہم کرنا تمہاری ذمہ داری ہے لیکن انوس کی بات تو یہ ہے کہ دولت کی چمک نے تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے اور تم اپنے فرائض بھول گئے ہو۔“

”بی بی تم ہو کون؟“ تھانیدار بولا۔ ”تم مجھ پر الزام لگا رہی ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی کی ہو۔“

”تمہاری یہاں موجودگی ثابت کرتی ہے کہ تم اپنے فرائض بھول گئے ہو۔“ ثایاب نے کہا۔

”کیا یہ غلط ہے کہ یہ چہدہری سعادت آج تمہارے پاس آیا تھا اور ثایاب کی موت کے بارے میں رپورٹ تیار کرنے کے لئے اس نے جیس کوئی بڑی رشوت دی تھی اور تم اپنا فرض بھول کر یہاں چلے آئے۔ اس سے ایک روز پہلے ثایاب بھی تم سے ملی تھی اور اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی، اس کی بیوی راشدہ اور ہوائنٹن مین عبدالرشید کے بارے میں جیس کچھ حقائق بتائے تھے۔ لیکن اس معاملے میں تو تم نے کچھ نہیں کیا اور ثایاب کے خلاف اس کی موت کے ثبوت اکٹھا کرنے کے لئے یہاں چلے آئے۔ اس کے بعد بھی تم کہتے ہو کہ تم نے کبھی کسی کے خلاف زیادتی نہیں کی۔“

”مجھے نہیں یاد پڑتا کہ ثایاب نام کی کوئی عورت میرے پاس آئی ہو۔“ تھانیدار نے کہا۔ ”تمہارے ساتھ اگر کسی نے کوئی زیادتی کی ہو، جیس اگر کوئی شکایت ہے تو تمہارے آکر مجھے بتاؤ۔ میں قانون کے مطابق کارروائی کروں گا۔“

”مجھے شکایت یہ ہے کہ میرے زندہ ہونے ہوئے مجھے مرہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔“ ثایاب نے کہتے ہوئے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

ایک لمحہ کو اس طرح خاموشی چھا گئی جیسے اس سب کو سانپ سوگھ گیا ہو۔ اس کا چہرہ دیکھ کر سب ہی جو بچہ رہ گئے تھے اور چہدہری سعادت کی حالت تو ایسی تھی جیسے سکتہ ہو گیا

تین چار آدمی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چہدہری نے ان میں سے ایک آدمی کو کھڑے رہنے دیا اور باقی سب بیٹھ گئے۔ اس آدمی کا نام عبدالغفور تھا۔ اس نے عبدالرحمن کو سانپ کے ڈسنے سے لے کر ثایاب کے سانپ اٹھا کر بھاگنے والے تک کے واقعات کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتایا۔

ثایاب ایک طرف کھڑی رہی تھی۔ اس نے ایک کرسی پر سکندر کو بھی دیکھ لیا تھا جو خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ عبدالغفور کے خاموش ہونے کے بعد کچھ اور لوگ بھی اٹھ اٹھ کر اس واقعہ کے بارے میں بتاتے رہے۔ ہر شخص کا زور اسی بات پر تھا کہ ثایاب اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

”میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ ملک سکندر کھڑا ہو گیا۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے وہ کہہ رہا تھا۔ ”لاش دیکھ بغیر کسی کی موت کی تصدیق کر دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ثایاب زندہ ہے اور چہدہری! وہ چہدہری سعادت کی طرف مڑ گیا۔ ”تم ثایاب کی دشمنی میں اس حد تک آگے نہ چلے جاؤ کہ واپسی تمہارے لئے مشکل ہو جائے۔“

”ملک می!“ چہدہری سعادت نے کہا۔ ”تم تو ہلاچہ ثایاب کی طرف داری کر رہے ہو۔ مان لیا کہ تم اسے بن کہتے تھے اور بن ہی کی طرح اسے چاہتے تھے۔ مگر حقیقت سے آنکھیں تو نہ چراؤ ملک می! اکل جو کچھ ہوا تمہارے سامنے ہوا۔ بلکہ تم خود ہی تو اسے پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگے تھے اور کل سارا دن اسے تلاش بھی کرتے رہے۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو مل نہ جاتی۔ یہ سب لوگ غلط تو نہیں کہہ رہے نا۔ ثایاب کی کمائی تو سمجھو اب ختم ہی ہو چکی ہے۔ اب اسے بھول جاؤ۔“

”کمائی ختم نہیں ہوئی بلکہ اب شروع ہوئی ہے۔“ ثایاب نے کہا۔ وہ لکڑی کے ایک پل کے ساتھ کھڑی تھی جس پر بلب جل رہا تھا۔

”کون ہو تم بی بی۔ ذرا آگے تو آؤ۔“ چہدہری سعادت نے کہا۔ تھانیدار بھی اس طرف دیکھنے لگا تھا۔ ثایاب پل کے قریب سے ہٹ کر چند قدم آگے بڑھ گئی۔

”ملک بی ٹھیک کہتے ہیں کہ ثایاب مری نہیں زندہ ہے۔“ اس نے ایک جگہ رک کر

گردن میں پھانسی کا پھندا لگ جائے گا۔ ان سب لوگوں کے سامنے تم اسے قتل کرنے کی دھمکی دے رہے ہو۔ اویس عقل کے باخن لو بیٹھے آویں! اب بھی وقت ہے۔ اپنے آپ کو منہالو۔ اسے اپنا کچھ کر عزت و احترام سے گھر میں لے آؤ۔ اویس نے یہ تو تمہارے بھونے بھائی کی امانت ہے۔ اس کی عزت کرو۔۔۔ اس کے محافظ بنو۔۔۔ پرہیز۔ تم تو اس کے دشمن بن گئے ہو اور میری ایک بات سن لو۔۔۔ تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ جذبات میں اکر اپنا ہی نقصان کر چکے ہو۔ یہ تمہارے گھر کی عزت ہے۔ اس کی حفاظت کرو۔

”ملک جی ٹھیک کہتے ہیں۔“ سامنے درہ پر بیٹھے ہوئے سراج نے اٹھ کر کہا۔

”آہو جی۔“ غلام محمد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”جھوٹی بی بی سارے پنڈ کی عزت ہے۔ اس نے آج تک کوئی ایسی بات نہیں کی۔ جس سے اس پنڈ یا آپ کے گھر کی عزت پر کوئی حرف آیا ہو۔ ملک جی ٹھیک کہتے ہیں۔ ساری نارائنگیاں بھلا دو چوہری اب چھوڑ دو ساری باتیں۔“

”ہائیں میں نے شروع کی تھیں یا اس نے۔“ سعادت نے ٹایپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”چانیادو کے لئے مقدمہ میں لے کیا تھا یا اس نے۔“

”اگر مجھے میرا حق مل جاتا تو میں کبھی عدالت کا رخ نہ کرتی۔“ ٹایپ نے کہا۔

”لیکن تم تو اب بھی نہ تو مجھے اس گھر کی بوسانے کو تیار ہو اور نہ ہی مجھے میرا حق دینے پر آمادہ ہو۔ اس کے برعکس تم میرے خلاف سازشوں میں مصروف ہو۔ مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے ہو۔ اس کے لئے تم نے کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ تم نے اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی اور اس کی بیوی کو زندہ جلاوا دیا۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ اس رات انہوں نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی تھی اور تمہارے آدمیوں کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور پھر ہوائنٹس میں عبدالرشید کا جرم یہ تھا کہ میں نے اس سے ملاقات کر کے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا تھا جنہوں نے اسٹیشن ماسٹر کے گھر کو ہلگ لگائی تھی۔ اس نے عبدالرحمن کو اس کے گھوڑے کی وجہ سے پہچان لیا تھا۔ میں عبدالرشید کو پولیس کے سامنے پیش کرنا چاہتی تھی۔ لیکن جنس میری اور عبدالرشید کی ملاقات کا پتہ چل گیا اور تم نے اسے بھی ختم کروا دیا۔ کب تک بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلنے رہو گے۔ اب بھی وقت ہے۔ ہمیں رک جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اس دلدل میں تم اس طرح پھنس جاؤ کہ

ہو۔ وہ پلک جھپکے بغیر ٹایپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھانیدار کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

”اب آپ کو یاد آیا کہ ٹایپ نام کی کوئی عورت آپ کے پاس آئی تھی یا نہیں؟“

ٹایپ نے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھانیدار ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بی بی! اگر آپ کو مجھ سے یا کسی اور سے کوئی شکایت ہے تو کل صبح نور پور تھانے آجائیے۔“ وہ مزید کچھ کے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے چھانک کی طرف چل پڑا۔ چوہری سعادت بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ تیز تیز لمبے میں تھانیدار سے کچھ کہہ رہا تھا مگر تھانیدار کو شاید اب اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا حویلی سے باہر نکل گیا۔

چوہری سعادت جب واپس آیا تو پھیرا ہوا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ خنخوار نظروں سے ٹایپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”دیکھ لیا سعادت۔“ ملک سکندر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کل بھی تم سے کہا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کہو جس کا تمہارے پاس کوئی ثبوت نہ ہو۔ مگر تم تو اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتے ہو نا۔ تم نے یہ یقین کر لیا تھا کہ ٹایپ مرچکی ہے۔ اور اس کے مرنے کی خوشی میں تم نے جشن بھی منا ڈالا۔ دیکھ لو۔۔۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ ٹایپ تمہارے سامنے زندہ سلامت کھڑی ہے۔“

”یہ۔۔۔ یہ سب تمہاری سازش ہے۔“ چوہری سعادت اس کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔ ”تم نے مجھ سے دشمنی کی ہے۔ جنسیں معلوم تھا کہ ٹایپ زندہ ہے۔“

”اسی لئے تو کل شام سے جنسیں کہہ رہا تھا کہ کوئی ایسی بات مت کرنا جس پر بعد میں نرمندگی اٹھانی پڑے۔ مگر تمہارے دماغ میں تو کچھ اور ہی سٹائی ہوئی تھی۔ تم تو کل تھانے میں اس کی گمشدگی اور موت کی رپورٹ لکھوانے چلے گئے تھے۔ تمہاری تو سمجھ میں کوئی بات ہی نہیں آئی۔ اب شرمندہ ہو رہے ہو نا ان لوگوں کے سامنے۔ تم نے تو ان لوگوں کو بھی ذلیل کر دیا رکھ دیا ہے۔“

”میں۔۔۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ سعادت چیخا۔

”تم پھر جذباتی ہو رہے ہو۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”اگر ٹایپ کچھ ہو گیا تو تمہاری

لکنا مشکل ہو جائے۔

”بھولے الزامات لگا کر مجھے ان لوگوں کے سامنے ذلیل کرنا چاہتی ہو؟“ چوہدری سعادت دھاڑا۔ ”اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ گاؤں والوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے تم جو ڈرامے کر رہی ہو میں وہ بھی جان گیا ہوں۔ تم نقلی سانپ اٹھا کر بھاگ گئی اور کسی جگہ چھپی رہیں۔ اس ڈرامے سے تمہارا مقصد یہی تھا تاکہ تم لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکو؟ لیکن اب میں یہ قصہ ہی ختم کر دوں گا۔ مجھے پچاسی بھی لگ جائے تو پروا نہیں۔ مگر ہمیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ حصے میں دھاڑتا ہوا ٹایاب کی طرف بڑھا۔ بھری مغل میں اتنی باتیں سننے کے بعد کوئی بھی محض اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا اور پھر یہاں تو معاملہ پرانی دشمنی کا تھا۔ سعادت کی قوت برداشت جواب دے سکی تھی۔ اسے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ اگر اس کے ہاتھوں ٹایاب کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو یہ سارے لوگ اس کے خلاف گواہی دیں گے اور وہ قانون کے قہقے میں پھنس جائے گا۔

دو تین آدمیوں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ انہیں دھکے دے کر گراتا ہوا حملہ آور انداز میں ٹایاب کی طرف بڑھ گیا۔ ٹایاب اس سے تقریباً ”دس گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ چوہدری سعادت اس سے دو تین گز دور رہا تھا کہ ایک پھنگار کی سی آواز سنائی دی اور پھر ایک آدمی کی چیخ سنائی دی۔

”سانپ..... سانپ۔“

سب لوگ اس طرف دیکھنے لگے۔ سنہری سانپ جوہلی کی دیوار سے اتر کر بڑی تیزی سے رینگتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ چوہدری سعادت اپنی جگہ پر رک گیا۔ اس نے بھی سانپ کو دیکھ لیا تھا۔

”یہ دی سانپ ہے۔“ ایک آدمی چیخا۔ ”بھاگو۔“

لوگ خوف کے مارے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے جوہلی سے باہر چلے گئے۔

سنہری سانپ تیزی سے رینگتا آ رہا تھا۔ چوہدری سعادت بھی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کی نظریں سانپ پر جی ہوئی تھیں سانپ رینگتا ہوا ٹایاب کے سامنے آ

گیا اور اس کے پیروں کے قریب کھڑی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کا پھین پھیل گیا اور وہ چوہدری سعادت کی طرف دیکھتے ہوئے پھن کو آہستہ آہستہ حرکت دینے لگا۔ چوہدری سعادت پھن کی نظروں سے اس سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پینے کے قطرے چپکنے لگے۔ لوگ دور کھڑے غیر یقینی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ خطرناک سانپ ٹایاب کے سامنے اس طرح پھن پھیلانے بیٹھا تھا جیسے کوئی محافظ اپنے آقا کی حفاظت کے لئے تیار اور مستعد کھڑا ہو۔

○ نوویں قسط

جوہلی میں موجود لوگ حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ گھر کی خواتین بھی کمرؤں سے نکل کر برآمدے میں آگئی تھیں اور سنہری سانپ کو ٹایاب کے قدموں میں بیٹھے دیکھ رہی تھیں۔

”مجھے تو پہلے ہی اس لڑکی پر شبہ تھا۔“ چوہدرانی کی آواز سنائی دی۔

”یہ تو ناگن ہے ناگن..... خدا جانے میرا بیٹا کس طرح اس کے جال میں پھنس گیا تھا۔ یہ تو ہے ہی ناگن..... مار دو اسے..... گولی مار دو۔“

چوہدری سعادت نے جی ند کی یہ آواز سن لی۔ وہ ٹایاب سے دو تین گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کا جسم پیسے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے دو تین قدم پیچھے ہٹے ہوئے جب سے پستول نکال لیا اور ہاتھ آگے بڑھا کر سانپ کا نشانہ لینے لگا۔ اس کا ہاتھ کاپ رہا تھا۔

”رک جاؤ چوہدری کیا کر رہے ہو یہ۔“ ملک سکندر چیخا اور تیزی سے سعادت کی طرف بڑھا۔

”میرے قریب مت آنا۔ میں گولی مار دوں گا اس ناگن کو بھی۔“ چوہدری سعادت نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

لیکن اس سے پہلے کہ سعادت ٹرانگپر دباتا سنہری سانپ پھنگارتا ہوا تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ سعادت نے ٹرانگپر دبا دیا۔ اس کا ہاتھ کاپ رہا تھا۔ گولی سانپ سے تین چار فٹ دور زمین پر گئی۔ سانپ پھنگارتا ہوا سعادت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سعادت اُلے

”آئیے سکدر بھائی۔“ نایاب نے ملک سکدر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ملک سکدر بھی خاموش کھڑا حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے نایاب کے ساتھ چل پڑا۔

حویلی کے گیٹ کے قریب کھڑے ہوئے لوگ پہلی پہلی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ نایاب کو گیٹ کی طرف آتے دیکھ کر ایک طرف ہٹے گئے۔

نایاب ملک سکدر کے ساتھ گلی میں تیز قدم اٹھاتی ہوئی چل رہی تھی۔ ایک گلی کے موڑ پر وہ رک گئی۔ ایک طرف یہ گلی گاؤں کے باہر کی طرف چلی گئی تھی۔ نایاب اس موڑ پر رک گئی اور اپنا بازو نیچے کرتی ہوئی بولی۔

”شکریہ بھئی۔ اب تم جاؤ۔“

سنتری سانپ اس کے بازو سے اتر کر زمین پر دیوار کے ساتھ ساتھ ریختے لگا۔ نایاب کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر اچانک ہی سانپ غائب ہو گیا۔

”چلے سکدر بھائی۔“ نایاب نے گلی میں دوسری طرف مڑتے ہوئے کہا۔

”یہ تو کمال ہی ہو گیا ہے بھئی۔“ سکدر اس کے ساتھ چلے ہوئے بولا۔ ”تمہیں ڈر نہیں لگا اس زہریلے سانپ سے؟“

”وہ تو مجھے اب انسانوں سے لگنے لگا ہے۔ سانپوں سے نہیں۔“ نایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔ نایاب کو صحیح سلامت دیکھ کر سیکڑ اور زرخس کے چروں پر طمانیت سی آئی۔

وہ سب لوگ ہینک میں آکر بیٹھ گئے۔ ملک صاحب بھی وہیں آگئے تھے۔ اور پھر ملک سکدر مزے لے لے کر دروداٹھانے لگا۔ زرخس دنیوہ کے چروں پر عجیب سی سنسنی کے تاثرات تھے لیکن ملک صاحب خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تشویش اور چرسے پر پریشانی کی پچھائیاں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔

وہ لوگ آدھی رات تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ملک صاحب نے اٹھ کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے نایاب کو ایک بار پھر نصیحت کی کہ وہ سعادت سے محتاط رہے۔ وہ سانپ سے زیادہ خطرناک ہے اور موقع پاتے ہی ڈنٹے سے باز نہیں آئے گا۔

قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ پیچھے پڑی ہوئی کرسی سے کھرا کر گر گیا۔ پتول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ سنتری سانپ اس سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ دور دور کھڑے ہوئے سب لوگ خوفزدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بعض لوگ مارے خوف کے چنچ رہے تھے۔

ناگ چوہدری سعادت سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ اس نے چمن اٹھا لیا۔ چوہدری سعادت کی آنکھیں خوف سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ پیسے سے تر ہو رہا تھا۔ موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

”بیجو نہیں۔“ نایاب چیخی۔ ”بیجو نہیں۔ رک جاؤ۔“

سانپ کے منہ سے پھکاری سی نکل۔ اس نے مڑ کر نایاب کی طرف دیکھا۔ پھر چوہدری کی طرف دیکھا۔ ایک مرتبہ پھکارا اور ریختا ہوا۔ نایاب کی طرف آگیا اس کے قدموں میں کنڈل مار کر بیٹھ گیا۔

”یہ زہریلا ناگ ہے۔“ نایاب چوہدری سعادت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس کا کام صرف ڈنٹا ہے۔ اس نے عبدالرحمن کو ڈنسا تھا تو اس کا انجام تم نے دیکھ لیا تھا۔ میری اس سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ لیکن ایک چیز ہوتی ہے احساس اور احسان مندی۔ یہ مادہ انسانوں میں ختم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن یہ احساس ابھی جانوروں میں حتیٰ کہ زہریلے ناگوں میں بھی موجود ہے۔ میں نے اس زہریلے ناگ کو ایک نیوے سے بچایا تھا۔ اس نے احساس کیا۔ میرا احسان مانا اور میرا محافظ بن گیا۔ عبدالرحمن نے مجھ پر چاقو سے حملہ کرنا چاہا تو اس نے اسے ختم کر دیا اور اب تم... تم نے دیکھ لیا یہ کس طرح میری مدد کو آگیا۔ اس زہریلے سانپ سے کچھ سیکھو چوہدری۔ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن میں اس جانیداد میں سے اپنا حصہ ضرور لوں گی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”آئندہ میرے خلاف اس قسم کی کوئی کارروائی کرنے سے پہلے سوچ لینا کہ قدرت نے مجھے بیجو جیسے محافظ دیے ہیں۔ آؤ بیجو۔“ آخری الفاظ اس نے سانپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

ناگ نایاب کی ٹانگ سے لپٹ گیا اور اوپر چڑھنے لگا۔ نایاب نے اپنا ہاتھ نیچے لٹکا دیا۔ سانپ اس کے بازو سے لپٹ گیا۔

اور عذرہ ابھی سو رہی تھی۔ تاباب ان کے درمیان سے اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی اور برآمدے میں بڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ صبح کی ہوا بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ چند ہی منٹ بعد اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سکیڈ بھی اپنے کمرے سے نکل آئی۔

”ارے؟“ سکیڈ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا رات بھر بیٹھی رہی ہو۔ نیند نہیں آئی؟“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں آکر بیٹھی ہوں بھابی!“ تاباب نے کہا۔ ”صبح کی لٹھڑی ہوا اچھی لگ رہی ہے۔ اچھا۔ ایسا کر آپ یہاں بیٹھیں۔ میں آپ کو چائے بنا کر پلائی ہوں۔“

تاباب اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے سکیڈ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی کرسی پر بٹھا دیا اور خود باورچی خانے میں کمرس گئی۔ اس نے چمکا ہوا لکڑی کی پانی چڑھا دیا اور چینی پی کے لئے ڈبے کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ وہ پہلی مرتبہ پکچن میں کھسی تھی اور چیزیں تلاش کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔

جب وہ چائے بنا کر باہر نکلی تو سکیڈ کرسی پر نہیں تھی۔ تاباب نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ صحن میں چنڈ پاپ پر منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں چائے پی رہی تھیں۔ اس دوران ملک صاحب اور سکندر نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھی چائے کی چسکیاں پیتی رہیں۔

”تاباب۔“ سکیڈ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا واقعی تم نے نیلے والے کھنڈروں کے نیچے کوئی خزانہ دیکھا تھا۔ میرا مطلب ہے وہ کوئی خواب تو نہیں تھا۔“

”نہیں بھابی۔“ تاباب نے جواب دیا۔ ”وہ خزانہ میں نے چائے کی گاتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ البتہ اس سے پہلے یا بعد کے واقعات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”اگر واقعی وہاں کوئی خزانہ موجود ہے اور اس نامن نے اسے تمہاری نذر کر دیا تھا تو اس سے بہت کام ہو سکتے ہیں۔ ہمیں چوہدری کی جائیداد میں سے اسے لے کر مقدسے بازی اور لڑائی جھگڑے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس کے بغیر ہی تم شاہانہ زندگی بسر کر سکتی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اگر تم وہ خزانہ حاصل کر سکتی ہو۔ تو اسے لے کر شہر چلی جاؤ اور جائیداد میں

ملک سکندر اور سکیڈ بھی اپنے کمرے میں پہلے گئے اور تاباب وغیرہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئیں۔ وہ تینوں اب بھی ایک ہی بیڈ پر سو رہی تھیں۔ نرمس اور عذرہ تو کچھ دیر بعد سو گئیں مگر تاباب دیر تک جاگتی رہی اور آج رات کی صورتحال کے بارے میں سوچتی رہی۔ ویسے تو وہ چوہدری سعادت کو اچھی طرح سمجھ چکی تھی لیکن اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اسے ہر قیمت پر ختم کرنا چاہتا تھا۔ آج تو وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ درجنوں لوگوں کی موجودگی میں اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ویسے تو تاباب جانتی تھی کہ ملک سکندر اور وہاں پر موجود دوسرے لوگ اسے کوئی نقصان نہ پہنچتے دیتے لیکن بیجو نے عین وقت پر وہاں پہنچ کر صورتحال کو بیکر تبدیل کر دیا تھا۔ اسے خود بھی حیرت ہوئی تھی کہ بیجو اچانک کہاں سے آ گیا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر خوف کے مارے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ چوہدری سعادت نے بیجو کو کوئی سے اڑا دینے کی کوشش کی تھی مگر اس کا نشانہ خطا گیا تھا اور پھر بیجو اس پر حملہ آور ہونے کے لئے آگے بڑھا تھا۔ اگر تاباب اسے نہ روک لیتی تو چوہدری سعادت بھی راکھ کر ڈھیر بن چکا ہوتا۔

گاؤں کے درجنوں لوگوں نے وہ منظر دیکھا تھا جب سنہری سانپ تاباب کی ٹانگ سے لپٹ کر اوپر چڑھتا ہوا اس کے بازو سے لپٹ گیا تھا۔ ہر شخص کے دل میں خوف تھا کہ وہ زہریلا سانپ کسی بھی لمحے تاباب کو ڈس لے گا۔ لیکن سب ہی نے دیکھ لیا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور تاباب اس سانپ کو بازو سے لپٹائے بڑے اطمینان سے وہاں سے چلی گئی تھی۔

چوہدرانی نے تو چیخ کر کہہ دیا تھا کہ تاباب انسان نہیں نامن ہے جس نے ایک خوبصورت عورت کا روپ دھار کر اس کے بچے کو پھانسل لیا تھا اور اب بھی شاید کسی اور موقع کی ناک میں ہے۔ چوہدرانی کی اس بات پر کچھ اور لوگ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ کیا تاباب واقعی کوئی نامن تو نہیں جس نے انسان کا روپ دھار رکھا ہے۔ وہ جس طرح اس سنہری سانپ سے باتیں کر رہی تھی اس سے بھی لوگوں کے شبہات کو تقویت ملی تھی۔ تاباب تو سکندر کے ساتھ گھر آگئی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ گاؤں کے لوگ رات گئے تک مختلف جگہوں پر بیٹھے اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے۔

تاباب اگرچہ رات کو دیر سے سوئی تھی لیکن صبح اس کی آنکھ جلد کھل گئی۔ نرمس

جسے کو بھول جاؤ۔" سیکند نے کہا۔

"گویا آپ مجھے یہاں سے بھگانا چاہتی ہیں؟" نایاب بولی۔

"نہیں بھئی یہ بات نہیں ہے۔" سیکند بولی۔ "تم تو مجھے زکس اور عذہ کی طرح عزیز ہو۔ بلکہ تم سے تو کچھ زیادہ ہی انس ہو گیا ہے۔ چوہدری فلی کو تم ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ خاص طور پر سعادت تو بہت ہی مگڑا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ تو تم نے بھی لگا ہی لیا ہوگا۔ سنا ہے تم نے رات کو بھری محفل میں اسے بہت ڈھیل کیا تھا۔ وہ ایسی باتوں کو بھلانے والا نہیں ہے۔ موقع ملے ہی تم پر وار کرے گا۔ اسے لے بستر ہی ہے کہ تم اس پر لعنت بھیج کر شر واپس چلی جاؤ۔ اگر تم چاہو تو کھنڈروں سے خزانہ نکالنے میں تمہارے بھائی تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ میری باتوں کا غلط مطلب نہ لینا نایاب۔ ہمیں تمہاری سلامتی عزیز ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں کوئی ایسا نقصان پہنچ جائے جس کی تلافی ممکن نہ ہو سکے۔"

"آپ لوگوں کی محبت نے تو مجھے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ کبھی غیرت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ انگل ہیں، آپ ہیں، سکندر بھائی ہیں اور سب سے بدھ کر زکس اور عذہ ہیں۔ آپ ان دونوں کو دیکھ رہی ہیں۔ مجھے الگ بستر پر بھی نہیں سونے دیتیں۔ کتنی محبت ہے آپ لوگوں میں، کتنا خلوص ہے۔ کیا میں یہ محبت اور جاہلت کبھی بھلا سکوں گی۔ نہیں کبھی نہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو مجھے شرمندگی کا احساس بھی ہونے لگتا ہے کہ میری وجہ سے آپ دونوں گھرانوں میں ناچاقی پیدا ہو گئی ہے۔ میرے آنے سے پہلے دونوں گھرانوں میں کتنے خوشگوار تعلقات تھے جو اب رفتہ رفتہ دشمنی میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں نے یہاں اگر غلطی کی۔"

"تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔" سیکند نے کہا۔ "یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ رہا دشمنی کا سوال تو چوہدری بھی جانتے ہیں کہ ہم لوگ بھی مجھے گھرے نہیں ہیں۔ وہ سوچ سمجھ کر ہم سے دشمنی مول لیں گے۔ دیئے تعلقات میں اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ ہمیں اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔ اسی لئے میں کہہ رہی ہوں کہ ان سے دشمنی مول نہ لو تو بستر ہے۔ اللہ نے ہمیں اب بہت کچھ دیدیا ہے آرام اور سکون کی زندگی بسر کر سکتی ہو۔ پھر ان بچیوں میں پرانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں بھابھی۔" نایاب نے گمراہ سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن

کیا ظالم کے ہاتھ کھلے چھوڑ دیئے جائیں۔ ان کے ظلم کے سامنے بند نہ ہاندھا جائے۔ یہ درست ہے کہ دنیا میں ہر جگہ ظلم ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ دولت کی بھوک نہیں ہوں لیکن اپنا حصہ لے کر زمین یہاں کے غریب کسانوں میں بانٹ دوں گی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "بات اگر صرف جائیداد کے ہزارے کی ہوتی تو شاید یہ معاملہ کسی اور طریقے سے حل ہو جاتا لیکن یہاں آکر میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے اسے زندگی کے آخری لمحوں تک فراموش نہیں کر سکتی۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اب تک کوئی ان کے راستے کی دیوار کیوں نہیں بنا۔ سعادت کو اتنی زیادہ بھوت دیدی گئی ہے کہ وہ گاؤں کی لڑکیوں کی عزت لوٹتا ہے اور کوئی اسے یہ نہیں بتاتا کہ عزت کیا ہوتی ہے۔ میں نے راشدہ کو دیکھا تھا۔ اسے کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں پیچیک دیا گیا تھا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ اس نے اپنی عزت بچانے کے لئے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا اور جب پولیس آئی تھی تو کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ اس کے خلاف بیان دیتا۔ کوئی اتنی بہت کر بھی کیسے سکتا ہے۔ ان کے اعتماد اور حوصلے کو کچل دیا گیا ہے۔ ان کی عزت نفس کو مجروح کر دیا گیا ہے۔ گاؤں کی اور کتنی ہی لڑکیاں ہیں جنہیں اسی طرح روندھا گیا۔ ان کی حمایت میں کوئی سامنے آیا؟ اگر گاؤں کے لوگوں کا اعتماد بحال ہوتا تو ان کے حوصلے بھی بلند ہوتے۔ وہ سعادت اور اس کے خنڈوں کے سامنے ایک مرتبہ بھی تن کر کھڑے ہو جاتے تو پھر اسے کسی اور لڑکی کی طرف دیکھنے کی جرات نہ ہوتی۔ اور پھر یہ آپ بھی جانتی ہیں کہ راشدہ اور اس کے شوہر کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ انہوں نے مجھے پناہ دی تھی اور اس کے بعد ریلوے کے ہوائنٹنس میں کو بھی محض اس لئے گولی مار دی گئی کہ وہ ان کے جرم کے خلاف بیان دینے والا تھا۔ اس کے بعد بھی آپ کہتی ہیں کہ میں سب کچھ بھول جاؤں اور شرچا کر آرام و سکون کی زندگی بسر کروں۔ آپ خود ہی بتائیے بھابھی یہ سب کچھ جاننے اور دیکھنے کے بعد میں آرام اور سکون کی زندگی بسر کر سکتی ہوں۔ کیا ان لوگوں کو محاف کیا جاسکتا ہے؟"

معافی کے قائل تو یہ بالکل نہیں ہیں۔" سیکند نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "اللہ خالوں کی دسی دراز کرتا ہے۔ لیکن ایک نہ ایک وہ اپنے انجام کو پہنچ ہی جاتے

ہوں۔" نایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"
 "تم جانتی ہو اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اتنی بڑی زمینداری ہے کہ پورا وقت اسی کی دیکھ بھال میں گزر جاتا ہے اور کسی دوسری طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہیں ملتا۔" سکندر نے کہا۔
 "ہاں یہ تو ہے۔" نایاب مسکرائی۔ "میں تو ہر قص اپنے اپنے شعبے میں محنت کرتا ہے لیکن میرا خیال ہے زمیندار اور کسانوں کی زندگی سب سے زیادہ دشمن ہوئی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن میں تم سے کوئی اور بات کرنا چاہتا ہوں۔" سکندر نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "مکھڑوں میں کسی خزانے کے بارے میں" میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ سنا تھا اور ہمیں بتایا بھی تھا کہ خزانہ کی تلاش میں آخری باہلی اس وقت آئی تھی جب میں چھوٹا تھا۔ ان کے دو آدمیوں کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور باقی داہیں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد خزانہ تلاش کرنے کے لئے کوئی اس طرف نہیں آیا۔ میں اس خزانے کو ڈھونڈنے اور من گھڑت کہانیاں سمجھتا تھا۔ لیکن جب سے تم نے اس خزانے کے بارے میں بتایا ہے میں بھی کچھ سنجیدہ ہو گیا ہوں۔ کل رات وہ سانپ کیا نام لیا تھا تم نے اس کا ... ہاں سنجیدہ ... اگر وہ بیکھر رات تمہاری مدد کے لئے چھوڑی کی حویلی میں نہ آجاتا تو میں یہی سمجھتا کہ خزانے کے بارے میں شاید تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔ لیکن بچو کہ تمہارے ساتھ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ خزانہ تمہارا خواب نہیں تھا۔" وہ خاموش ہو کر نایاب کی طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔ "میں کوئی لالچی آدمی نہیں ہوں۔ تم دیکھ رہی ہو کہ اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے لیکن اگر وہ خزانہ وہاں سے نکال لیا جائے تو پھر ہمیں چھوڑیوں کی جائیداد میں حصے کے لئے لڑنے پھڑکنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہمیشہ آرام کی زندگی گزار سکتی ہو۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم اس خزانے تک پہنچ سکتی ہو۔ اگر وہ خزانہ وہاں سے نکال لیا جائے تو تمہارے ہاتھوں نیکی کے بست سے کام بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی خیمہ خانہ کھول دو۔ کوئی ہسپتال بنا دو۔ کوئی ایسا رفاہی ادارہ قائم کرو جہاں سے مستحق لوگوں کی مدد ہو سکے۔"

"سکندر بھائی! نایاب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "حقیقت یہ ہے کہ اس

ہیں۔ خدا نے ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے۔ شاید اس فرعون کے لئے تم موسیٰ بن کر آئی ہو۔ میں تمہارے حوصلے کی داد دیتی ہوں۔ اب مجھے یہ تسلیم کر لینے میں کوئی عار نہیں کہ تم دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف ہو اور تم میں اتنی جرات بھی ہے کہ ان جیسے لوگوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑی رہ سکو۔" وہ چند لمحوں کی خاموش ہوئی پھر بولی۔ "میں تو اس زہریلے ناگ کے واقعہ کو بھی تمہارے لئے تائید اور ایضاً سمجھوں گی۔ نہ تم اس روز اس سانپ کو نیوے سے بچائیں اور نہ وہ تمہارا محافظ بننا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آئندہ بھی تمہاری مدد کرتا رہے گا۔"

"مجھے آپ لوگوں کی دعاؤں کی بھی چاہئیں بھائی۔" نایاب نے کہا۔
 "تمہاری دعاؤں کو تمہارے ساتھ ہیں ہی۔" سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

ملک صاحب دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں مونے موتیوں والی ایک چھوٹی شیج تھی اور وہ ذریعہ لب کچھ پڑھتے ہوئے آ رہے تھے۔
 "چھا بھئی تم بیگم۔ میں ابائی کے لئے ناشتہ تیار کرلوں۔" سکندر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"آج میں ناشتہ بناؤں گی۔ آپ سب لوگوں کے لئے۔" نایاب بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔

تمام گھر والے ناشتے میں پرائے کھایا کرتے تھے۔ نایاب کنسر سے آنا نکال کر گوندھنے لگی۔ سکندر اس دوران دوسرے کاموں میں معصوف رہی۔ تقریباً آٹھ بجے بعد نایاب پرائے بنا رہی تھی۔ اس دوران نرمس اور عذرہ بھی اٹھ کر باہر آ گئیں۔

آج ان سب نے اکٹھے ہی بیئر کر ناشتہ کیا ناشتے کے بعد ملک صاحب تو رسول بخش کے ساتھ کچھوں پر چلے گئے۔ سکندر گھر پر ہی رہا۔ ٹھوڑی دیر بعد وہ برآمدے میں نایاب کے سامنے بیٹھا بائیں کر رہا تھا۔

"نایاب بس! ایک دو باتیں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ لیکن کوئی غلط مطلب نہ لے لینا۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ لوگوں کے بارے میں کوئی ایسی ایسی بات سوچ سکتی

دیا۔

سکندر چونک گئی۔ وہ شاید اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ سکندر نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
وہ دونوں حویلی سے نکل کر مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے گاؤں سے باہر آئے۔
گلیوں میں گاؤں کی عورتیں مزمز کر ٹایاب کو دیکھ رہی تھیں۔ دیے ٹایاب اب گاؤں والوں کے لئے اجنبی نہیں رہی تھی اور پھر گزشتہ رات والے واقعہ نے تو اسے کچھ اور شہرت دینی تھی۔

گاؤں کے باہر نہری پل یا پار کر کے ٹایاب رک گئی۔

”اس رات میں اس طرف سے آئی تھی۔ اس لئے ہمیں اس طرف جانا ہوگا۔“
اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”تو چلو۔ اس طرف چلتے ہیں۔ لیکن اس طرف سے نیلے تک پہنچنے کے لئے ایک بہت لمبا پتھر کاٹنا پڑے گا۔“ سکندر نے کہا۔
”پتھر تو گتے لکھن راستے کی نشاندہی اسی طرف سے ہو سکتی ہے۔“ ٹایاب نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس وقت ساڑھے سات بجے تھے۔ ابھی تو دھوپ خڑگوار لگ رہی تھی۔ لیکن وہ دونوں جانتے تھے کہ جیسے جیسے دھوپ تیز ہوگی۔ گرمی بڑھتی جائے گی۔ کھیتوں میں لوگ کام کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک جگہ قادر نامی ایک مزارع پھاؤسے سے ندی کا بند کاٹ کر پانی کا رخ اپنے کھیتوں کی طرف موڑ رہا تھا۔ اس نے سکندر کو سلام کیا اور ٹایاب کی طرف دیکھنے لگا۔ پیٹ شرٹ پر دوپٹہ کچھ بچھ سا لگ رہا تھا۔ وہ مزارع خاموش کھڑا انہیں کھیتوں میں گھنڈی پڑ جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ کھیتوں سے نکل کر نیلے کے ساتھ ساتھ بنجر زمین پر چلتے رہے اور پھر ٹایاب ایک جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر وہ دوبارہ آگے چلتے گئی اور پندرہ منٹ بعد ایک جگہ پر رک گئی۔

”یہ جگہ ہے۔“ وہ ایک جگہ بڑی کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
”کھیتوں میں دوڑتے ہوئے میں یہاں آکر گر گئی تھی اور جب میرے حواس بحال ہوئے تھے

خزانے کے بارے میں، میں نے ابھی تک کچھ نہیں سوچا اور جہاں تک جائیداد میں حصے کا سوال ہے تو وہ میرا حق ہے اور میں اسے لے کر ہی رہوں گی۔ انہوں نے میرے اس چلنے کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا ہے جو عدالت سے مجھے وراثت میں ملا تھا۔ بہر حال، یہ الگ باتیں ہیں۔ اب رہی خزانے کی بات تو یہ ہے کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ وہ کھنڈروں کے نیچے کس جگہ پر ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں اس تہ خانے میں کیسے پہنچی تھی اور یہ بھی یاد نہیں کہ باہر کیسے آئی تھی۔ اس لئے وہاں تک پہنچنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک بھومی رہنمائی نہ کرے۔“

”اس کے بغیر کوشش تو کی جاسکتی ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”ہمیں یہ تو یاد ہوگا کہ نیلے پر کس طرف سے کھنڈروں میں داخل ہوئی تھیں۔ ہم وہیں سے تلاش شروع کریں گے اور میں ممکن ہے اس دوران تمہارا دوست بھومی رہنمائی کے لئے آجائے۔“

”میں خزانے کی تلاش کے لئے بھومی سے کوئی مدد نہیں لوں گی۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم ایک ایڈونچر سمجھ کر ان کھنڈروں میں خزانہ تلاش کریں گے۔ ہو سکتا ہے کسی موقع پر میری یادداشت کام آجائے۔“

”ٹھیک ہے۔“ سکندر بولا۔ ”تو پھر یہ ایڈونچر کب شروع کیا جائے۔“

”آج ہی سے۔ بلکہ ابھی سے۔“ ٹایاب نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے۔ میں تیار ہو جانا ہوں۔ ہم آدھے گھنٹے بعد یہاں سے نکلیں گے۔ مگر گھر میں بھی کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ سکندر نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں بھی تیار ہو جاتی ہوں۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ٹایاب اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ عذرہ بیڈ پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ٹایاب نے اسے کمرے سے نکال کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور بریف کیس میں سے جینز اور شرٹ نکال کر پہن لی۔ اس لباس پر بھی اس نے دوپٹہ اوڑھ لیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ٹایاب کمرے سے نکلی تو سکندر اس کا منتظر کھڑا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو ٹایاب؟“ سکندر نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ٹایاب نے یہ لباس کئی روز بعد پہنا تھا۔

”سکندر بھائی کے ساتھ ایک مهم پر جا رہی ہوں۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب

کی اینٹیں بھی رتنے لگی تھیں جن سے حدت خارج ہو رہی تھی۔ ٹایاب کی انٹرلاک ٹی شرٹ پیسے میں تر ہو کر جسم سے چپک رہی تھی۔

کھنڈرات خامسے دست و دھریں رتے پر پھیلے ہوئے تھے۔ جنہیں دیکھنے کے لئے پورا دن دوکار تھا۔ ٹایاب رک رک کر چلتی رہی۔ کسی کسی جگہ تو وہ کتنی دیر تک کھڑی جمجس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہتی۔

انٹیں گھومتے ہوئے دوڑ گھومتے ہوئے۔ کھنڈروں میں اونچے نیچے راستوں پر چلنے ہوئے ٹایاب تھک گئی تھی۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پر بیٹھ گئی اور کمر پر بندھے ہوئے دوپٹے کے پلو سے چہرے کا ہینڈ پوٹھیے لگی۔ ملک سکندر بھی اس کے سامنے ایک شلت دیوار پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی پیسے میں تر ہو رہا تھا۔

”تمہیں یاد ہے کہ اس راستے سے آئی تھیں اور کتنا فاصلہ طے کیا تھا؟“ ملک سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اتنا یاد ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میری کہ اس درخت سے اس طرف آئی تھی جس طرف سے ہم آئے ہیں۔ لیکن اس کے بعد کس طرف گئی تھی اس کا مجھے بالکل اندازہ نہیں۔“

”تمہیں تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ وہ راستہ کیسا تھا جہاں سے تمہ خاٹے میں اتری تھیں؟“ سکندر نے سوالیہ لٹا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بالکل یاد نہیں سکندر بھائی۔“ ٹایاب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ چند منٹ وہاں بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر کھنڈروں میں گھومنے لگے۔

”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ سکندر اس کے ساتھ چلنے ہوئے کہ رہا تھا۔ ”ہم لاہور میں بھی کبھی سکھار اس طرف آیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہم نے سنا تھا کہ ان کھنڈروں میں کوئی خزانہ بھی ہے۔ ہم پانچ پر لڑکے یہاں گھومتے رہتے تھے۔ چوہدری سعادت بھی ہمارے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتن جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں اور مٹی کے پیالوں کے ٹکڑے جمع کر کے لے جاتے اور گاؤں پہنچ کر شور مچا دیتے کہ ہم نے خزانے کا سراغ لگا لیا ہے۔ ہمیں خوب ڈانٹ پڑا کرتی تھی اور معیا کیا جاتا تھا کہ آئندہ ہم کھنڈروں کی طرف نہ جائیں۔“ ہمیں

تو میں اس پتھر کے قریب پڑی تھی اور پھر میں بچے کے پیچھے پیچھے اس طرف چلنے لگی تھی۔“ اس نے نیلے کی طرف اشارہ کیا۔

یہ ٹیلا کھیتوں سے تقریباً دو سو فٹ بلند تھا اور دھولان تھا۔ اس پر کسی دشواری کے بغیر چڑھا جاسکتا تھا۔ ٹایاب آگے آگے چلنے لگی اور ملک سکندر اس کے پیچھے پیچھے۔

دھوپ کچھ تیز ہو رہی تھی۔ نیلے پر چڑھتے ہوئے ٹایاب کو ہینڈ آنے لگا۔ اس نے وہنہ گلے سے انار کر چپکے کی طرح کمر پر باندھ لیا اور نیلے پر چڑھتی رہی۔ تقریباً سو فٹ اوپر کھنڈروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان کھنڈروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں کسی زمانے میں مکان رہے ہوں گے۔ اب تو دیواریں بھی بنیادوں تک ختم ہو چکی تھیں۔ بس نشانات باقی رہ گئے تھے۔

وہ مزید اوپر چڑھتے رہے۔ اب باقاعدہ کھنڈر شروع ہو گئے تھے۔ شلت دیواریں ایٹوں کے ڈھیر اور ٹوٹے ہوئے ستون۔ ٹایاب ایک جگہ رک گئی۔ وہ غابا“ کسی بڑے مکان کا کھنڈر تھا۔ اس مکان کے کمرے بھی خامسے دست و دھریں رہے ہوں گے چھت کو سارا دینے کے لئے ایٹوں کے ستون بھی تعمیر کئے گئے تھے۔ جو سب کے سب ٹوٹ چکے تھے۔ ایک دیوار اب بھی تقریباً“ دس فٹ کی بلندی تک کھڑی تھی۔ اس دیوار میں کھڑکی کی جگہ نظر آ رہی تھی۔

اس روز سنہری سانپ کے پیچھے چلتی ہوئی ٹایاب ان کھنڈروں میں آئی تھی تو شاید ٹرائس میں تھی۔ اسے کچھ پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیسے آئی ہے۔ لیکن اب وہ بڑی توجہ سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ان کھنڈروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں کوئی ترقی یافتہ اور مذہب قوم آباد تھی۔ مکانوں کی تعمیر کے سلسلے میں بڑے پیمانے سے کام لیا گیا تھا۔ گلیاں اور راستے کشادہ تھے اور غابا“ ان گلیوں میں تیل گاڑیاں اور آنگہ قسم کی سواریاں بھی آتی رہی ہوں گی۔

ٹایاب دلچسپ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ ملک سکندر بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ٹایاب کی ہار رکی تھی۔ ہر مرتبہ وہ اس طرح ادھر ادھر دیکھتی تھی کہ کوئی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

کھنڈروں میں گہری زیادہ تھی۔ دھوپ براہ راست ان پر پڑ رہی تھی۔ اور کھنڈروں

سکندر نیچے جھک کر دیکھنے لگا۔ نیچے ابھی تک دھول اڑ رہی تھی جس کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن چند منٹ بعد دھول بیٹھ گئی تو ٹایاب کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر سکندر کے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔

”کیا ہوا سکندر بھائی؟ بس کیوں رہے ہیں آپ؟“ ٹایاب نے پوچھا۔
 ”تمہاری شکل دیکھ کر۔“ سکندر بولا۔ ”اس وقت تم بالکل بھٹی لگ رہی ہو۔ آئینہ دیکھو تو اپنے آپ کو دیکھ کر ڈر جاؤ۔ لیکن میں تم سے ذرا نہیں ہوں۔ ایک طرف ہو۔۔۔ میں نیچے آ رہا ہوں۔“

ٹایاب ایک طرف ہٹ گئی اور سکندر نے چھانک لگا دی۔
 ”جس کوئی چوٹ تو نہیں آئی۔“ وہ ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”نہیں زیادہ نہیں۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔

سورج بالکل سر پر تھا اور دھوپ اس کی تہ خانے میں بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ دونوں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ یہ کمرہ خاصا بڑا تھا چھت کو سارا دینے کے لئے درمیان میں ایک ستون بھی تھا۔ ایک طرف اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ہر طرف کھڑکوں کے ہالے تھے ہوئے تھے۔

وہ دونوں ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ لیکن اس کمرے سے کسی اور طرف جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ انہوں نے دیواروں کو بھی ٹھوک جاکر دیکھ لیا۔ تمام دیواریں ٹھوس تھیں۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی خلا نہیں ہے۔ سکندر سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ لیکن اوپر جانے کا راستہ بھی نہیں تھا۔ غالباً اوپر کوئی دیوار وغیرہ لگنے سے راستہ بند ہو گیا تھا۔

”یہاں سے کسی اور طرف راستہ نہیں جاتا۔“ سکندر نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ کسی ایک ہی مکان کا تہ خانہ ہے۔ جو صرف اس کمرے تک محدود ہے۔“

”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“ ٹایاب بولی۔ ”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب یہاں سے باہر کیسے نکلا جائے۔“

سکندر نے چند اینٹیں اٹھا کر نیچے اوپر رکھ دیں۔

ذرا دیا دھکیا جاتا تھا کہ یہاں بھوت رہتے ہیں۔“

”وہ بھی عجیب عمر ہوتی ہے۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک طرف ایڈووکیٹ کا شوق، تجسس اور دوسری طرف بزرگوں کی ڈانٹ کا خوف۔ میرا خیال ہے اس عمر میں سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور بغاوت میں جو مزہ آتا ہے اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے ٹیلوں میں گھومتے رہے۔ دھپر ہو چکی تھی۔ دونوں پیٹے میں شرابور ہو رہے تھے۔ وہ ایک کھنڈر میں گھوم رہے تھے کہ ایک جگہ ٹایاب کو یوں لگا جیسے زمین اس کے پیروں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہو۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی اور پھر اس یوں لگا جیسے نیچے گر کر چلی جا رہی ہو۔

ادھر بھر وہ محراب سے نیچے گری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ وہ جس جگہ کھڑی تھی وہاں سے فرش بیٹھ گیا تھا اور وہ نیچے آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی مٹی بھی گری تھی۔ ٹایاب تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی سے گری تھی۔ اسے کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں لگی تھی لیکن اوپر سے گرنے والی مٹی سے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔

ملک سکندر اس سے چند فٹ دور تھا۔ اس نے ٹایاب کو زمین میں ڈھنٹے ہوئے دیکھا تو چیخ کر اس طرف دوڑا۔ لیکن اس کے پیچھے سے پہلے ہی ٹایاب اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ گرد و غبار کا ایک بادل سا اٹھا اور سکندر وہ قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”ٹایاب۔ کہاں ہو تم؟“

”میں ٹھیک ہوں سکندر بھائی۔“ مگرانی میں سے ٹایاب کی آواز سنائی دی۔ سکندر آگے بڑھ آیا۔ گرد کا فہار چھٹ گیا۔ اس جگہ سے فرش کا ایک حصہ بیٹھ گیا تھا اور تین چار فٹ کا ایک خلا سا بن گیا تھا۔ سکندر کنارے پر کھڑے ہو کر نیچے جھانکے اور دیکھ بھر اچانک ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ ہو سکتا ہے اس جگہ کے نیچے تہ خانہ ہو اور خزانے کا راستہ بھی اسی تہ خانے سے ہو۔

”ٹایاب۔ کہاں ہو تم؟“ اس نے کنارے پر جھک کر ٹایاب کو آواز دی۔

”میں یہاں ہوں سکندر بھائی۔ میرا خیال ہے یہ کوئی تہ خانہ ہے۔“ ٹایاب نے

جواب دیا۔

وہاں ہمارے سامنے نہیں آئے۔ میں خود سے وہ راستہ تلاش کرنا چاہتی ہوں۔ جب تھک جاؤں گی تو پھر تجسین بلا لوں گی۔“

تجسین اس کے سامنے بیٹھا جھومتا رہا۔ وہ جیج کی آواز ایک بار پھر سنائی دی جس سے ٹایپ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ ٹایپ نے اٹھ کر دیکھا۔ دو گھنٹہ دور ایک دوسرے سے دور کام کرتے ہوئے دو مزارع جیج جیج کر بائیں کر رہے تھے۔ ٹایپ نے جو گرز پن لے لئے اور تجسین کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے گڈنڈی پر چلے گئی۔

ٹایپ کے اندازے کے مطابق اس وقت چار بجنے والے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک درخت کے نیچے بیٹھی ادھمکتی رہی تھی۔ لیکن ادھم لینے کا یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اس کی محسن اتر گئی تھی۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوئی تو گھریں سے گزرتے ہوئے لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک عورت نے تو اسے روک بھی لی۔

”چھوٹی بی بی۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کہاں سے آ رہی ہے؟“

”بیر پھل مکیا تھا۔ ایک گڑھے میں گر گئی تھی۔ کپڑوں کا ستیا تاس ہو گیا۔“ ٹایپ

نے جواب دیا۔

”کپڑوں کا ستیا تاس“ وہ عورت بولی۔ ”چھوٹی بی بی گھر جا کر اپنی حالت تو دیکھو اوپر سے نیچے تک مٹی میں بھری ہوئی ہو۔“

ٹایپ کے ہونٹوں پر چمکی سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ اس عورت کو مزید باتوں کا موقع دینے بغیر آگے چل پڑی۔ گھر میں داخل ہوئی تو زمرس وغیرہ بھی اس کی حالت دیکھ کر چونک گئیں۔

”ارے“ یہ کیا ہوا۔“ زمرس نے کہا۔ ”مج جب تم گھر سے نکلی تھیں تو ٹھیک ٹھاک

تھیں۔ اب یہ کیا طبع بنا رکھا ہے۔“

”میں نے بھی صبح تجسین بتایا تھا کہ ایک ایڈیٹر پر جا رہی ہوں۔“ ٹایپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور ایڈیٹر فرمیں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔“ وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگی۔ پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں نمائے جا رہی ہوں۔ کپڑے لا دو۔“

”ان اینٹوں پر کھڑی ہو جاؤ۔ میں تجسین سارا دیتا ہوں۔“ سکندر نے کہا۔ ٹایپ اینٹوں پر کھڑی ہو گئی اور ایک کر اوپر والے خلا کا کنارہ پکڑ لیا۔ سکندر نے دونوں ہاتھ اس کے پیروں کے نیچے رکھ دیئے اور اسے اوپر اٹھانے لگا۔

ٹایپ اس تہ خانے سے باہر آگئی۔ سکندر کو بھی باہر آنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ چند منٹ ایک گھنٹہ دیوار کے سامنے بیٹھے رہے۔

”میرا خیال ہے اب واپس چلنا چاہئے سکندر بھائی۔ اب تیز دھوپ میں اب زیادہ نہیں پھرا جاسکتا۔“ ٹایپ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ کل صبح پھر آئیں گے۔“ سکندر کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ کھنڈروں سے نکل کر نیلے کی دھلاٹن سے اترتے ہوئے کھیتوں کی طرف آگئے۔

ٹایپ بری طرح تھک گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں سامنے میں بیٹھ جائے۔ تین چار کھیتوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ٹائی کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ یہاں ایک چھوٹا سا کھال (ندی) بھی تھا۔ ٹایپ ندی کے کنارے پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے لگی۔

سکندر بھی درخت کے نیچے کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”آپ چاہیے سکندر بھائی۔“ میں آجاؤں گی۔“ ٹایپ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ڈیڑے پر جا رہا ہوں۔ تم تھوڑی دیر یہاں آرام کرو۔ پھر گھر چلی جانا۔“ سکندر کہتے ہوئے ایک گڈنڈی پر چلے گا۔

سکندر چلا گیا۔ ٹایپ نے جو گرز اتار دیئے اور ندی میں پیر لٹا کر بیٹھ گئی اپنی لباس دیکھ کر اسے اندازہ ہوا رہا تھا کہ اس کی کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ وہ تقریباً دس منٹ تک پانی میں پیر ڈالے بیٹھی رہی پھر ندی سے پیچھے ہٹ کر ٹائی کے درخت سے ٹھیک لگا لی اور محسن کی وجہ سے بیٹھے بیٹھے ادھمکتی گئی۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سوئی ہوگی۔ کسی کے چیخنے کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چونک گئی۔ شہری سانپ تجسین سے دو تین فٹ کے فاصلے پر کھڑی مارے اور پھر پیچھے بیٹھا تھا اور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ارے تجسین۔“ ٹایپ مسکرائی۔ ”تو تم یہاں بیٹھے میری حفاظت کر رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے تم کھنڈروں میں بھی میرے آس پاس ہی موجود تھے۔ تم نے یہ ٹھنڈی کی کہ

زمرس اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی اور ٹیکہ کے ساتھ مل کر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ غدرہ بھی کاموں میں مصروف تھی۔ سکندر، ٹایاب کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تم نے ابھی کھانا کے بارے میں سن لیا ہوگا۔“ سکندر نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تحقیقات صحیح ہوں تو چوہدری سعادت بھی اس کیس میں پھنس جائے گا۔ قتل کا کیس کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اس کیس میں اس کی گرفتاری تمہارے والے کیس پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔“

”اصل بات تو یہ ہے کہ پولیس اسے مجرم ثابت کرتی ہے یا بیچ میں ہی ک مکا کر کے معاملہ ختم کر دیا جاتا ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔

”ماہاجر کمار صرف اور صرف سعادت کی شہ پر بھرا ہوا تھا۔ بنیادی طور پر وہ بہت بزدل آدمی ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ پولیس والوں کے وہ چار ہتھ پڑتے ہی وہ سب کچھ بک دے گا۔ کہ اسٹیشن ماسٹر کے کارڈ کو آگ لگے گی تھی۔“ سکندر نے کہا۔ ”تمہیں وہی زندگی کے بارے میں ایسی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ یہاں رہنے والی بی بی قویں، دھوبلی، نائی، موچی، باگھی اور کھار وغیرہ سب زمینداروں کی بطبع ہوتی ہیں۔ ان کا کام ہی خدمت اور اطاعت ہے۔ عام طور پر یہ لوگ کبھی سر نہیں اٹھاتے۔ لیکن ان میں کوئی نہ کوئی ایسا بدعیشہ نکل آتا ہے جو کسی زمیندار کی شہ پر اپنی حد سے نکل کر پھیلنے لگتا ہے۔ اگر اسے کشمکش نہ کیا جائے تو وہ بہت خطرناک بن جاتا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”چند سال پہلے کالا ڈاکہ بڑا مشہور ہوا تھا۔ وہ فتح پور کا ہمارا تھا۔ بڑا اونچا لمبا اور رنگ توڑے کی طرح سیاہ۔ وہ فتح پور کے چوہدری نور محمد کا کارندہ تھا۔ چوہدری کو بھرا سننے کا شوق تھا۔ کالے نے اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور اس کا خاص مصاحب بن گیا۔ اور پھر اس نے وہ حرکتیں شروع کر دیں جو سعادت کے دوست کر رہے ہیں۔ لیکن فتح پور کے لوگ زیادہ عرصہ تک اس کی حرکتیں برداشت نہیں کر سکے۔ ایک دن گاؤں کے چند آدمیوں نے پکڑ کر دھناتی کر دی اور پھر پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس نے بھی اس کی خوب پٹائی کی اور اسے غولالت میں بند کر دیا۔ لیکن دوسرے دن وہ غولالت سے بھاگ گیا۔ سنا ہے کہ چوہدری نور محمد نے اسے کئی روز تک چھپائے رکھا اور پھر ایک

وہ غسل خانے میں کھس گئی اور ٹھٹھے پانی سے نہانے لگی۔ نما کر اسے کچھ سکون ملا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد وہ برآمدے میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

”تمہارے لئے ایک دلچسپ خبر ہے۔“ زمرس نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ ٹایاب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آج پولیس آئی تھی گاؤں میں۔“ زمرس نے بتایا۔ ”وہ ماہاجر کمار کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔“

”ماہاجر کمار۔ یہ کون ہے۔“ ٹایاب نے پوچھا۔

”کتنے کو تو وہ گاؤں کا کی کڑی ہے مگر چوہدری سعادت نے اسے بہت سرچھا رکھا ہے۔ ایک خبر کا بد معاش ہے۔ گاؤں کے ان لوگوں سے بھی بات بات پر الجھنے لگتا ہے۔ جن کی سارے گاؤں والے عزت کرتے ہیں۔“ زمرس نے بتایا۔

”لیکن پولیس نے اسے کیوں پکڑا ہے۔“ ٹایاب نے پوچھا۔

”کل رات تم نے تھانیدار کو کھری کھری سنا دی تھیں نا۔“ زمرس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تاہم پولیس والے اس سے اسٹیشن ماسٹر کے گھر میں آتشزدگی کے بارے میں پوچھ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”پولیس والے اگر اس سے ٹھیک طرح سے پوچھ کچھ کریں تو بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک طرح سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ زمرس نے پوچھا۔ ”مار پیٹ؟“

”ضروری نہیں کہ مار پیٹ ہی سے کسی کی زبان کھلوائی جائے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”کچھ نفسیاتی حربے بھی ہوتے ہیں جن سے کسی کو کچ بولنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ برہم حال، یہ اچھی بات ہے کہ پولیس انسپکٹر کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو گیا۔ اب مجھے امید ہے کہ اسٹیشن ماسٹر عبدالغنی اس کی بیوی راشدہ اور پادوش مین عبدالغنی کے قتل کے حوالے سے کچھ حقائق سامنے آجائیں گے۔“

وہ ہاتھ کر رہی تھیں کہ سکندر اور ملک صاحب بھی آگئے۔ ان کے ساتھ ہی رسول بخش بھی بیٹھنوں کو ہانکتا ہوا گیت میں داخل ہوا تھا۔ ملک صاحب بھی آج کچھ تھکے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔

بھی ناشتہ کرنے کے بعد ٹایاب اور ملک سکندر نیلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ دوپہر تک کھڑوں میں گھومتے رہے۔ بنائے آج ٹایاب کو بار بار یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ کوئی ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے۔ کئی مرتبہ اسے چھڑا دینے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ لیکن دور دور تک کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔

ایک مرتبہ تو ٹایاب کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دبے قدموں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا ہو۔ اس نے قدموں کی آواز بہت واضح طور پر سنی تھی۔ اس نے تیزی سے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ اسے سفید کپڑے کی جھلک ہی دکھائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا بڑی تیزی سے ایک شگت دیوار کی آڑھ میں ہو گیا تھا۔ ٹایاب تیزی سے اس طرف دوڑی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ اس کا دم نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے کسی کو دیوار کے پیچھے پیچھے ہونے دیکھا تھا۔ وہ تجسس نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی اور پھر ایک دم چونک گئی۔

وہاں سے تقریباً "تین گز آگے ایک آدمی ایک پتھر بٹھا ہوا تھا۔ اس نے سینہ دوی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ لیکن اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ اسی لئے چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر ٹایاب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سکندر بھی اس طرف آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے ٹایاب۔ تم بھاگ کر اس طرف کیوں آئی تھیں۔" سکندر بولا۔

"وہ آدمی۔" ٹایاب نے سینہ دوی لباس والے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا جو ان کی طرف پشت کئے بیٹھا تھا۔ "میں نے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی تھی۔ مڑ کر دیکھا تو کوئی بھاگ کر اس دیوار کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ اس کے کپڑے سفید تھے۔ لیکن یہ آدمی۔۔۔ اس کا لباس سینہ دوی ہے اور یہ اتنی جلدی وہاں پہنچ بھی نہیں سکا اور اس کا انداز بھی ایسا ہے جیسے دیر سے یہاں بیٹھا ہوا ہو اور اس نے شاید ہمیں دیکھا بھی نہیں۔"

"آؤ۔۔۔ دیکھتے ہیں یہ کون ہے؟" سکندر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں چلتے ہوئے اس شخص کی پشت پر پہنچ گئے۔ لیکن اس شخص نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی لگتا تھا جیسے وہ ان کی موجودگی سے قطعی بے خبر ہو چکا۔ ان کے چلتے

روز وہ کالا ڈاکو بن کر سامنے آیا۔ اس نے اپنا ایک گردہ بتا لیا تھا۔ آس پاس کے گاؤں و مساتوں میں ڈاکے اور قتل و غارت اس کا معمول بن گیا۔ اپنے گاؤں میں اس نے زیادہ تباہی پھیلانی۔ ان لوگوں کو چن چن کر قتل کر دیا جن لوگوں نے اس کی دھنکی کی تھی اور پھر پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔

"کالا ڈاکو کئی سال تک علاقے میں دہشت کی علامت بنا رہا۔ سنا تو یہی ہے کہ اسے چہرہ نور محمد کی پشت پناہی حاصل تھی۔ چہرہ نور ہی نے اسے اور اس کے گردہ کو اپنی زمینوں پر پیچھے کی جگہ دے رکھی تھی۔ اس کی موجودگی کی اطلاع ملنے پر پولیس آتی مگر چہرہ نور محمد سے ملاقات کر کے واپس چلی جاتی۔

"گاؤں والوں کو بھی پتہ چل گیا کہ کالا ڈاکو کہاں چھپا ہوا ہے۔ پندرہ بیس نوجوانوں نے بڑے خفیہ طور پر پروگرام بنایا اور صبح ہو کر رات کے وقت چہرہ نور کی اراضی پر اس پرانی حویلی کو گھیر لیا جہاں کالا ڈاکو اپنے آدمیوں کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔ رات بھر دونوں طرف سے فائرنگ ہوتی رہی۔ گاؤں کے اور لوگ بھی اسطرح لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ کالا ڈاکو تمام ساتھیوں سمیت مارا گیا۔ صبح پولیس آئی اور لاشیں اٹھا کر لے گئی۔" سکندر کچھ دیر کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہمجا کھار کے حالات بھی کالا ڈاکو سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ یہ بھی کئی مرتبہ گاؤں والوں سے پتہ چکا ہے اور اب پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے۔ اگر پولیس نے صحیح طور پر اس معاملے کو کنٹرول نہ کیا تو یہ بھی کالا ڈاکو بن جائے گا۔"

"ہمجا کھار" کالا ڈاکو نہیں بن سکے گا۔" ٹایاب نے کہا۔ "محل میں خود پولیس انسپکٹر سے ملوں گی اور گاؤں کے بعض معتبر لوگوں کو بھی مجبور کروں گی کہ وہ اس کیس کو پراسس کریں اور پولیس کو بھی کوئی ایسا موقع فراہم نہ کریں جس سے کال ڈاکو جیسے حالات پیدا ہوں۔"

وہ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ حکم دین آ گیا۔ وہ بھی ایک کاشکار تھا اور اس کا شمار بھی گاؤں کے ایسے آدمیوں میں ہوتا ہے جنہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ٹایاب اٹھ کر کچن میں سینکڑن اور نرمس کے پاس آگئی۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد ٹایاب جلدی سو گئی۔ اور صبح جلدی اٹھ بھی گئی۔ آج

”کیوں بھائی! تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ کون ہو کہاں سے آئے ہو؟ ملک سکندر نے ایک بار پھر اس اجنبی نوجوان کو مخاطب کیا۔ اس نوجوان نے ایک بار پھر ایک طرف اشارہ کر دیا۔

”تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟“ ملک سکندر نے اسے گھورا۔
 ”نوجوان کھکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں بڑی کشش تھی۔ وہ ایک بار پھر ٹایاب کی طرف دیکھنے لگا۔

ملک سکندر مزید کہتا ہی جا رہا تھا کہ فضا فاذ کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی چلنے کی آواز کیس قریب ہی سے آئی تھی۔ چتر پشیا ہوا وہ نوجوان ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا اور تشویش آمیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

فاذ کی آواز سن کر ٹایاب اور ملک سکندر بھی اچھل پڑے تھے۔ وہ دونوں بھی ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اسی دوران ایک اور فاذ ہوا۔ یہ آواز پہلے کی نسبت زیادہ قریب سے آئی تھی اور پھر ایک اور آواز سن کر دونوں چونک گئے۔

”اے خدا کھڑدوں میں ہیں۔ کچھ دیر پہلے میں نے خود انہیں اس طرف آتے ہوئے دیکھا ہے۔ تلاش کرو انہیں اور بھون دو گلیوں سے۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

یہ آواز چوہدری سعادت کی تھی۔ ٹایاب اور سکندر نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ملک سکندر نے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے خیلے میں سے پستول نکال لیا۔ آج وہ مکمل تیاری کر کے آیا تھا۔ کندھے پر لٹکے ہوئے کپڑے کے اس خیلے میں نارنج بھی تھی اور دوپٹہ لٹکا ہوا بھی۔ اس نے پستول کا سیفٹی کیچ مٹا دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چوہدری سعادت کی آواز سن کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ انہیں کسی طرح یہ پڑ چکا تھا کہ یہ دونوں کھڑدوں میں آئے ہوئے تھے اور وہ اپنے آدمیوں کو لے کر ان کی تلاش میں یہاں پہنچ گیا تھا۔ ان کے ارادوں کا بھی پتہ چل گیا تھا۔ اگر وہ لوگ انہیں مار کر ان کھڑدوں میں پھینک جائیں تو کئی روز تک تو ان کی لاشوں کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔

ایک اور فاذ کی آواز گونجی اور اس کی بازگشت ختم ہونے سے پہلے ہی چوہدری سعادت کی گونجی ہوئی آواز سنائی دی۔

سے قدموں کی اچھی خاصی آواز پیدا ہو رہی تھی اور بیروں کی ٹھوکروں سے چند چھوٹے چھوٹے پتھر بھی لڑکتے تھے۔

وہ دونوں پتھر کے اوپر سے گھوم کر اس کے سامنے آگئے اور تب اس شخص نے ان کی طرف دیکھا۔ اسے دیکھ کر ٹایاب کو سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دماغ میں سنسناہٹ اور پرے جسم پر چوہڑیاں سی رہتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

بست ہی بست اور جوان رہتا تھا۔ گول چڑھ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جن کے کناروں پر سرے کی باریک دھاریاں سی نظر آ رہی تھیں۔ سرخ و سفید رنگت اور ہونٹ گلاب کی پتوں جیسے نازک اور سرخی لائے ہوئے تھے۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے بال گولڈن تھے۔ وہ ٹایاب کی طرف دیکھ کر متکرایا۔ متکرا نے اس کے دائیں رخسار پر ہلکا سا ڈبیل پڑ گیا۔ اس چاہ زخماں نے اس کی رعنائی میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ ٹایاب کے دل میں ایک عجیب سا احساس جاگ اٹھا اور وہ سینے میں ہلکی سی گلدگدی کی لہریں محسوس کرنے لگی۔

ملک سکندر بھی حیرت سے اس اجنبی نوجوان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ حسین نوجوان ان کے گھڑوں کا یا اس پاس کی کسی بستی کا نہیں تھا۔

”کون ہو تم جوان کہاں سے آئے ہو۔ میں نے پہلے تو تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ کہاں رہتے ہو؟“ ملک سکندر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

اجنبی نوجوان نے زبان کو حرکت دینے کی بجائے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر دیا۔

”یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ملک سکندر نے دوسرا سوال کیا پھر خود ہی بول پڑا۔
 ”اورد ... سمجھ گیا۔ تمہارے کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے اور تم لوگ شاید یہاں

خزانہ تلاش کرنے آئے ہو۔“

”اجنبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹوں پر بدستور دلچسپ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ ٹایاب کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی متناظر چمک تھی۔ ٹایاب بھی یک جہتے بغیر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ اس اجنبی نوجوان سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی اور اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔

میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ نگ سارا سست تھا۔ ہر طرف کڑی کے چالے تھے ہوئے تھے۔

”عجیب بیوقوف ہے وہ نوجوان۔“ ملک سکندر بولا۔ ”ہمیں تو اس سرگ میں چھپا دیا اور خود باہر ہو گیا۔ چھدہری سعادت کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”چھدہری سعادت اور اس کے آدمیوں کو اس نوجوان کی نہیں ہماری تلاش ہے۔“ ٹایپ نے جواب دیا۔ ”اگر وہ آئے سائے ابھی گئے تو اس سے کی پوچھیں گے کہ اس نے ہمیں کیسے دیکھا تو نہیں۔“

”خدا اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“ سکندر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اس وقت تو وہ ہمارے لئے رست کا فرش ثابت ہوا ہے۔“

”غاموش! میرا خیال ہے وہ لوگ اوپر موجود ہیں۔“ ٹایپ نے سرگوشی کی۔ انہیں اپنے سروں پر کئی آدمیوں کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر ایک غازی کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ یقیناً سعادت کے آدمی تھے جو اس جگہ پہنچ گئے تھے۔

”اگر انہوں نے اس سرگ کا راستہ تلاش کر لیا تو ہمارے لئے مشکل ہو جائے گی۔“ سکندر نے سرگوشی کی۔ ”تم باہر سنہالو بلکہ اسے بجا دو۔ میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ اگر وہ راستہ تلاش کر بھی لیں تو پیچھے نہ آئے پائیں۔ ایک ایک کو گولی سے اڑا دوں گا۔“ وہ پتھول سنہال کر تیار ہو گیا۔

اسے خطرہ تھا کہ وہ چٹری سِل کسی بھی وقت ان میں سے کسی کی نظروں میں آسکتی تھی۔ لیکن اسے اطمینان بھی تھا کہ وہ ایک وقت پہنچے نہیں آسکتے تھے۔ ایک ایک آدمی پیچھے آئے گا اور وہ پیچھے کھڑا آسانی سے انہیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا سکتا تھا۔

بھت پر قدموں کی آواز تھوڑی دیر تک سنائی دیتی رہی پھر غاموشی چھا گئی۔ وہ لوگ شاید کسی اور طرف نکل گئے تھے۔

وہ لوگ چند منٹ تک تاریکی میں کھڑے رہے پھر ٹایپ نے باہر چلائی اور اس کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ہر طرف کڑیوں کے چالے تھے ہوئے تھے اور بظاہر کسی طرف جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دفعتاً ”ٹایپ کے داغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔“

”ملک سکندر! ہمیں معلوم ہے تم ٹایپ کو لے کر یہاں آئے ہوئے ہو۔ گاؤں میں موقع نہیں ملا تو منہ کالا کرنے کے لئے اسے لے کر یہاں آگئے۔ ہم نے ان کھنڈروں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ آج تم لوگ بچ کر نہیں جاسکتے۔ بہتر ہے کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔“

منہ کالا کرنے والی بات سن کر ملک سکندر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے ٹایپ کی طرف دیکھا اور اسے وہیں رکے کا اشارہ کر کے ایک طرف بیٹھنے لگا۔ لیکن ابھی اس نے قدم ہی اٹھایا تھا کہ اس حسین نوجوان نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

”انہوں نے واقعی کھنڈرات کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ وہ کئی آدمی ہیں تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔“ نوجوان نے کہا۔ اس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی تھی اور اس کی آواز میں بڑی ٹھنک تھی۔

سکندر نے ٹایپ کی طرف دیکھا اور ٹایپ نے تائید میں سر ہلا دیا۔ سینہ دداری لباس والا وہ خوب نوجوان انہیں اشارہ کرتا ہوا جیڑی سے ایک طرف مڑ گیا۔ وہ دونوں بھی اسی کے پیچھے چلے گئے۔ وہ کھنڈروں کی فلتوں دیواروں اور ستونوں کی آڑھ لیٹے ہوئے تیزی سے چلتے رہے اور پھر ایک موقع پر سکندر اور ٹایپ کو کھنڈروں کے باہر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ چھدہری سعادت نے غلط نہیں کہا تھا۔ چاروں طرف دور دور تک اس کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ گویا وہ ہاتھ پر درگرم بنا کر آئے تھے۔

وہ خوب نوجوان ایک جگہ رک گیا۔ یہ غائب۔ کوئی کھڑا جس کی تین دیواریں چند فٹ اوپر تک موجود تھیں البتہ چو تھی دیوار نہیں تھی۔ وہ نوجوان ایک کونے میں جا کر جمنا اور فرش سے ایک بہت بڑی سِل اٹھادی۔

”پیچھے اتر جاؤ۔ جلدی کرو۔ وہ لوگ قریب پہنچ رہے ہیں۔“ نوجوان نے کہا۔ وہ دونوں تیزی سے اس خلا میں داخل ہو گئے۔ پہلے ملک سکندر اتر اوا بعد میں ٹایپ۔ ٹایپ نے مڑ کر دیکھا وہ نوجوان اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور پھر اس نے چٹری کے وہ سِل رکھ کر غلابند کر دیا۔

گہری تاریکی تھی۔ ملک سکندر نے تھیلے سے باہر نکال کر چلائی اور اس کی روشنی

جس سے ڈر کر وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

سکندر نے نایاب کے ہاتھ سے نارنج لے لی اور اس کی روشنی میں اوپر ادھر دیکھنے لگا اور پھر اس کا دل بھی اچھل کر ملن میں آگیا۔ گرد آلود فرش پر ایک انسانی ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔

”اوہ۔“ سکندر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”شاید یہ کوئی مسم جو تھا؟ خزانے کی تلاش میں یہاں تک پہنچنے میں کامیاب تو ہو گیا تھا لیکن واپس نہیں جاسکا۔“

”یہ رانی شہا کے محل کا تہ خانہ ہے۔“ نایاب خوف زدہ سے لمبے میں بولی۔

”ہو سکتا ہے یہ ڈھانچہ خود رانی شہا کا یا اس کے کسی مستند خاص کا ہو۔“

”ہو سکتا ہے۔ آگے چلو۔“ سکندر بولا۔

وہ اس ڈھانچے سے بچ کر آگے نکل گئے۔ ہال کے انتہام پر ایک اور کشادہ راستہ تھا اور پھر ایسے کئی راستوں سے گزر کر وہ ایک اور کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے اور پھر سکندر ٹھک کر رک گیا۔ نارنج کی روشنی میں ایک سیاہ ٹاگ نظر آ رہا تھا جو چمن پھیلانے بیٹھا تھا۔ سکندر نے نایاب کو روک لیا اور ہتھول والا ہاتھ آگے کو بڑھا دیا۔ اسی وقت نایاب کے دماغ میں ایک اور دھماکا سا ہوا۔ اس نے سکندر کے ہتھول والے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ سکندر نے ٹرائیگر ڈال دیا۔ بازو ہوا مگر گولی پھٹت میں جا کر لگی۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“ سکندر اچھل پڑا۔

”یہ ٹاگ ہمیں یکہ نہیں کہے گا۔“ نایاب کے منہ سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز میں نکلا۔ ”میرے ساتھ چلے رہے۔“

سکندر اسے گھور کر رہ گیا۔ اور پھر نایاب نے ٹیکہ ہی کیا تھا۔ ٹاگ اپنی جگہ پر بیٹھا جموتا رہا اور وہ دونوں اس کے قریب سے گزر گئے۔

وہ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے سجھلی طرف بھی ایک تنگ سا راستہ تھا وہ اس کمرے سے نکلی کر چیمے ہی ایک اور نیتا بڑے کمرے میں پہنچے سکندر ٹھک کر رک گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کی نظریں سامنے چوتھے پر تیرے جواہرات کے ایک ڈھیر جمی ہوئی تھیں۔

نارنج کی روشنی میں زر و جواہر کے اس ڈھیر سے رنگ برنگی کریں سی پھوٹ رہی

”سکندر بھائی۔“ وہ سرسراہٹ ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”میرا خیال ہے۔ یہ وہی تہ خانہ ہے جہاں میں نے خزانہ دیکھا تھا۔“

”اوہ!“ سکندر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”لیکن مجھے تو یہاں سے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔“

”مجھے لگتا ہے کہ مجھے سب کچھ یاد آ رہا ہے۔“ نایاب نے کہا۔ ”میرے ساتھ آئیے۔“

وہ ایک ہاتھ سے تھے ہوئے جانوں کو ہٹا کر ایک طرف چلے گئی۔ ایک کونے میں اسے ایک تنگ سا راستہ نظر آگیا۔ وہ اس راستے میں داخل ہو گئی۔ سکندر بھی ہتھول سنبھالے اس کے ساتھ ساتھ چلے لگا۔ جلد ہی وہ ایک ایک جگہ پر ٹکل آئے۔ یہ بہت بڑا حال تھا۔ لاتعداد ستون تھے۔ ہر طرف کھڑوں کے جالے تھے۔ یہ جگہ اگرچہ نایاب کو کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ مگر اس کے دل میں ایک عجیب سا خوف تھا۔ اسے ہر حال یہ اطمینان تھا کہ سکندر اس کے ساتھ تھا اور اس کے ہاتھ میں ہتھول بھی تھا۔

سکندر کے دل پر بھی ایک عجیب سا خوف طاری تھا۔ اس نے پراسرار کمائیاں پڑھی تھیں۔ کئی ایسی ٹھیس بھی دیکھی تھیں جن میں اس قسم کے خوفناک مناظر ہوتے تھے اور آج وہ خود کچھ ایسی ہی پراسرار صورتحال سے دوچار تھا۔ اس تہ خانے میں داخل ہونے سے پہلے تک وہ بھی سمجھتا رہا تھا کہ نایاب نے کھنڈروں کے پیچھے تہ خانے اور خزانے کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا تھا وہ کوئی خواب ہوگا لیکن اب وہ خود اس تہ خانے میں موجود تھا اور یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ اور اس کے خیال میں وہ محض اتفاق سے ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ اگر وہ سینہ دوی لباس والا نوجوان انہیں نہ ملتا تو شاید وہ لوگ پھر اس خفیہ راستے کو تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ وہ خود نوجوان کون تھا؟

لیکن سکندر کو اس نوجوان کے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ نایاب چیخ ہوئی اس سے لپٹ گئی تھی۔ اس کی بدحواسی کی وجہ سے نارنج کی روشنی بھی پھٹت کی طرف جا رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ سر بھی بدحواس ہو گیا۔ نایاب نے یقیناً کوئی ایسی چیز دیکھ لی تھی

دیکھ لیا آپ نے۔ اسے کہتے ہیں دیانت اور امانت داری اور اسے کہتے ہیں فرض
ہشامی۔ کتنا فرق ہے انسان اور جانور میں۔“

”ہاں۔ ٹھیک کہتی ہو۔“ سکندر کمراساں لیتے ہوئے بولا۔ ”انسان تو ان ناگوں سے
بھی زیادہ ڈرہلا ہے۔ بہر حال، اگر تم اجازت دو تو میں یہ چند ہیرے اپنے پاس رکھ لوں۔“
”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے سکندر بھائی۔“ نایاب نے کہا۔ ”بلکہ یہ بھی اپنی
جیب میں رکھ لیجئے۔“ اس نے اپنے ہاتھ والے ہیرے بھی اسے دیدیئے۔

وہ لوگ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک شہری سانپ کہیں سے نکل کر سامنے
آگیا۔ وہ نایاب کے پیروں پر چڑھا ہوا ایک طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے
کلن میں ایک سرگوشی گونجی۔
”تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔ جلدی کرو۔“

نایاب چمک گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر سکندر کو اشارہ کرتی ہوئی سانپ
کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

شہری سانپ بڑی تیزی سے رینگ رہا تھا۔ وہ دونوں بھی تیز قدم اٹھاتے ہوئے
چل رہے تھے۔ کئی راہداریوں اور سرگوشیوں سے گزرنے کے بعد ایک ایسی سرگم میں آگئے
جو سیدھی چلی گئی تھی۔

شہری سانپ اچانک ہی غائب ہو گیا۔ لیکن وہ دونوں چلتے رہے۔ سرگم زیادہ کشادہ
نہیں تھی۔ کئی جگہوں پر تو پھٹا ختی نیچے ختی کہ انہیں جگہ کر چنانا پڑا تھا۔
”تقریباً آٹھ گھنٹے بعد وہ ایک کشادہ جگہ پر نکل آئے۔ آگے راستہ بند تھا۔ ملک
سکندر نارنج کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

”میرا خیال ہے ہم غلط راستے پر آگئے ہیں۔ آگے تو کوئی راستہ نہیں ہے۔“ سکندر
نے کہا۔

نایاب بھی پریشان ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ انہیں پھر واپس جانا پڑے گا وہ
ابھی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ ایک جگہ پھٹ پڑے سے مٹی گرے گی۔ اگرچہ بہت ٹھوڑی
مٹی گری تھی لیکن وہ جگہ انہیں نظر آئی تھی جہاں سے مٹی گری تھی۔

سکندر نارنج کی روشنی میں اس جگہ کو دیکھنے لگا۔ پھٹ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ وہاں

تھیں۔ سکندر پلک جھپکے بغیر اس ڈھیر کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا
تھا۔ نایاب کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

”حیرت انگیز۔“ سکندر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”یہی ہے وہ خزانہ؟“ اس نے
نایاب کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

”نہیں سکندر بھائی۔“ نایاب نے جواب دیا۔ ”یہ وہ خزانہ نہیں ہے نہ ہی یہ کمرہ
ہے۔ وہاں تو نامن کی بت بڑی سورتی تھی۔“

سکندر خزانے کے اس ڈھیر کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ جیسے ہی آگے بڑھا ایک کالا
ناگ اچانک ہی کہیں سے نکل کر سامنے آگیا اور چمن پھیلا کر پھنکارنے لگا۔ سکندر ڈر کر
پیچھے ہٹ گیا۔ نایاب آگے بڑھی تو ناگ نے اس کا بھی راستہ روک لیا۔

”پھلو سکندر بھائی۔ اس طرف چلو۔“ نایاب نے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے ہوئے دائیں طرف چل پڑے۔ اس طرف ایک
کشادہ راستہ تھا اور پھر وہ تین راستوں سے گزر کر اس بڑے کمرے میں پہنچ گئے۔ جہاں
چوتھے پر شہری ناگن کا مجسمہ تھا اور اس کے سامنے ہیرے جواہرات کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور
دونوں ڈھیر کے دائیں بائیں چمن پھیلائے بیٹھے تھے۔

سکندر کی آنکھیں حیرت سے پھلتی چلی گئیں۔ وہ کبھی زر و جواہرات کے ڈھیر کی
طرف دیکھتا اور کبھی نایاب کی طرف دیکھنے لگتا۔

”یہ شیتا ہے۔“ نایاب نے نامن کی طرف اشارہ کیا۔ ”رائی شیتا کے خزانے کی
حفاظت۔ اور یہ خزانہ شیتا نے مجھے دیدیا ہے۔“

نایاب نے ڈرتے ڈرتے آگے بڑھ کر اس ڈھیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دونوں ناگ
اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ نایاب نے مٹی بھر ہیرے اٹھا لئے اور پھلتی پھیلا کر نارنج کی روشنی
میں دیکھنے لگی۔ بیروں کی چمک سے ان دونوں کی آنکھیں نیچو ہو رہی تھیں۔ سکندر نے
بھی ڈرتے ڈرتے چند ہیرے اٹھا لئے۔ دونوں ناگ اس وقت بھی آرام سے بیٹھے رہے۔

”ایک بات میری سمجھ میں آ رہی ہے سکندر بھائی۔“ نایاب نے کہا۔ ”یہ خزانہ مجھے
دیدیا گیا ہے۔ اس لئے ان حفاظت ناگوں نے ہمیں ہیرے اٹھانے سے نہیں روکا۔ لیکن
دوسرے کمرہ کا خزانہ میرا نہیں تھا۔ اس لئے اس ناگ نے ہمیں آگے بڑھنے سے روک

سکندر نے کنارے پر آکر باہر بھاگنا دیکھا، ٹیلا وہاں تقریباً ڈیڑھ میل دور تھا اور دوسری طرف تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر گاؤں تھا۔ اس گاؤں کے قریب وجوار میں کوئی بھی نہیں تھا۔

”ٹایاب۔ تم یہاں سے نکل کر گھر چلی جاؤ۔ میں توڑی دیر میں آتا ہوں۔“ سکندر نے کہتے ہوئے کندھے پر لٹکا ہوا ٹیلا اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ لیکن ہسپتال نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔

ٹایاب نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر گاؤں سے نکل کر کچھ دور تک منہ کے کنارے پر چلتی رہی۔ پھر ایک کھیت میں گھس گئی اور تیز خیز قدم اٹھاتی ہوئی چٹھڑی پر چلے گئی۔ وہ دوسری طرف سے گاؤں میں داخل ہوئی تھی۔ پہلی ہی گلی میں چوہدری امانت علی کی بیس اللہ رکھی سے آگے سامنا ہو گیا۔ وہ ٹایاب کو دیکھ کر اس طرح چونکی جیسے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔

”ٹایاب بیٹی تم۔ کہاں سے آ رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”موہر کھیتوں کی طرف گئی تھی۔ خیریت؟“ ٹایاب بولی۔

”ہائے رہا۔“ اسی اللہ رکھی دونوں ہاتھ ملے ہوئے بولی۔

”سیری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”کیا ہو رہا ہے ماسی؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”کیا بتانا بیٹی۔“ ماسی بولی۔ ”سحابت نے پورے گاؤں میں یہ مشورہ کر دیا ہے کہ سکندر حمیس لے کر ان کھنڈروں میں گیا ہوا ہے۔ اس نے تم دونوں کے بارے میں کچھ اٹلی سیدی باتیں بھی کی ہیں۔ وہ گاؤں کے تیس چالیس آدمیوں کو لے کر کھنڈروں کی طرف گیا ہوا ہے۔ یہ تو وہ میرا بیٹیا مگر بڑی گندی فطرت ہے اس کی۔“

اس دوران تین چار اور عورتیں بھی وہاں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ سب ٹایاب کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ ٹایاب کچھ دیر ان کے پاس کھڑی باتیں کرتی رہی پھر گھر آئی۔

کیئہ دغیو کے چروں پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ ٹایاب کو دیکھ کر انہیں کچھ اطمینان ہوا۔

”کہاں تھے تم لوگ تمہارے بھائی کہاں ہیں؟“ کیئہ نے جلدی سے آگے بڑھ

ایک چھوٹی سی دراڑ نظر آئی جس سے اب بھی کچھ مٹی گر رہی تھی۔ سکندر دوسرے ہاتھ سے اس جگہ کو نٹول کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے باغیچہ ٹایاب کے ہاتھ میں دیدی اور دونوں ہاتھوں سے چمت سے اس جگہ کو نٹولنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ موجود ہے۔

سکندر کا خیال درست نکلا۔ توڑی ہی دیر بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ پتھر کی ایک سل حتی جو بالکل انظر نگ آ رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سل کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے باپوسی نہیں ہوئی۔ سل آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی گئی۔

وہ غلا اتنی چوڑی تھی کہ ایک آدمی آسانی سے نکل سکتا تھا۔ سکندر پہلے کچھ دیر تک باہر کی کوئی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا پھر چمت کے کنارے کو چلا کر آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔

سکندر نے باہر نکل کر ٹایاب کو بھی اوپر کھینچ لیا اور دونوں نے پتھر کی وہ سل اٹھا کر دوبارہ غلا پر رکھ دی۔ اور پھر وہ دونوں جیسے ہی مڑے چوک گئے۔ سیندوری لباس والا وہ خوب نوجوان ایک طرف بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹایاب کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بڑی دلچسپ مسکراہٹ آئی تھی۔

”اوہ تم۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ لوگ کہاں ہیں؟“

”وہ کھنڈروں میں تم لوگوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ تم لوگ اس طرف سے نکل جاؤ۔“ نوجوان نے ایک طرف اشارہ کیا۔

سکندر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر وہ چوک گیا۔ یہ ایک تنگ سا غار تھا۔ وہ اس غار سے باہر آنے تو یہ دلچسپ اور سسٹی خیر انکشاف ہوا کہ وہ اس وقت گاؤں میں تھے۔

گاؤں کے باہر والی ضرر پورا آگے چھوٹا سا ٹیلا تھا جس میں کسی زمانے میں گاؤں کی بانی گئی تھی۔ ٹیلے کو اندر سے کھود کر ایک کشادہ سرنگ بنائی گئی تھی جس کے دوسری طرف بھی راستہ تھا۔ سر کا پانی اس گاؤں کے اندر تک چلا گیا تھا۔ جس وجہ سے اس گاؤں میں ٹھنڈک رہتی تھی۔ پرانے زمانے میں نہوں اور دریاؤں کے کنارے اسی قسم کی گاؤں سکونت ہوتی تھیں۔ جنہیں امراء اور رؤسا گرمیوں میں اپنی آرام گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

گاؤں سے نکل کر سکندر نے گھوڑی کو کھڑوں کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دیا۔ اسے نیلے کے قریب پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ نیلے کو واقعی لوگوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ سکندر قریب پہنچا تو سانسے کھڑے ہوئے آدمی اسے دیکھ کر چونک گئے۔ ان کے چروں پر شدید حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ لوگ ملک سکندر اور نایاب کو کھڑوں میں تلاش کر رہے تھے اور وہ گاؤں کی طرف سے آ رہا تھا۔

اور پھر یہ خبر نیلے پر کھڑوں میں پھیلے ہوئے تمام لوگوں تک پہنچ گئی کہ ملک سکندر کھڑوں میں نہیں ہے۔ وہ گاؤں سے آ رہا ہے۔ لوگ کھڑوں سے نکل کھل کر جمع ہونے لگے۔ ہر ایک کے چہرے پر حیرت کے تاثرات تھے۔ چوہدری سعادت کے چہرے پر تو جیسے ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

”آج میری ایک بات غور سے سن لے چوہدری!“ ملک سکندر نے جیب سے پتوں نکال کر کہا۔ وہ گھوڑے پر ہی بیٹھا رہا۔ ”جتنے جیسے غیرت آدمی آج تک میری نظروں سے نہیں گزرے۔ تو نے اپنی بھانج پر الزام لگایا ہے۔ ذوب مر شرم سے۔ غیرت کر۔ اپنے مرے ہوئے بھائی کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکتا؟ اسے اس طرح بدنام بھی نہ کر۔ تم لوگ بد قسمت ہو کہ اس جیسی شریف اور نیک لڑکی کو ٹھکرا دیا۔ یا شاید تم لوگ واقعی اس قابل نہیں ہو کہ شریف لڑکی تمہارے خاندان میں آسکتی۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”تم نے مجھ پر بھی الزام لگایا ہے۔ میں ابھی تمہیں گولی مار سکتا ہوں مگر میں بات کو بدھانا نہیں چاہتا۔ نایاب کو میں نے بن کہا ہے۔ وہ مجھے زخم اور عذرہ کی طرح عزیز ہے۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ گاؤں والے جانتے ہیں کہ ہم رشتہ بھانا جانتے ہیں۔ ہم بہت بڑے زمیندار اور جاگیردار سعی لیکن تمہارے کردتوں نے نہ صرف تمہارے اپنے خاندان بلکہ گاؤں والوں کے چروں پر بھی کالک مل دی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا شروع ہو جائے۔ میں تمہیں پہلا اور آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر آئندہ میں نے تمہاری طرف سے کوئی ایسی بات سنی تو پھر میں ان گاؤں والوں کے سامنے نکتا ہوں کہ ہماری کھلی دشمنی ہے۔“

”کیوں بھی چوہدری۔“ منظور ناں ایک شخص نے کہا۔ ”اب کیا خیال ہے تم کو تکتے تھے کہ تم نے ان دونوں کو کھڑوں میں دیکھا ہے۔“

کر پوچھا۔
”آپ کو معلوم ہے بھابھی ہم کہاں گئے تھے۔“ نایاب نے کہا۔ ”سکندر بھائی ابھی آرہے ہیں۔ سعادت نے جو حرکت کی ہے مجھے اس کا پتہ چل گیا ہے۔ آپ دیکھئے تو میں اس کا کیا حشر کرتی ہوں۔ انکل کہاں ہیں؟“

”انہیں دیر سے پر پتنام بھیجا ہے۔ وہ بھی آرہے ہوں گے۔“ سیکند نے جواب دیا۔ ”سعادت اور اس کے آدمی بندوقیں لے کر کھڑوں کی طرف گئے ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔۔۔“

”بھابھی۔“ نایاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ کو مجھ پر اور اپنے شوہر پر اعتماد ہے نا؟ سعادت نے ہم پر جو الزام لگایا ہے۔ وہ خود یہ ذلیل ہوگا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر عذرہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ”عذرہ مجھے چائے پلاؤ۔ سر میں بہت شدت کا درد ہو رہا ہے۔“ وہ آگے بڑھ کر برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

تین چار منٹ بعد سکندر بھی پہنچ گیا۔ سیکند اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر سکندر اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ جیب سے ہیرے نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔

”میں باہر جا رہا ہوں۔ واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ پریشان نہ ہونا اور انہیں سنبھال کر رکھنا۔“ وہ نکتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔

سیکند ہیرے دیکھ کر اچھل پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ہیروں سے زیادہ چمک ابھر آئی تھی۔

سکندر صحن کے اس حصے میں آگیا جہاں گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے گھوڑی کھولی اور اس پر زمین ڈالے بغیر لگام پکڑ کر باہر لے گیا۔ کھلی میں آکر وہ اچک کر گھوڑی پر سوار ہوا اور اسے ہلکی سی ایڑھ لگا دی۔

یہ افواہ پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی کہ سکندر نایاب کو لے کر نیلے والے کھڑوں میں گیا ہوا تھا۔ یہ افواہ پھیلانے والا چوہدری سعادت تھا۔ اس کے آدمیوں نے تو یہ بھی مشہور کر دیا تھا کہ سکندر اور نایاب نے ناجائز تعلقات ہیں۔ گاؤں میں انہیں موقع نہیں مل رہا تو سکندر اسے لے کر کھڑوں میں چلا گیا۔ سکندر کو دیکھ کر لوگ حیران بھی ہوئے تھے اور یہ سوچ کر پریشان بھی ہو رہے تھے کہ آج کچھ ہوئے والا ہے۔

کسی وقت بڑھ سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے سوچا تھا کہ اس معاملے کو آج ہی ختم کر دیا جائے۔ میننگ میں ملک سکندر کے علاوہ چوہدری امانت علی اور اس کے بیٹے سعادت کو بھی بلایا گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سعادت سب کے سامنے ملک سکندر سے معافی مانگ لے اور دونوں کو گلے لگا دیا جائے تاکہ قصہ ختم ہو جائے۔

ملک سکندر تو میننگ میں آگیا تھا مگر باپ بیٹا نہیں آئے تھے۔ تقریباً "ایک گھنٹے تک انتظار کیا گیا۔ پیغام بھی بھیجا گیا مگر وہ نہیں آئے۔

رات دس بجے کے قریب سکندر حویلی واپس آگیا۔ گھر کے لوگ حسب معمول بیٹھک میں جمع تھے۔ سکندر بھی وہیں آکر بیٹھ گیا۔

"کچھ فیصلہ ہوا میننگ میں؟" ملک صاحب نے سکندر سے پوچھا۔

"وہ باپ بیٹا آئے ہی نہیں۔ فیصلہ کیا ہوا تھا۔" سکندر نے جواب دیا۔ "ویسے سب لوگ سمجھ گئے تھے کہ اس حرکت سے سعادت کا مقصد کیا تھا۔ وہ دراصل ٹایاب کے خلاف ایسی شلوغی مچ کرنا چاہتا ہے جو اس کے کیس پر اثر انداز ہو سکیں۔ یہ افواہ بھی اسی نے پھیلائی تھی کہ وہ انسان نہیں مانگن ہے اور میرا خیال ہے وہ اس سلسلے میں کچھ اور بھی کرے گا۔ اس جیسے شخص سے بھلائی اور شرافت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔"

ایسے بد نیت لوگ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔" ملک صاحب اس کے خاموش ہونے پر بولے۔ "وہ اپنی چالوں میں ایک نئے ایک دن خود ہی پھنس جائے گا۔"

"لیکن اب اس کا کوئی تو بندوبست کرنا ہی پڑے گا نا۔" سکندر نے کہا۔

"پولیس کل ماتھے کسار کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ وہ اس کی زبان کھولا لیس گئے قتل کا معاملہ ہے۔ اگر چوہدری کا نام آگیا تو پھر وہ اس پر سے نہیں نکل سکے گا۔"

"اچھا بھئی۔" ملک صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں تو سوئے جا رہا ہوں تم لوگ بیٹھو۔ باتیں کرو۔"

ملک صاحب کے جانے کے بعد سکندر، کینز کو اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا وہ برآمدے میں کھڑا تھا کہ کینز آگئی۔

"وہ ابھرے مجھے دو اور ٹایاب کو ایبائی کے کمرے میں بھیج دو۔ ان دونوں لوگوں کو تم باتوں میں لگائے رکھنا۔ یہ ادھر نہ آئے پائیں۔" کینز نے کہا۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں منظور چاچا میں نے اور میرے ان بندوں نے اپنی آنکھوں سے ان دونوں کو کھڑوں میں چھپتے ہوئے دیکھا تھا۔" چوہدری سعادت نے کہا۔

"اس پرے ٹیلے کو چاروں طرف سے لوگوں نے گھیرا ہوا ہے۔ جی بھی ہماری نظروں میں آئے بغیر نہیں جاسکتی۔ اگر یہ کھڑوں سے نکل کر گئے تھے تو ہم میں سے کسی کو نظر کیوں نہیں آئے۔" منظور نے کہا۔

"میں قسم کھاتا ہوں منظور چاچا۔"

"کچھ حیا کر چوہدری۔" منظور نے ایس کی بات کاٹ دی۔ "اپنے ہی گھر کی عزت کو اس طرح مٹی میں ملا رہے ہو۔ شرم کرو۔ جائیداد کا بھڑا ہے۔ تو عدالت میں جا کر مقدمے کا سامنا کرو۔ کیوں اپنے آپ کو اس طرح دوسروں کی نظروں سے گرا رہے ہو۔"

اور پھر دوسرے لوگ بھی بولنے لگے۔ وہ رہتے میں پھولے لوگ تھے جو اسے اس طرح ذلیل کر رہے تھے اور یہ پلا موقع تھا کہ چوہدری سعادت اس طرح خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

"ٹایاب بی بی کہاں ہے ملک بی۔" ایک آدمی نے پوچھا۔

"وہ گھر پر ہے۔ آپ لوگ جا کر دیکھ لیں۔" سکندر نے جواب دیا۔

"سن لے چوہدری۔" منظور چاچا نے سعادت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے گھر کی عزت کو ان لوگوں نے سینے سے لگا رکھا ہے اور تم اسی کو برہم کر رہے ہو۔"

چوہدری سعادت کوئی جواب دینے بغیر لوگوں کو دیکھ رہا تھا وہاں سے چلا گیا۔ گاؤں کے لوگ کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر وہ سب گاؤں کی طرف چل دیے۔ سکندر کچھ دور تک ان کے ساتھ رہا پھر اس نے گھوڑی کا رخ اپنے ڈیرے کی طرف موڑ دیا۔

دسویں قسم

اس رات چچال میں گاؤں کے معززین اور بزرگوں کی میننگ ہوئی تھی۔ گاؤں والوں کے خیال میں یہ ایک بہت سنگین مسئلہ تھا۔ اگر ملک سکندر محضے دماغ کا نہ ہوتا تو بات بگڑ سکتی تھی۔ یہ اس کی تھنڈی تھی کہ اس نے جوش و جذبہ میں آکر چوہدری سعادت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ لیکن گاؤں والوں کا خیال تھا کہ بعد میں بات

پتا چل گیا تو ٹایاب کی زندگی کو مزید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ اچھا میں ابائی کے کمرے میں جا رہا ہوں۔ تم ٹایاب کو وہیں بھیج دو۔“ سکندر ملک صاحب والے کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد ٹایاب بھی وہاں آئی۔ سکندر نے دروازہ بند کر کے اندر سے کڑا لگا دیا اور ملک صاحب کو ہیرے دکھانے لگا۔ ٹایاب بھی ایک دو ہیرے اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”یہ تو بہت قیمتی ہیرے ہیں۔ کہاں سے ملے؟“ ملک صاحب نے پوچھا۔

ٹایاب اور سکندر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور پھر سکندر نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ سچ ہے کہ چودری سعادت جب اپنے آدمیوں کو کھنڈروں میں لے کر پٹنچا تو ہم وہیں تھے اور خزانے کا راستہ تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے شاید ہمیں دیکھ بھی لیا تھا اور ڈرانے کے لئے ہوائی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ان کی باتوں سے ہم ان کے ارادے بھانپ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں تلاش کر لیتے ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سینوری رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ایک نوجوان ہمیں مل گیا۔ وہ پتہ نہیں کون تھا۔ اور کہاں سے آیا تھا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا اور ایک خفیہ راستے کے پیچھے ہمیں کھنڈروں کے نیچے ترہ خانے میں پٹنچا دیا۔ اس طرح ہم اس خزانے تک پہنچ گئے۔ یہ چند ہیرے ہم نے وہیں سے اٹھائے تھے۔“

”لیکن اس قسم کے خزانوں پر تو سنا ہے سانپ پروہ دیتے ہیں۔“ ملک صاحب نے کہا۔

”اس خزانے کی حفاظت بھی سیاہ ناگ ہی کر رہے ہیں۔“ سکندر نے کہا۔ ”لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس شہرے سانپ کی وجہ سے ٹایاب کی ان سے دوستی ہو گئی ہے اور ابائی..... جس ڈھیر سے ہم نے یہ چند ہیرے اٹھائے ہیں وہ پورا ڈھیراب ٹایاب کی ملکیت ہے۔ اتنا بڑا خزانہ میں نے صرف قلموں میں دیکھا ہے یا آج زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ویسے آپ کے خیال میں ان کی کیا قیمت ہوگی۔“

ملک صاحب ایک بار پھر ایک ایک ہیرو اٹھا کر دیکھنے لگے۔

”مجھے صحیح اندازہ نہیں لیکن ان کی مالیت کا اندازہ لاکھوں میں لگایا جاسکتا ہے۔ صحیح قیمت تو کوئی جوہری ہی بتائے گا۔“ ملک صاحب نے ہیرے سکندر کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ کو دیدو“ انہیں سنبھال کر کہہ لے۔ یہ ہیرے ٹایاب بیٹی کی امانت ہیں۔ یہ جب شہر

کیونکہ باورچی خانے میں گھس گئی۔ اس نے وہ ہیرے شیٹ پر رکھے ہوئے ایک پیالے میں رکھ دیئے تھے۔ اس نے ہیرے پھیلی پر اڑھیلے تو وہ بلب کی روشنی میں جیگا اٹھے۔ رنگ برنگی کرنیں پھوٹ رہی تھیں ان ہیروں کی تعداد چودہ تھی۔ ان میں دو ہیرے تو ایسے جو کوثر کے انڈے سے بھی بڑے تھے۔

”یہ کہاں سے ملے آپ کو؟“ سیکند نے باہر آکر ہیرے سکندر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں یاد ہے ٹایاب نے اس روز کھنڈروں کے نیچے خزانے کی بات کی تھی۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور ہم دو دن سے وہ خزانہ تلاش کر رہے تھے اور آج محض ایک اتفاق کے تحت ہم اس خزانے تک پہنچ گئے۔“

”کیا واقعی؟“ سیکند نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں سیکند۔“ سکندر بولا۔ ”اتنا بڑا خزانہ ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اتنے بڑے بڑے ڈھیر لگے ہوئے ہیں وہاں تو۔ میں نے اور ٹایاب نے اس ایک ڈھیر میں سے یہ چند ہیرے اٹھا لئے تھے۔“

”کیا واقعی وہ خزانہ بہت بڑا ہے؟“ سیکند نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی حیرت کے تاثرات نظر آرہے تھے۔

”ہاں سیکند۔ اتنا بڑا۔“ سکندر نے دونوں ہاتھیں پھیلا کر بتایا۔ ”وہ خزانہ دراصل رانی شہا کا ہے جو کسی زمانے میں یہاں ریاست کی مالک تھی۔ اس خزانے کی حفاظت نامن نے خزانے کا ایک حصہ یعنی وہ ڈھیر ٹایاب کو دے دیا ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے سیکند۔ سوئے چاندی کے زیور، سونے کے برتن، ہیرے، موتی اور ایک خوبصورت تاج بھی ہے۔“

”ہائے اللہ۔“ سیکند کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اگر وہ خزانہ ہمیں مل جائے تو۔۔۔“

”کیا کبھی سوچتا بھی مت سیکند۔“ سکندر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ خزانہ ٹایاب کا ہے۔ ہمارا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ ہمارے پاس تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ کسی کسی چیز کی ہے۔ ویسے اس خزانے کی وجہ سے ٹایاب کے حوالے سے اب ہماری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ اس بات کو اپنے تک ہی رکھنا۔ اگر کسی کو اس خزانے کے بارے میں

سانپ ایک مخصوص عمر کے بعد اپنا بسروپ بدلنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ ایسی باتیں تو اس نے فلموں میں بھی دیکھی تھیں۔ لیکن نہیں۔ اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ شیتا تاکن نے بتایا تھا کہ بچو ابھی بچہ ہے اور سانپ کا کوئی بچہ اپنا بسروپ بدلنے پر قادر نہیں ہو سکتا تھا۔

تو پھر وہ کون تھا؟ ٹایاب اس حسین نوجوان کے بارے میں یہی سب کچھ سوچتی ہوئی نیند کی آغوش میں بیچ گئی اور وہ خواب میں بھی اس اجنبی اور خوبرو نوجوان کو ہی دیکھتی رہی۔

صبح وہ دیر سے اٹھی تھی اور سب سے پہلے اس نے جو خبر سنی وہ بڑی سنسنی خیز تھی۔

ماجھا کھارا گزشتہ رات نور پور تھانے کے حوالات سے فرار ہو گیا تھا اور اس کی لاش صبح چھ بجے نور پور ریلوے اسٹیشن کے بیت الخلا میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ کسی نے اسے منجھڑ کے پہرے دار کر کے ہلاک کر دیا تھا۔



جائے گی تو اس کے حوالے کر دیتا۔

وہ تقریباً ”آدھ گھنٹہ مزید وہاں بیٹھے باقی کرتے رہے۔ پھر ملک صاحب کے کمرے سے نکل آئے۔ سکندر اور سکینہ تو اپنے کمرے میں چلے گئے اور ٹایاب اپنے کمرے میں آگئی۔ نرمس اور عذرہ اس کی منتظر تھیں۔ ان دونوں نے اسے اپنے بیچ میں لے لیا اور باتیں کرنے لگیں۔

”کیا قصہ ہے ٹایاب بائی۔“ عذرہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ ”کوئی بہت ہی خاص بات ہے جو ہم سے چھپائی جا رہی ہے۔“

”کوئی خاص بات نہیں۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”معاذت کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے کہ اس کے گلے میں پٹاکس طرح ڈالا جائے۔“

”یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔“ عذرہ نے کہا۔ ”اے پکڑ کر پٹا ڈال دیا جائے۔“

”اس جیسے لوگوں کو پٹا ڈالنا آسان نہیں ہوتا۔ سرمال، سو جاؤ آپ بارہ بج چکے ہیں۔“

لیکن عذرہ باز آنے والی نہیں تھی۔ وہ مسلسل پوچھتی رہی اور بالاخر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور کچھ دیر بعد وہ سو گئی۔ نرمس بھی سو چکی تھی۔ لیکن ٹایاب کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سیندری لباس والے اس حسین نوجوان کے بارے میں سوچ رہی تھی جو انہیں کھنڈروں میں ملا تھا۔ ایسا مردانہ حسن اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کا تصور ذہن میں آتے ہی ٹایاب کے سینے میں ایک گداز سا احساس جاگ اٹھا۔ وہ اپنے پورے جسم میں گدگدی سی محسوس کرنے لگی۔ اس حسین نوجوان کا چہرہ بار بار اس کے سامنے آ رہا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اسے ذہن سے نہیں جھٹک سکی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کون تھا۔ ان کھنڈروں میں کہاں سے آیا تھا اور پھر اسے خزانے کا راستہ کیسے معلوم تھا۔ وہ انہیں چوہدری سعادت اور اس کے آدمیوں سے پچانا چاہتا تھا یا انہیں خزانے کا راستہ دکھانا چاہتا تھا۔ کیا اسے معلوم تھا کہ ہم لوگ خزانے کی تلاش میں وہاں بھٹک رہے ہیں۔ یا یہ محض اتفاق تھا کہ اس نے انہیں سعادت اور اس کے ساتھیوں سے پچانے کے لئے اس خفیہ سرگرمی میں پھنسا دیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اس سرگرمی کے بارے میں پہلے سے جانتا ہو۔

دفعۃً اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ وہ حسین نوجوان منجھڑ تو نہیں تھا۔

”چاک ہی پروگرام بن گیا۔ اب جلی چلو نا۔“ ٹایاب نے کہا۔
 ”اب نہیں بھئی۔“ زکس نے جواب دیا۔ ”آج تو مجھے یہ کپڑے دھوئے ہیں۔ اسی
 برکتے کی بونہار ہے۔ وہ کئی دن سے آئیں دیں۔ میلے کپڑوں کا ڈیمرنگل جا رہا ہے۔ آج
 ”توان سے نمٹ ہی لوں۔“

ٹایاب جواب دے بغیر ملک صاحب کے کمرے میں آگئی اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی
 اوپر والی درواز کھول کر چابیوں کا گچھا نکالا اور سکندر والے کمرے میں آگئی جہاں ٹیکو
 الماری کھولے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

”بھابی! میں نور پور جا رہی ہوں۔ دو تین کپڑے لگ جائیں گے۔“ ٹایاب نے کہا۔
 ”اے! آج تمہارا ملازم الخلف پوچھ رہا تھا کہ شربک جاتا ہے۔“ ٹیکو نے کہا۔
 ”اوہ! اسے تو میں بھول ہی گئی تھی۔ کہاں ہے وہ؟“ ٹایاب بولی۔
 ”کیتوں پر چلا گیا ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”دوپے تم عجیب لڑکی ہو۔ شرمیں
 تمہارا پینٹیشن چاہیں لاکھ لاکھ جگہ ہلا کر رکھ کر دیا گیا اور تم سب کچھ بھول گئی ہو۔“
 ”اے! بھابی! ٹایاب مسکرائی۔ ”یہاں کے معاملات کچھ ایسے ہی پیچیدہ ہوتے جا
 رہے ہیں کہ ان میں الجھ کر میں تو واقعی بھول گئی تھی۔“

”یہاں کے معاملات میں تو تم بلاوجہ الجھ رہی ہو۔“ ٹیکو نے کہا۔ ”تم صرف اپنے
 معاملات پر توجہ دو۔۔۔ شرمیں میں تو کسی حد تک قانون چٹا ہے اور لوگ کوئی قدم اٹھانے
 سے پہلے سوچتے بھی ہیں لیکن یہ گاؤں ہے، یہاں کوئی فیصل قانون کو نہیں سمجھتا۔
 زمینداروں، وڈیروں اور جاگیرداروں کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہی قانون بن جاتے
 ہیں۔ یہاں کے لوگ صرف وہ بات سمجھتے ہیں جو وڈیرے کہتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی سوچ
 نہیں ہوتی۔ وہ صرف احکامات کی قہیل کرتا جاتے ہیں۔ گاؤں دیساؤں میں کبھی کبھار پولیس
 کو مداخلت کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جرم اگر وڈیروں کا ہوتا ہے تو سزا غریب مزارعوں اور
 کارندوں کو ملتی ہے۔ وڈیروں کے خلاف زبان کھولنے کی کبھی کوئی ہمت نہیں کرتا اور جو
 زبان کھولنے کی ہمت کرتے ہیں ان کا انجام عبرت انگیز ہوتا ہے۔ آج جو لوگ دبے لیجے
 میں تمہاری حمایت کر رہے ہیں وہ بھی اندر سے خوفزدہ ہیں۔ کچھ مثالیں تمہارے سامنے آ
 چکی ہیں۔ شیشن مانسر عیدالغنی نے جہیں پناہ دی۔ اس کی بیوی راشدہ نے حمیس سعادت

ہاتھ کسار کے حالات سے فرار اور قتل کی خبر سننی خیر ضرور تھی لیکن ٹایاب کے
 لئے غیر متوقع نہیں تھی۔ اس رات چودریوں کی حویلی میں تھانیدار کو کھری کھری سنانے کا
 یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اس نے اگلے ہی روز ہاتھ کسار کو پکڑ لیا تھا اور ٹایاب کو توقع تھی
 کہ اس سے پوچھ گچھ کے دوران کچھ سننی خیر افکاشات ہوں گے اور پولیس ریلے
 ہوائنٹن میں عبدالرشید کے قاتلوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

مابجا کسار دو دن پولیس کی حراست میں رہا تھا۔ اس دوران پولیس اس سے کچھ معلوم
 کر سکی تھی یا نہیں، اس سلسلے میں ٹایاب کو کچھ علم نہیں تھا لیکن تیسری رات ہاتھ کسار کا
 تھانے کی حوالات سے فرار ہو جانا حیرت انگیز ہی نہیں معنی خیز بھی تھا اور وہ غالباً فرار بھی
 اسی لئے ہوا تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ ٹایاب کو اس معاملے میں بھی کچھ گزیر نظر آ رہی
 تھی۔

ملک صاحب اور سکندر کیتوں پر جا پکے تھے۔ ٹایاب ہاتھ کسار کے قتل کے سلسلہ
 میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی اور اس کے لئے نور پور جانا ضروری تھا۔ وہ
 تھانیدار سے ملنا چاہتی تھی۔

ناشہ کرنے کے بعد ٹایاب نور پور جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ جب وہ اپنے کمرے
 سے باہر نکلی تو زکس کپڑوں کا گتھر اٹھائے محن میں بیٹھ پب کی طرف جا رہی تھی۔ وہ
 ٹایاب کو دیکھ کر رک گئی۔

”کیس جا رہی ہو؟“ زکس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ نور پور جا رہی ہوں مجھے گاڑی چاہئے۔“ ٹایاب نے کہا۔

”گاڑی کی چابی لابی کے کمرے میں بیڈ سائیڈ ٹیبل کی اوپر والی درواز میں رکھی ہوئی
 ہے۔“ زکس نے کہا۔ ”اگر آپ پہلے بتائیں تو میں بھی ساتھ چلتی۔“

آپ سے تفصیل سے بات کروں گی۔“

وہ حویلی کے چھانک کی طرف بڑھی تھی کہ عذرہ اندر داخل ہوئی۔

”ارے آپ کہاں جا رہی ہیں بائی! میں تو آپ کو لینے آئی تھی۔“ وہ بولی۔

”وہ کس لئے؟“ ثایاب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ناسورہ کی شادی ہے نا۔ ان کے گھر میں خوب گانا بجانا ہو رہا ہے اسی لئے تو میں آپ کو لینے آئی ہوں۔“ عذرہ نے جواب دیا۔

”شادی تو کل ہے نا۔“ ثایاب مسکرائی۔ ”نکل چلوں گی۔ آج تو میں لورپور جا رہی ہوں۔ ایک ضروری کام ہے۔ تم نے کچھ منگوا تو نہیں؟“

”نہیں۔“ عذرہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اچھا چلو۔ گہراج والے مکان کا دروازہ کھولو۔ مجھے گاڑی نکالنی ہے۔“ ثایاب نے کہا۔

عذرہ اس کے ساتھ ہی باہر آگئی۔ اس نے ساتھ والے مکان کا پھانک کھول دیا۔ ثایاب اندر داخل ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور اجنبی اشارت کر کے اسے ریموس میں باہر لے آئی اور پھر تقریباً پانچ منٹ بعد مرینڈیز ہائی وے کی طرف جانے والی سڑک پر متوسط رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

گاڑی چلتے ہوئے وہ کینڈہ کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ گزشتہ روز جب وہ کھنڈروں سے واپس آئی تھی تو اس نے محسوس کیا تھا کہ کینڈہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ کل پورے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ سکندر، ثایاب کے ساتھ ٹیلہ پر کھنڈروں میں گیا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اور بائیں بھی پھیلانی گئی تھیں۔ ان باتوں میں صداقت نہ سہی مگر کینڈہ، سکندر کی بیوی تھی اور کوئی عورت یہ برواغت نہیں کر سکتی کہ اس کے شوہر کے نام کے ساتھ کسی دوسری عورت کا نام آئے۔ کینڈہ بڑھی کمسنی تھی لیکن یہ معاملہ ایسا تھا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک دوپٹے اور پھر آج کی باتوں سے بھی ثایاب نے محسوس کیا تھا کہ کینڈہ کی خواہش ہے کہ اب وہ یہاں سے چلی جائے۔

ثایاب جانتی تھی کہ اسے ملک صاحب کے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کی نظروں سے گراہنے کیلئے چوہدری سعادت اس قسم کے اوجھے جھنڈے استعمال کرے گا۔ سکندر نے

کے بارے میں بتا دیا۔ ان کا انعام تم نے دیکھ لیا۔ انہیں زندہ جلا دیا گیا۔ تم نے ریلے کے ہوائنٹس میں عبدالرشید سے مل کر اسے ریلوں کی شناخت کیلئے کامہ کر لیا لیکن پولیس تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور پھر پولیس نے ہاتھ کسار کو پکڑا۔ وہ اس سے عبدالرشید کے قتل کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اسے بھی مار دیا گیا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ پولیس واقعی اسے پوچھ گچھ کے لئے پکڑ کر لے گئی تھی۔ تم شرمیں ملی ہوئی ہو۔ تعلیم یافتہ ہو لیکن بیوقوفی کی حد تک سادہ لوح ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ کوئی دڈیہ یا زمیندار جب اپنے کسی کارندے سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے کچھ ایسے ہی طریقے اپنائے جاتے ہیں کہ خود ان پر کوئی شبہ نہ ہو۔ ماجھا کسار ویسے ہی بدنام آدمی تھا۔ گاؤں کے لوگ اس سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ پولیس جب اسے پکڑ کر لے گئی تھی تو لوگ خوش ہوئے تھے۔ اس کے قتل پر بھی کسی کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا نہیں ہوں گے۔ کوئی اس کے لئے افسردہ یا غمگین نہیں ہو گا۔ کوئی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرے گا کہ اسے کس نے اور کیوں قتل کیا؟ کوئی اس کے قتل کی تحقیقات کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ بدلتوں میں دو چار روز اس کے قتل کی بازگشت سنا دی دے گی اور۔۔۔ لوگ اسے بھول جائیں گے۔ لوگ یاد رکھیں گے تو صرف زمینداروں اور وڈروں کو جن کا یہاں حکم چلتا ہے۔ سزارسے اور ہاری، ظلموں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ زمینداروں اور وڈروں سے بدعات نہیں کر سکتے۔ یہ سلسلے تو صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ان کے معاملات میں مداخلت مت کرو۔ صرف اپنے کام پر دھیان دو اور ثایاب! وہ خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”میری بات کا برا مت میرا تو مشورہ ہے کہ چوہدریوں کی جائیداد سے اپنا حصہ بھول جاؤ۔ خدا نے جسے اب اتنا کچھ دے دیا ہے کہ یہ پورا علاقہ تو کیا اس سے دس میں گنا زمینیں خرید سکتی ہو۔ یادو ج بھگڑوں میں لیجئے سے کیا فائدہ۔“

”بھائی یہ بھگڑا یادو ج کا نہیں ہے۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ وڈرے اور جاکیروار کیسے بنے؟ دوسروں کا حق مار کر۔“ ان میں اپنا حق چھوڑ دینا تو کل کسی اور کا بھی حق ماریں دے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اب اگر میں پیچھے ہٹ گئی تو یہ لوگ مجھے جین سے نہیں بیٹھے دیں گے۔ میں ان کی فطرت جان چکی ہوں۔ برہمچال، واپس آکر میں

سلاخوں والے آہنی دروازے لگے ہوئے تھے۔ وائزلیس روم میں بھی کم از کم ایک آدمی چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر موجود رہتا تھا۔
ایس ایچ او کے دفتر کے ساتھ ایک اور مختصر راپداری بچھل طرف بھی جاتی تھی۔ اس راپداری میں پچھلا دروازہ دوہرا تھا۔ اندر کی طرف کلیدی کا دروازہ اور باہر کی طرف موٹی سلاخوں والا آہنی دروازہ۔

ٹایاب نے بڑی گہری نگاہوں سے ان چیزوں کا جائزہ لیا تھا۔ دراصل وہ اس بات کا اندازہ لگا چاہتی تھی کہ ایسی صورتحال میں لاک اپ میں بند کسی قیدی کے فرار ہونے کے امکانات کتنے فیصد ہیں۔

ٹایاب جب تھانے میں داخل ہوئی تو اسے اسی وقت بتا دیا گیا تھا کہ تھانیدار صاحب کو مل بازار گئے ہوئے ہیں جہاں ڈیکٹی کی ایک واردات ہو گئی ہے۔ انہیں واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ ٹایاب ڈیوٹی آفس کے کمرے میں آکر بیٹھ گئی جہاں ہیڈ کانسٹیبل ڈیوٹی آفسروالی میز پر بیٹھا ہوا تھا اور ایک اسے ایس آئی اور دو کانسٹیبل ایک طرف بیٹھے کہیں بانگ رہے تھے۔

ٹایاب ایک طرف بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد تھانیدار آگیا۔ اس کے ساتھ سب انسپکٹر ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل بھی تھے۔ دونوں کانسٹیبل ایک آدمی کو مارے اور دنگے دیتے ہوئے اندر لا رہے تھے۔ اس آدمی کے سر سے اور ناک اور ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ دہائی ہی تھا۔ لٹھے کی ٹیلی سی دھوٹی اور دھاری دار قمیض پہنے ہوئے تھے۔ پیروں میں ہوائی چل تھی۔ دائیں ہیر کی چنل کے اسٹریپ پر جوڑ لگا ہوا تھا۔

تھانیدار سب انسپکٹر کو لے کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور کانسٹیبل نے اس دہائی کو راپداری میں فرش پر بٹھا دیا تھا۔ دہائی کبھی اپنے سر اور کبھی ناک اور ہونٹوں سے خون پونچھتے ہوئے رو رو کر کہہ رہا تھا کہ وہ بے قصور ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔

ٹایاب تقریباً پانچ منٹ تک ڈیوٹی آفس کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ پھر ایس ایچ او کے کمرے میں آگئی۔ اس وقت سب انسپکٹر اس کمرے سے نکل رہا تھا۔ تھانیدار نے ٹایاب کو

بتایا تھا کہ گزشتہ روز ٹیلے کے قریب جمع لوگوں نے سعادت پر بڑی صحن صحن کی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں وہ سکندر اور ٹایاب کے خلاف درغلہ کرکھڑوں کی طرف لے گیا تھا۔ یہ تو وہ لوگ تھے جن کے سامنے سعادت کا جھوٹا کل گیا تھا لیکن گاؤں کے بست سے لوگ ایسے تھے جنہیں اصل بات کا پتہ نہیں چلا تھا اور وہ اب بھی ٹایاب کے کردار پر شبہ کر سکتے تھے۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ٹایاب نے سر جھٹک دیا۔ اسے ایسی باتوں کی پروا نہیں تھی۔ اس کا کردار بے داغ تھا اور لوگ چودری سعادت کے بارے میں بھی جانتے تھے کہ وہ کس قدر جھوٹا اور مکار انسان ہے۔ گزشتہ چند دنوں کے دوران پیش آنے والے بعض واقعات نے تو اس کا رہا سا احمق بھی کھو دیا۔

نور پور پیچ کر ٹایاب نے گاڑی فضل پچا کی دکان کے سامنے کھڑی کر دی اور مختلف سڑکوں پر ہوئی ہوئی تھانے پہنچ گئی۔ اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے باہر سے عمارت کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ عمارت کے باہر والی چار دیواری قریب آٹھ فٹ اونچی تھی۔ اس پر پانچ فٹ اونچا خاردار تاروں والا جنگلا لگا ہوا تھا۔ یہ جنگلا اس قدر مضبوط تھا کہ اس میں سے لمبی بھی نہیں گزر سکتی تھی۔ کسی انسان کا تو اس جگہ سے گزرنا ناممکن ہی بات تھی۔

چار دیواری کا گیٹ بھی صرف چار فٹ چوڑا تھا۔ اندر کی طرف دیوار کے ساتھ گارڈ کیمین بنا ہوا تھا۔ دن کے وقت گیٹ عام طور پر کھلا رہتا اور سٹری دروازے پر شٹل رہتا تھا۔ البتہ رات کو گیٹ اندر سے بند کر کے کالا لگا دیا جاتا اور سٹری یا اس پاس شٹل رہتا یا گارڈ کیمین کے سامنے بچ پر بیٹھ جاتا۔

اس گیٹ سے تقریباً تین فٹ آگے اصل عمارت تھی۔ تین میڑمیاں چڑھ کر ایک مختصر سا برآمدہ تھا۔ اس سے آگے کشادہ راپداری تھی۔ راپداری کا دروازہ آہنی سلاخوں کا تھا جو رات کو بند کر دیا جاتا تھا۔ ایک سٹری میاں بھی چوبیس گھنٹے موجود رہتا تھا۔ راپداری کے دائیں طرف ڈیوٹی آفسروالی بائیں طرف شاف روم تھا۔ اس سے آگے راپداری دائیں بائیں مڑ گئی تھی۔ گویا انگریزی کا حرف 'ن' بن گیا تھا۔ دائیں طرف کی راپداری میں ایس ایچ او کا دفتر اور اس سے آگے دو کمرے تھا جہاں تھانے کا اسٹور رکھا جاتا تھا۔ بائیں طرف کی راپداری میں وائزلیس روم تھا اور اس سے آگے حالات کی تین کوفیاں تھیں جن پر موٹی

ہوئے بولی۔ ”لیکن اس قحانے کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ یہاں سے ایک انسان تو کیا ملی کا بچہ بھی فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ آخر ہاجا کسار یہاں سے کیسے فرار ہو گیا؟“

”سب لوگ یہی کہتے ہیں۔ لیکن اندر کی بات تو کوئی نہیں جانتا۔“ قحانیدار بولا۔
 ”کیا آپ اندر کی بات مجھے بتانا پسند کریں گے تاکہ میں صورتحال کو صحیح طور پر سمجھ سکوں۔“ ثانیاب نے کہا۔

”کل آدھی رات کے بعد دو پولیس کانسٹیبل یہاں آئے تھے۔“ قحانیدار نے کہا۔
 ”انہوں نے یہاں عرصہ کو بتایا کہ میں کالا ناکہ والی چوکی پر بیٹھا ہوا ہوں اور ایک کیس کی تفتیش کے لئے میں نے ہاجا کسار کو چوکی پر طلب کیا ہے۔ عرصہ طوم کو ان کے حوالے کر دیا اور اپنا ایک کانسٹیبل بھی ان کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ دونوں کانسٹیبل قحانے کے کانسٹیبل کو دھوکہ دے کر نکل گئے۔ پھر رات کے پچھلے پھر ریلوے سٹیشن کے بیت الخلاء میں طوم کی لاش کی اطلاع ملی۔“

”حیرت انگیز۔“ ثانیاب بولی۔ ”کیا آپ کا عرصہ ان کانسٹیبلوں کو نہیں پہچانتا تھا۔ کسی قسم کی تصدیق کے بغیر اس نے ایک خطرناک طوم کو ان کے حوالے کر دیا۔ فون پر آپ سے تصدیق تو کر لی ہوئی کہ ان دو آدمیوں کو واقعی آپ نے سمجھا ہے یا نہیں۔“

”چوکی میں ٹیلی فون نہیں ہے۔“ قحانیدار نے جواب دیا ”اور فاصلہ بھی یہاں سے تین میل سے زیادہ ہے۔ عرصہ کے پاس فوری طور پر تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا ایک کانسٹیبل ساتھ روانہ کر دیا۔“

”کیا طوم کو جھکڑی نہیں لگائی تھی؟“ ثانیاب نے پوچھا۔
 ”لگائی تھی تھی۔“ قحانیدار نے جواب دیا۔ ”جب اس کی لاش ملی تو جھکڑی اس کے ہاتھوں میں لگی ہوئی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہاجا کسار فرار نہیں ہوا تھا۔ اسے فرار کروایا گیا تھا اور اس میں پولیس بھی لوٹ ہو سکتی ہے۔“ ثانیاب بولی۔
 ”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔“ قحانیدار اچھل پڑا۔

وہ اس طرح کہ ہاجا کسار ایک خطرناک طوم تھا۔ اسے قتل کے ایک کیس کی تفتیش

کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا لیکن وہ اخلاق“ بھی اس کے استقبال کیلئے کرسی سے نہیں اٹھا۔ ثانیاب نے بھی اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیا اور بے تکلفی سے کرسی چھیت کر بیٹھ گئی۔

”جی بی بی۔“ فریاضے کیسے آنا ہوا؟“ قحانیدار نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ ریلوے ہوائسٹن مین عبدالرشید کے قتل کے سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی ہے۔“ ثانیاب نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ”منا قحانہ کہ دو دن پہلے آپ کے آدی گاؤں سے ایک آدی کو پوچھ کچھ کے لئے پکڑ کر لائے تھے۔ اس سے کچھ معلوم ہوا یا نہیں۔“

”کچھ نہیں بی بی۔“ قحانیدار نے جواب دیا۔ ”ہم ہاجا کسار نام کے ایک آدی کو پکڑ کر ضرور لائے تھے مگر کل رات وہ حالات سے فرار ہو گیا اور آج صبح اس کی لاش ریلوے سٹیشن کے ایک بیت الخلاء سے ملی تھی۔ رات کے آخری پھر کسی نے اسے قتل کر دیا۔“
 ”وہ دو دن آپ کی کسٹڈی میں رہا۔ اس دوران آپ لوگوں نے اس سے کچھ بھی معلوم نہیں کیا؟“ ثانیاب نے کہا۔

”ہمارے پاس صرف یہی ایک کیس تو نہیں ہے نا بی بی۔“ قحانیدار نے جواب دیا۔
 ”دو دن سے تو ہمارے بعض افسران ضلع بیزگارڈر سے آگے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ کل ڈپٹی کمشنر صاحب بھی دورے پر آئے ہوئے تھے۔ ہماری ساری نفری ان افسروں کی خدمت میں حاضر تھی۔ اب آپ ہی بتائیے ہم کوئی اور کام کیسے کر سکتے ہیں۔ افسروں کی خدمت میں حاضری نہ دیں تو ہماری تو کرباں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ ثانیاب نے کہا۔ ”لیکن کیا آپ تو کوری افسروں کی خدمت کے لئے کرتے ہیں یا عوام کے جان و مال کی حفاظت کے لئے؟“

”آپ نے سرکار کی ملازمت نہیں کی اس لئے ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں بی بی!۔“ قحانیدار نے جواب دیا۔ ”آج کل سرکاری ملازمت تو صرف افسروں کی خدمت کے لئے ہوتی ہے۔ ان کا کوئی ناپاک کام بھی سامنے سے انکار کر دیا جائے تو شامت آ جاتی ہے۔“

”آپ نے بتایا تھا کہ ہاجا کسار حالات سے فرار ہو گیا تھا۔“ ثانیاب موضوع بدلتے

کی طرف بڑھ گئی تھی۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر قنایدار کی طرف دیکھا۔ قنایدار کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔ وہ منکراتی ہوئی باہر نکل آئی۔

غایب کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس کی کھری کھری باتوں سے قنایدار کا خون کھول گیا ہو گا۔ بات بھی چمک اٹھی ہی تھی۔ ہاجھا کسار کے حالات سے فرار اور اس کے قتل کا الزام غایب نے براہ راست قنایدار پر عائد کیا تھا۔

قتلے سے نکل کر بازار کی طرف جاتے ہوئے غایب پولیس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پولیس کا حکم عوام کے جان و مال اور عزت کے تحفظ کیلئے قائم کیا گیا تھا۔ پولیس الہکدوں کی تحفظاً عوام سے وصول کئے جانے والے لٹکس اور فنڈز سے ادا کی جاتی تھی لیکن یہ لوگ اپنے آپ کو عوام کے محافظ اور خدمت گار کے بجائے حکمران سمجھ بیٹھے تھے۔ پہلے تو لوگ واقعی خدمت اور فرض کا جذبہ لے کر اس حکم میں آتے تھے اور گن اور دانداری سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے لیکن اب تو لوگ کسی اور ہی ارادے سے اس حکم میں بھرتی ہوتے ہیں۔ معمولی کانسٹیبل دردی پن کر اپنے آپ کو شہنشاہ سمجھنے لگتا ہے۔ یہ روتا ضرور رو دیا جاتا ہے کہ تنخواہ کم ہے لیکن یہ نہیں سوچا جاتا کہ وہ کرتے کیا ہیں؟ رشوت، لوٹ مار، اس حکم کے الہکدوں کا شیوہ بن چکا ہے۔ ایک معمولی سب انسپکٹر چند برسوں ہی میں کمرڈوں کی جائیداد کا مالک بن جاتا ہے۔ اس کے رہن سہن اور گھروالوں کے گھٹا بھٹہ دیکھ کر لگتا ہے جیسے وہ کسی جاگیردار یا رئیس کی اولاد ہوں۔

دیکھ علاقوں میں ڈیوٹی دینے والے پولیس افسروں کی تو بات ہی الگ ہے۔ ایک قنایدار کو بلاشبہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ چھوٹے لوگ تو ہوتے ہی غلام ہیں۔ بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار قسم کے لوگ بھی قنایدار کے دروازے پر حاضری دینے کو نخر سمجھتے ہیں۔ وہ مانگتے بغیر قنایدار کی جیپیں ٹوئوں سے بھرتے رہتے ہیں اور اس کے صلے میں قنایدار ان کے جرائم سے چشم پوشی کرتا ہے۔ اغواء، آمیزش اور قتل جیسے سنگین جرائم بھی جرائم نہیں سمجھے جاتے۔ ان جرائم کو زمینداروں کے شوق کا نام دیا جاتا ہے اور جب بھی ان کے خلاف کوئی آواز اٹھتی ہے تو کسی بے گناہ کو مورد الزام ٹھہرا کر آہنی سلاخوں کے پیچھے پھانچا دیا جاتا ہے۔

دیکھ علاقوں میں ڈیوٹی انجام دینے والے پولیس آفیسر اس قسم کی باتیں سننے کے عادی

کے سلسلے میں حراست میں لیا گیا تھا۔ اس حقیقت کے دوران کئی بے گناہوں کے قتل جیسے کئی اور سستی خیز انکشافات ہو سکتے تھے لیکن آپ کے محرم نے نہایت ہیٹھ لے کر بڑے اطمینان سے اسے دو ایسے آدمیوں کے حوالے کر دیا جنہیں وہ جانتا تھا کہ نہیں تھا۔ ایک اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ چوکی بھی آپ کے قتلے کے اندر ہے۔ وہاں کا شاف بھی اس قتلے کے ماتحت ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ تمام چوکیوں اور اس قتلے کے سپاہی و افسران ایک دوسرے کو نہ صرف بائی فیس بلکہ ٹائمنس سے بھی جانتے ہیں لیکن آپ کا محرم ان دو کانسٹیبلوں کو نہیں جانتا۔ ہے نا واقعی حیرت کی بات؟

”آپ غلط رخ پر سوچ رہی ہیں بی بی۔“ قنایدار نے اسے گھورا۔ ”ہم بھی انسان ہیں اور غلطی تو ہو ہی جاتی ہے۔ محرم اگر دھوکا کھایا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”ایک آدمی اپنی جان سے گمیا اور آپ کے لئے حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔“ غایب نے کہا۔ ”ہاجھا کسار اپنی جان سے گمیا سو کیا لیکن کیا آپ کے لئے یہ افسوس کی بات نہیں کہ اس کے قتل سے ایک ایسے کیس کی حقیقت ادھوری رہ جائے گی جس کے نتیجے میں سستی خیز انکشافات اور کچھ ایسے چروں کے بے نقاب ہونے کی توقع تھی جو سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے کے باوجود اب تک قانون کی گرفت سے بچے ہوئے ہیں۔“

”حقیقت ادھوری نہیں رہے گی۔“ قنایدار نے کہا۔ ”ہم نے ماطلموم لڑموں کے خلاف دھوکا دی کاکیں درج کر لیا ہے اور میرا سب انسپکٹر اس معاملے کی حقیقت کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں کسی سے کوئی رعایت نہیں کی جائے گی خواہ وہ کتنا ہی با اثر کیوں نہ ہو؟“

”کیس کی بنیاد دراصل پولیس کی حقیقت ہی ہوتی ہے۔“ غایب نے کہا۔ ”پولیس کی حقیقت ہی اگر غلط رخ پر ہو تو انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ اس معاملے میں بھی حقائق کو نظر انداز کر کے حقیقت کو غلط رخ پر ڈال کر بعض لوگوں کو بچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بہر حال۔“ غایب اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”جب تک میں یہاں موجود ہوں یہ کوشش کرتی رہوں گی کہ اصل جرم زیادہ عرصہ تک چھپے نہ رہ سکیں۔“ قنایدار ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ غایب اس سے پہلے ہی اٹھ کر دروازے

پر مجھے آپ کی ضرورت پیش آئی تو ضرور زحمت دوں گی۔
 ”میں تو چاہتا تھا تم لوگوں میں راضی نامہ ہو جائے تو بہتر ہے۔ مزید جگہ ہنسائی تو نہ ہو۔ اگر تم کو تو میں اور ملک مل کر ایسی کوئی کوشش کریں۔ چوہدری الامت سے میرے بھی گہرے مراسم ہیں۔ مجھے امید ہے کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔“
 ”مجھے تو کوئی امید نظر نہیں آتی۔“ ثانیاب نے کہا۔ ”وہیے انہوں نے ایک کوشش تو کی تھی مگر راضی نامے کے لئے وہ اپنی شرائط متواتر چاہتے ہیں۔“
 ”مثلاً۔ کیسی شرائط؟“ فضل چاہا نے پوچھا۔

”ان کی سب سے اہم شرط یہ ہے کہ میں کیس واپس لے لوں اور سعادت سے شادی کر لوں۔ اس صورت میں وہ میرا حق دینے کو تیار ہیں۔“ ثانیاب نے بتایا۔
 ”بالکل نہیں۔“ فضل چاہا نے فوراً ہی کہا۔ ”اس میں ان کی جو چال ہے وہ میں سمجھ رہا ہوں۔“

”اس چال کو سمجھ کر ہی تو میں نے ان کی یہ شرائط ماننے سے انکار کر دیا ہے۔“ ثانیاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
 ”بہت اچھا کیا تم نے بیٹی!“ فضل چاہا نے کہا۔ ”پریشان نہ ہونا ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم اس معاملے میں تمہاری ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ حقدار کو اس کا حق ملے اور بس۔“
 ”شعریہ فضل چاہا۔“ ثانیاب نے کہا اور پھر سلام کر کے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اس وقت بازاروں میں اچھی خاصی رونق تھی۔ دکانداروں نے اپنا سامان باہر نکال پھیلا رکھا تھا جس سے راستہ تک ہو گیا تھا۔ مال بردار ٹرک بھی آ رہے تھے۔ گدھا گاڑیاں اور آٹکے بھی اور اکا دکا موٹریں بھی آزادی سے بازاروں میں گھوم رہے تھے۔ ثانیاب کو ان پر جھوم تک سے بازاروں سے گاڑی نکالنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ جیسے جیسے کر کے وہ قہقہے سے باہر آگئی اور گاڑی کو ہائی دے پر موڑ دیا۔

ہائی دے پر تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے گاڑی کی رفتار کم کرنی پڑی۔ آگے کوئی حادثہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ٹریفک رک رک کر چل رہا تھا۔
 جانے حادثہ پر ایک مال بردار ٹرک الٹا چڑھا تو اور ایک پرانی سی کار آڑی تڑپتی گزری

میں ہوئے۔ وہ تو حکم دینا جانتے ہیں۔ اس قسم کی کھری کھری باتیں سنتا تو ان کے تصور میں بھی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بے گناہ رہے نقصان میں احتجاج بھی کرتا ہے تو اسے الٹا ٹانگ دیا جاتا ہے۔ جبکہ ثانیاب نے تو براہ راست اس پر اس کیس میں طوط ہونے کا الزام عائد کر دیا تھا اور وہ تھلا کر رہ گیا تھا اور اسے انفسوس اس بات کا ہوا تھا کہ وہ اسے کوئی سخت جواب بھی نہیں دے سکتا تھا۔

ثنایاب بازار میں آگئی۔ اس نے گھوم پھر کر ضرورت کی چند چیزیں خریدیں اور چاہا فضل کی دکان پر آگئی۔ اس روز جب وہ زکس دھبہ کے ساتھ آئی تھی تو انہوں نے اپنی کزن کہہ کر اس کا تعارف کرایا تھا مگر تاج فضل چچا کو اس سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا اور پھر اسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ ثانیاب چوہدری الامت علی کی چھوٹی بہو تھی۔

”ملک صلاح الدین کے گھر کی کوئی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں۔“ فضل چاہا نے کہا۔ ”ہم بچپن کے دوست ہیں۔ میٹرک تک ہم دونوں نے اسی نور پور کے ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ میٹرک کے بعد میں اپنے والد کے ساتھ اس کالہ دار میں لگ گیا اور ملک نے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا اور پھر بی اے کرنے کے بعد اس نے زمینداری سنبھال لی۔ ہمارے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ چوہدری الامت علی بھی میٹرک تک میرا کلاس فیلو تھا مگر اس کا مزاج ہم سے کچھ مختلف تھا۔ میں دلوں گدلوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ چوہدری کے چھوٹے بیٹے نے اپنی پسند کی شادی کر لی تھی اور پھر ان میں کچھ جھگڑے شروع ہو گئے تھے، پھر مجھے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ چوہدری کی بہو نے اپنا حصہ وصول کرنے کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ چند روز پہلے مجھے گاؤں کے کسی آدمی نے بتایا تھا کہ چوہدری کی چھوٹی بہو آئی ہوئی ہے۔ اس روز زکس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ بی دار عورت تم ہو۔ جس نے چوہدری خاندان سے نکال لی ہے۔“
 چاہا فضل چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ اگرچہ تم لوگوں کا خاندانی معاملہ ہے ثانیاب بیٹی! لیکن میری طرف سے کسی قسم کی مداخلت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“

”نی لالچ تو مجھے آپ کی دعائیں چاہئیں فضل چاہا۔“ ثانیاب نے کہا۔ ”مگر کسی مرتلے

قصی کا عالم ہے۔ کوئی سر بھی رہا ہو تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ کسی سے ہمدردی کرنا بھی بہت بڑی نیکی ہے۔

بوڑھا دعائیں دیتا رہا اور ٹایاب نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹایاب نے سامنے لگے ہوئے صفی منہ پیش کرنے والے آئینے کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ آئینے میں ایک سیاہ ناگ چمن اٹھائے بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

ایشیئر پر ٹایاب کی گرفت ڈھیلی پڑی گئی۔ آگے ایک چھوڑا سا گڑھا تھا۔ گاڑی کا اگلا پیسہ جیسے ہی اس گڑھے پر پڑا گاڑی اچھل کر خود بخود بائیں طرف مڑ کر کھیت میں گھس گئی اور ٹھیک اسی لمحہ فضا فائزنگ کی خردنک آواز سے گونج اٹھی۔ دائیں طرف سڑک سے تقریباً چالیس گز دور کھیتوں میں گھنڈی پڑی کھڑا ایک آدمی کلا کھوف راکٹل سے فائزنگ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ڈھانسا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔

ٹایاب دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد فائزنگ رک گئی۔ فضا پر ایک دم سمیرنا ٹانا طاری ہو گیا۔ ٹایاب سیدھی ہو گئی۔ سب سے پہلے اس نے سامنے لگے ہوئے آئینے کی طرف دیکھا۔ اس میں اب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹایاب نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ بوڑھا بھی سیٹ پر نظر نہیں آیا۔ وہ اپنی سیٹ پر اپک کر دیکھنے لگی۔ پچھلی سیٹ خالی تھی۔

ٹایاب اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ سڑک کے دوسری طرف ایک موٹر سائیکل کھیتوں میں گھنڈی پڑی اچھلی ہوئی مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ موٹر سائیکل سوار نے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے سر پر سفید کپڑا لپیٹ رکھا تھا اور کندھے پر لگی ہوئی کلا کھوف راکٹل بھی نظر آ رہی تھی۔

ٹایاب نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اس کا خیال تھا کہ بوڑھا فائزنگ سے ڈر کر سیٹ کے نیچے دیک گیا ہو گا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ سیدھی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ شاید وہ بوڑھا گاڑی سے اتر کر کھیتوں میں چھپ گیا ہو۔ ”بابائی۔ بابائی۔“ آپ کہاں ہیں۔“

قصی۔ ٹھیک ایک طرف کچے راستے سے آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ ٹایاب نے کار روک لی اور قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے اس حادثے کے بارے میں دریافت کیا۔

”اس کار کو پچانے کی کوشش میں ٹک سے قابو ہو کر الٹ گیا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ ٹک کا ڈرائیور زخمی ہوا ہے۔ اسے ایک بس پر نور پور کے ہسپتال بھیج دیا ہے۔ پولیس بھی اب آنے والی ہو گی۔“

ٹایاب نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ چند منٹ بعد وہ گاؤں کی طرف جانے والے موڑ پر پہنچ گئی۔ یہ سڑک ٹوٹی پھٹی تھی اس لئے ٹایاب کو گاڑی کی رفتار مزید کم کرنی پڑی۔

اس سڑک پر ابھی تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے ہوا کہ اچانک ہی ایک آدمی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ ٹایاب اگر پہچانتا تو وہ گاڑی کو روک دیتا۔ وہ آدمی گاڑی سے گرا جاتا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا جو جمالیے اچانک کہاں سے سڑک پر آ گیا تھا۔

”بابائی۔ ذرا دھیان سے چلا کرو۔“ ٹایاب نے کھڑکی سے سر نکال کر اس بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بوڑھا ہو گیا ہوں! نظر رکھ دو ہو گئی ہے۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ چلا بھی تو نہیں جاتا۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ اس کے لیے میں بے بسی تھی۔

ٹایاب نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ بہت بوڑھا آدمی تھا۔ سر کے بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ چہرے پر بھرپور اس قدر زیادہ تھیں کہ کھڑکی کے جالے کا گمان ہوتا تھا۔ آنکھوں پر گول شیشوں والی عینک تھی جس کی ایک ڈبیری ٹوٹی ہوئی تھی اور اس کی جگہ دھاک باندھا ہوا تھا جو کان پر لپٹا ہوا تھا۔ عینک کے گول شیشوں کی وجہ سے اس بوڑھے کی آنکھیں بھی گول ہی لگ رہی تھیں۔

”بابائی اگر گاؤں کی طرف جانا ہے تو گاؤں میں بیٹھ جائیے میں آپ کو پہنچا دوں گی۔“ ٹایاب نے کہا۔

”بھتیجی رو بیٹی۔“ بوڑھا دعائیں دیتے لگا۔

ٹایاب نے سیٹ پر جھک کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

”رب تمہیں جیاتی دے بیٹی!“ بوڑھا پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”یہاں تو نفسا

اگر یہ حملہ ناکام ہوا تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا گا لیکن ٹایاب کے خیال میں وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ حرکت یقیناً چوہدری سعادت کی ہوگی۔ وہی اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اسے پتہ چل گیا ہو گا کہ ٹایاب نور پور گئی ہوئی ہے۔ اس کا آدمی گھات لگائے بیٹھا تھا لیکن یہ حیرت انگیز اتفاق تھا کہ ٹایاب کو اپنے سامنے لگے ہوئے آئینے میں سانپ کا کھس دکھائی دیا تھا اور اس کے ہاتھ اینیٹرک سے مٹ گئے تھے جس سے گاڑی کا رخ بدل گیا تھا اور وہ بچ گئی تھی۔

”بس بیٹی مجھے یہیں اٹار دو۔“

کار کی بجلی سیٹ سے یہ آواز سن کر ٹایاب اچھل پڑی۔ اس کے ہاتھ ایک بار پھر اینیٹرک پر ہلکے سے آواز گاڑ کر سڑک کے کنارے پر آگئی۔ اگر وہ فوراً ہی بریک نہ لگا دیتی تو گاڑی اس مرتبہ بھی کمیت میں گھس جاتی۔ گاڑی رکتے ہی وہ بڑی تیزی سے سیٹ پر گھوم گئی اور پیچھے دیکھنے لگی۔

وہ بوڑھا بچہ سیٹ پر بیٹھا تھا۔

ٹایاب کا دل اچھل کر قلع میں آگیا۔ اس کا تنفس ایک دم بے ربط ہو گیا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر غور سے اس بوڑھے کو دیکھ رہی تھی۔

”بابائی آپ۔“ ٹایاب بھلا کر رہ گئی۔

”کیا ہوا بیٹی۔ تم شاید بھول گئی ہو کہ میں کار میں بیٹھا ہوا ہوں۔“ بوڑھے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن آپ تو کار میں نہیں تھے بابائی۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”جب کار پر فائزنگ ہوئی تھی تو آپ شاید کار سے اتر گئے تھے۔ میں نے آپ کو آوازیں بھی دیں لیکن پتہ نہیں آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

”تمہیں ویم ہوا ہو گا بیٹی۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”میں تو کار ہی میں بیٹھا رہا تھا۔ اچھا بیٹا۔ یہ دروازہ تو کھولیں سچے اتروں۔ رب تمہیں حیاتی دے۔“

ٹایاب نے پیچھے کی طرف جھک کر دروازہ کو لاک کھول دیا اور بوڑھے کو بتایا کہ وہ ہینڈل کو اٹھا کر دروازہ کھول لے۔

بوڑھا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا اور اسے دعا میں دتا ہوا کھیتوں کے درمیان کی

اس نے بوڑھے کو کئی آوازیں دیں لیکن نہ تو کوئی جواب ملا اور نہ ہی وہ بوڑھا نظر آیا البتہ کمیت میں کام کرنے والے کچھ آدمی دوڑتے ہوئے اس کی طرف آرہے تھے۔

”کیا ہوا چھوٹی بی بی! گولیاں کس نے چلائیں تھیں؟“ ایک آدمی نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

”پتہ نہیں وہ کون تھا؟“ ٹایاب نے کہتے ہوئے سڑک کے دوسری طرف اشارہ کیا وہ موٹر سائیکل سوار اب کھیتوں میں بہت دور جا چکا تھا۔

”اب تو چوہدری سے کھل کر دشمنی ہو گئی ہے۔ چھوٹی بی بی۔ آپ محتاط رہا کریں۔“ اس شخص نے کہا۔

ٹایاب نے اس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور گھوم پھر کر گاڑی کا جائزہ لینے لگی۔ گاڑی کی ایک سائیڈ کی بیک لائٹ تھی۔ اس کے علاوہ گاڑی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اگر گاڑی اس گڑھے میں اچھل کر رخ نہ بدل لیتی تو نہ صرف گاڑی بلکہ وہ خود بھی چھلچلی ہو چکی ہوتی۔ وہ بال بال بچ گئی تھی اور یہ سب کچھ اس ناگ کی وجہ سے ہوا تھا جس کا کھس اس نے آئینے میں دیکھا تھا۔ یہ پتہ نہیں اس کا واضح تھا کیا۔ بہر حال آئینے میں نظر آنے والے سانپ کے عکس کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی تھی لیکن اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ بوڑھا کہاں غائب ہو گیا تھا۔

ٹایاب وہاں جمع ہونے والے پانچ چھ کسانوں کا شکریہ ادا کر کے گاڑی میں بیٹھ گئی اور اجنبی شاتر کر کے اسے دوبارہ سڑک پر لے آئی۔ وہ گاڑی کو بھلی رفتار سے چلاتے ہوئے دائیں بائیں کھیتوں کی طرف دیکھ رہی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اس پر فائزنگ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ فائزنگ کرنے والا تو ظاہر ہے کرانے کا آدمی ہو گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس پر فائزنگ کس نے کروائی ہوگی۔ چوہدری سعادت نے یا۔

تھانیدار نے؟ چوہدری سعادت تو اس کا دشمن تھا ہی لیکن تھانیدار پر پابنداری کا الزام لگا کر اس نے اسے بھی اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ تھانیدار اسے پکڑ کر حوالات میں بند تو نہیں کر سکتا تھا البتہ اس کے پاس دوسرا طریقہ تھا کہ ٹایاب کو راستے سے ہٹا دے تاکہ آئندہ اس کی طرف سے پیدا ہونے والی الجھنوں سے بچ جائے۔ ٹایاب سوچ رہی تھی کہ اگر اس پر یہ حملہ واقعی تھانیدار نے کروایا تھا تو وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق تھا۔ وہ یہ بھی جانتا ہو گا کہ

کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ میں نے اسے اسی وقت ڈیرے پر بھیج دیا تھا۔ بھائی صاحب کو اطلاع دینے کے لئے شاید بھائی صاحب ڈیرے سے ہی اس طرف چلے گئے ہوں گے جہاں تم پر فائرنگ ہوئی تھی۔

”اوہ۔“ غلاب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”کیا اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں ٹھیک ہوں۔“

”نہیں۔ وہ اس وقت دور تھا۔ اس نے صرف یہ دیکھا تھا کہ ہماری گاڑی پر فائرنگ ہوئی تھی۔ اس کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ گاڑی میں کون ہے۔ وہ یہ بتانے کے لئے بھاگتا ہوا آیا تھا کہ کسی نے گاڑی پر فائرنگ کی تھی اور گاڑی کیتھیں میں گھس گئی تھی۔“

زکس نے کہا۔

”سکندر بھائی اور اٹکل پریشان ہوں گے۔“ غلاب بولی۔ ”کسی کو بھیج کر انہیں اطلاع دے دو کہ میں ٹھیک ہوں۔“

”نہیں پتہ چل جائے گا تو وہ معلوم کرنے سیدھے گھر ہی آئیں گے۔“ زکس نے جواب دیا۔ ”لیکن ہوا کیا تھا۔ کسی نے کی تھی فائرنگ۔“

”یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ فائرنگ کرنے والا کون تھا۔ لیکن ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں پتہ لگ گئی۔“ غلاب نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے آہستہ میں سہپ کے گھل اور اس پر اسرار بوڑھے کے بارے میں بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں جب وہاں سے چلی تھی تو وہ ڈھاکا میں نہیں تھا لیکن راستے میں اس کی کواڑ سن کر میں اچھل پڑی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کار میں بیٹھا رہا تھا لیکن جین کوس میں نے اسے گاڑی کے اندر بھی دیکھا تھا اور اوپر ادھر تلاش بھی کیا تھا لیکن وہ کہیں نہیں تھا اور پھر پتہ نہیں گاڑی میں کیسے پہنچ گیا۔“

”یہ تو واقعی حیرت کی بات ہے۔“ زکس نے کہا۔

”ایک بات اور۔“ غلاب نے کہا۔ ”میں تو اس حملے میں پتہ لگ گئی تھی لیکن گولی لگنے سے گاڑی کی ایک بیک لائٹ ٹوٹ گئی ہے جس کا مجھے احساس ہے۔“

”مصلحت سمجھو جی بیک لائٹ پر۔“ سیکر نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی۔ ”بیک لائٹ تمہاری جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں۔“

گنڈنڑی پر چلے گا۔ غلاب اپنی سیٹ پر بیٹھی اس طرف دیکھ رہی تھی۔ اس طرف تقریباً دو سو گز آگے چند جھکیاں نظر آ رہی تھیں۔ بوڑھا اسی طرف جا رہا تھا اس بوڑھے کو گنڈنڑی پر چلے دیکھ کر غلاب ایک بار پھر چونک گئی۔ غلاب کے اندازے کے مطابق بوڑھے کی عمر پچھترے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چہرے پر جھروں سے کھڑی کا جال سا بنا ہوا تھا لیکن اسے لڑکائیوں کی طرح بالکل سیدھا حق پر چلے دیکھ کر غلاب کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اس بوڑھے کے پاس سارے کے لئے نہ تو کوئی چھتری تھی اور نہ ہی اس کی کمرش غم تھا۔

غلاب دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے اس بوڑھے کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

غلاب جیسے جیسے سوچتی رہی اس کا ذہن الجھا گیا۔ بوڑھا ان جگہوں کے قریب پہنچ کر گھوٹوں سے او اچھل ہو چکا تھا۔ غلاب نے سر کو دو تین جھٹکے دینے اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

گاؤں پہنچ کر اس نے گاڑی گیراج والے مکان میں چھوڑ دی اور چوٹی میں آگئی۔ وہ جیسے ہی چھانک میں داخل ہوئی زکس دیکھنے ہی اس کی طرف لگی۔

”غلاب۔ تم ٹھیک ہو نا۔“

”ہاں۔ میں ٹھیک ہوں مگر جیتیں کیا ہوا۔ اس قدر بدحواس کیوں ہو رہی ہو؟“

غلاب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”راستے میں تم پر فائرنگ کی گئی تھی۔ کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟“ زکس نے کہا۔ اسی دوران سیکرہ اور عطرہ بھی وہاں آئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر بھی پریشانی نمایاں تھی۔

غلاب چونک گئی۔ یہ اطلاع اس سے پہلے یہاں پہنچی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ اطلاع دینے والا کون تھا حالانکہ اس سے آگے کوئی بھی گاؤں کی طرف نہیں آیا تھا۔ کیتھوں میں کام کرنے والے جو مکان وہاں جمع ہوئے تھے وہ وہیں رہ گئے تھے۔ اگر کوئی گاؤں کی طرف آتا بھی تو اس سے پہلے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تو پھر وہ کون ہو سکتا تھا جس نے یہ اطلاع اس سے پہلے یہاں پہنچا دی تھی۔

”تم لوگوں کو کیسے پتہ چلا۔ کس نے بتایا؟“ غلاب نے پوچھا۔

”جیسے سوچنے کے بیٹے نے۔“ زکس نے جواب دیا۔ ”وہ بھاگتا ہوا یہاں آیا تھا۔ اس

ابھی طرح جانتے تھے۔ وہ سب سکندر کو دیکھ کر اٹھ گئے۔ بڑی گرجوٹی سے ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے رہے پھر سکندر قائدیار کی طرف دیکھتے ہوئے اصل موضوع پر آگیا اور اسے ٹایاب پر حملہ کے بارے میں بتانے لگا۔

”اور۔۔۔ یہ کب کی بات ہے؟“ قائدیار نے سوالیہ لٹکاہوں سے ٹایاب کی طرف دیکھا۔

”جب میں یہاں سے گئی تھی اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد۔“ ٹایاب نے بتایا۔

”آپ کو اسی وقت واپس آکر رپورٹ کرنی چاہئے تھی تاکہ ہم اس کا تعاقب کر کے اسے پکڑنے کی کوشش کر سکتے۔“ قائدیار نے کہا۔

”وہ تو اسی وقت موٹر سائیکل پر فرار ہو گیا تھا۔“ ٹایاب نے کہا۔

”علائے کی ناکہ بندی تو کی جا سکتی تھی ٹائی بی۔“ قائدیار بولا۔

”ناکہ بندی تو اب بھی ہو سکتی ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ حملہ آور اسی علاقے میں موجود ہے اور وہ باہر نہیں گیا۔ اگر تھوڑی سی کوشش کی جائے تو اسے پکڑا جا سکتا ہے۔“

”کیا آپ نے اسے دیکھا تھا؟“ قائدیار نے پوچھا۔

”میں نے اس کی پٹ دیکھی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی قبض پمن رکھی تھی اور سر پر سفید کپڑا لپیٹ رکھا تھا اور جب اس کی موٹر سائیکل کھیتوں میں گھڑی پڑی تو میری آنکھوں میں گولڈن ہی چمک پڑی تھی۔“ ٹایاب نے بتایا۔

”ہو سکتا ہے موٹر سائیکل کے ہینڈل پر لگے ہوئے آئینے کا عکس پڑا ہو۔“ قائدیار نے کہا۔ ”بہر حال“ آپ کو کسی پر شبہ ہے؟ رپورٹ میں کسی مشتبہ شخص کا نام لکھوانا چاہتی ہیں۔“

”آپ کو تو سب حالات معلوم ہیں جی!“ سکندر بول پڑا۔ ”آپ ابھی طرح جانتے ہیں“ ٹایاب بہن کے دشمن کون ہیں؟ حملہ آور کو تلاش کرنے میں آپ کو زیادہ پریشانی نہیں ہو گی۔ وہ تو اتفاق ہے کہ گاڑی سڑک پر چھوٹنے سے کھڑکی کے دروازے سے اچھل گئی تھی ورنہ آج اس کا تو کام ہو گیا ہوتا۔ دیسے گاڑی کو نقصان پہنچا ہے۔ گولی لگنے سے اس کی ایک بیک لائٹ ٹوٹ گئی ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ گاڑی باہر نکلی ہے اور یہ عین بندے

وہ ابھی ہاتھیں کر رہی تھیں کہ ملک سکندر حویلی میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی ٹایاب پر سوالوں کی بوجھاڑ کر دی۔ ٹایاب کو ایک بار پھر کمانی سنانی پڑی تھی۔

”عجب یہ توقف لڑی ہو۔“ سکندر نے اسے گھورا۔ ”اس کے بعد تم سبھی گھر چلی آئیں۔“

”اور کیا کرتی سکندر بھائی۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”حملہ آور تو موٹر سائیکل پر کھیتوں کی طرف فرار ہو گیا تھا۔“

”تمہیں گھر آنے کے بجائے فوراً واپس جانا چاہئے تھا۔“ سکندر نے کہا۔ ”پولیس میں رپورٹ کرنی چاہئے تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔“

”اس بات کا مجھے خیال نہیں آیا تھا۔“ ٹایاب نے کہا۔

”اس واقعہ کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔“

سکندر نے کہا۔ ”ابھی میرے ساتھ چل پولیس کو اطلاع دے مت ضروری ہے۔“

”جئے۔“ ٹایاب فوراً ہی تیار ہو گئی۔

سکندر اس سے گاڑی کی چابیوں لے کر حویلی سے باہر نکل گیا اور جب ٹایاب باہر نکلے تو وہ گاڑی گلی میں نکال چکا تھا۔ اس نے اتر کر فوٹی ہوئی لائٹ کا جائزہ لیا اور دوبارہ اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ٹایاب لمبیز سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سکندر گاڑی کو گلیوں میں گھومتا ہوا سڑک پر لے آیا اور رفتار بڑھا دی۔

جس جگہ ٹایاب پر حملہ ہوا تھا، وہاں پہنچ کر گاڑی روک لی اور نیچے اتر کر کھیتوں میں کام کرنے والے آدمیوں کو آوازیں دینے لگا۔ چند منٹ بعد ہی پانچ چھ آدمی وہاں پہنچ گئے۔ سکندر نے تین آدمیوں کو کچھل سیٹ پر بٹھا لیا اور اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ کر گاڑی کو تیزی سے بائی وے کی طرف دوڑا دیا۔

ہائی وے پر ٹرک ابھی الٹا پڑا تھا اور وہ چار لوگ بھی بیٹھ تھے۔ وہ پولیس والے بھی وہاں کھڑے تھے۔ ٹایاب نے سکندر کو بتایا کہ یہ حادثہ کس طرح پیش آیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ تھانے پہنچ گئے۔ قائدیار اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھا۔ تین چار آدمی ابھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سکندر“ ٹایاب کو اشارہ کرتا ہوا بے تکلفی سے اندر داخل ہو گیا۔ قائدیار کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی بھی زمیندار ہی تھے اور سکندر کو

چہدرائی ایند بیگم نے آگے ہی غائب سے لڑنا شروع کر دیا تھا۔

”دیکھو لڑکی۔“ وہ غائب کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری وجہ سے ہم بہت ذلت اٹھا چکے ہیں۔ بڑی رسوائی ہو گئی ہے ہماری۔ اب تمہارا بھلا اسی میں ہے کہ یہاں سے دغمان ہو جاؤ۔ غضب خدا کا! کبھی کسی نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ لیکن اب ہر شخص ہمارے سامنے زبان درازی کر رہا ہے۔ کس کسین بھی ہمارے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے لگے ہیں اور سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھے، تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہوگی۔“

”آپ بھول رہی ہیں کہ میں آپ کی بہو ہوں۔“ غائب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور میں رسالت کی ان پڑھ اور جاہل عورت نہیں ہوں جو آپ کا ہر قلم آسانی سے سہہ لوں گی اور میں آپ کی مزارع بھی نہیں ہوں۔“

”دیکھو لڑکی۔“ چہدرائی نے اسے گھورا۔ ”میں آخری بار تمہیں کہہ رہی ہوں کہ یہاں سے چلی جاؤ ورنہ۔“

”چالچی۔“ سیکند نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے آپ لوگوں کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے۔ آپ ہمارے گھر آئی ہیں۔ ہم اللہ۔ بہت خوشی ہوئی لیکن غائب ہماری ممان ہے۔ آپ ہمارے کسی ممان کو چلے جانے کو کیسے کہہ سکتی ہیں۔“

”تم اسے نہیں جانتیں سیکند بیٹی۔“ چہدرائی نے کہا۔ ”ہم دونوں گھرانوں کے تعلقات کتنے اچھے تھے۔ شہر دو شہر تھے۔ لیکن اس کی وجہ سے ہمارے تعلقات بھی خراب ہو گئے اور تم نے اس کو اپنا ممان بنا کر رکھا ہوا ہے۔“

”تعلقات ہم نے تو خراب نہیں کئے۔“ سیکند نے جواب دیا۔ ”آپ ہی لوگ پیچھے بہت گئے تو اس میں ہمارا یا غائب کا کیا قصور؟“

”بہت بھولی ہو تم۔“ چہدرائی بولی۔ ”منا نہیں تم نے گاؤں والے اس کے بارے میں کیا کیا باتیں کر رہے ہیں۔“

”گاؤں والے کوئی باتیں نہیں کر رہے۔“ سیکند نے کہا۔ ”سارا قصہ آپ ہی کے بیٹے کا پھیلا ہوا ہے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں، ہم کچھ نہیں جانتے لوگ بھی جانتے ہیں کہ آپ کا

چشم دید گواہ ہیں۔ یہ لوگ قریبی کیمڑوں میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے گاڑی پر فائزنگ ہوتے دیکھی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ موجود ہیں جن سے آپ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔“

”آپ مطمئن رہنے ملک صاحب۔“ قانیدار نے کہا۔ ”مطمئن کس بھی چلا جائے مجھ سے بچ کر نہیں جاسکے گا۔ دو تین دن کے اندر اندر آپ کو اطلاع مل جائے گی کہ مٹم پکڑا گیا ہے۔“ قانیدار نے سنڑی کو بھیج کر عذر کو بلا لیا۔ ”مٹی خان!“ وہ عذر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”منا کی رپورٹ لکھ لو۔ کس کی تحقیق میں خود کروں گا۔ رپورٹ لکھنے سے پہلے ان کی گاڑی کو بھی دیکھ لو۔“

”میں سر۔“ عذر نے سلیوٹ کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر غائب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آئیے بی بی میرے ساتھ آئیے۔“

”جاؤ غائب بہن۔ تم ان کے پاس بیٹھ کر رپورٹ لکھو۔ میں ذرا ان جگہوں سے گپ شپ کر لوں۔ پورے عرصہ بعد ملاقات ہوئی ہے۔“ سکندر نے غائب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

غائب اٹھ کر عذر کے کمرے میں آگئی۔

اور پھر رپورٹ لکھوانے کے بعد غائب اور سکندر تھلنے سے باہر نکلے تو سد پھر کے چار بج رہے تھے۔

وہ پانچ بجے کے گھنٹے گاؤں پہنچے تھے۔ یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی کہ چھوٹی بی بی کو فائزنگ کر کے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ گاؤں کی عورتیں اس کی خیریت دریافت کرنے حویلی میں آ رہی تھیں۔ ان کی کہیں کی باتوں سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ ان کے خیال میں چھوٹی بی بی پر حملہ کس نے کیا ہوا گا۔

غائب غصے میں اس ان عورتوں کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ وہ اس وقت برآمدے ہی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں حویلی کے چھانک کی طرف تھیں۔ اسی وقت وہ اور عورتیں چھانک سے اندر داخل ہوئیں۔ ان میں ایک تو ماسی اللہ رکھی تھی اور دوسری عورت کو دیکھ کر غائب اچھل پڑی۔

وہ چہدرائی ایند بیگم تھی۔

بڑی دکان تو اسی کی ہے۔" سکندر نے کہا۔ "مگر وہ صحیح قیمت نہ لگا سکا تو پھر شہر جانا پڑے گا۔"

"میرا خیال ہے مجھے بھی شہر جانا پڑے گا۔" ثناب نے کہا۔ "الطاف کو یہاں آئے ہوں تین چار دن ہو چکے ہیں۔ ڈیڑی پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ تم الطاف کو شہر بھیج دو۔" سکندر نے کہا۔ "کل صبح میں دو ہیرے لے کر نور پور جاؤں گا تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔ تمہارے سامنے کرم الہی بنیاد سے بات ہو گی اور تمہانیدار سے بھی معلوم کر لیں گے کہ اس نے کیا کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" الطاف کو میں صبح ہی شہر واپس بھیج دیتی ہوں۔" ثناب نے کہا۔

اور پھر دوسرے دن وہ ایک بار پھر سکندر کے ساتھ نور پور جا رہی تھی۔ کار میں ان کے ساتھ الطاف بھی تھا۔ ڈیڑی میں کچھ سلمان رکھا ہوا تھا۔ یہ گاؤں کی سوغاتیں تھیں جو الطاف کے ہاتھ ثناب کے والد کو بھیجی جا رہی تھیں۔ ثناب نے والد کے نام ایک خط لکھ کر الطاف کو دیدیا تھا جس میں یہاں کے مختصر حالات لکھے ہوئے تھا کہ وہ جنگ کی آفتزدگی کے بارے میں پولیس سے رابطے میں رہیں۔

نور پور پہنچ کر انہوں نے پہلے الطاف کو شہر جانے والی بس پر سوار کر دیا اور پھر مراد بازار میں کرم الہی بنیاد کے دکان پر آگئے۔ کرم الہی ایک اویسز عمر کوئی تھا۔ اس کے سر کے بال چاندی کے تاروں کی طرح پنک رہے تھے۔ علاقے کے تمام بڑے بڑے زمیندار زورات کی بوائی اور خرید و فروخت کے لئے اسی کی دکان پر آتے تھے۔ مراد بازار میں تاروں کی آٹھ دس دکانیں تھیں اور سب سے بڑی دکان یہی تھی۔ کرم الہی نے بڑی مگر جوئی سے ملک سکندر کو استقبال کیا اور ثناب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"مگر میں غلطی نہیں کرتا تو تم چوہدری لمانت علی کی بسو ہو۔"

"آپ کا خیال بالکل درست ہے۔" ثناب مسکرائی۔

دکان پر بیٹھی ہوئی دو عورتوں نے چونک کر ثناب کی طرف دیکھا۔ گاؤں رسالت میں کوئی بات بہت جلد ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتی ہے۔ علاقے کے تمام زمیندار جانتے تھے کہ چوہدری لمانت علی کا اپنی چھوٹی بسو سے جائیداد کا مقدمہ چل رہا ہے لیکن پچھلے دنوں پہ درپے جو واقعات رونما ہوئے تھے ان سے اس تنازعے کو اور بھی

بٹا کیا کر رہا ہے۔ اس نے ثناب پر جموۃ الزام لگا کر اسے بدنام کرنے کی کوشش کی تھی لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ اسے خود ہی دوسروں کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور وہ اب بھی وہی حرکتیں کر رہا ہے۔

"اے ہے سیکندہ بیٹی۔" چوہدری ثناب نے ہاتھ دھوئے بولی۔ "میں تو تمہیں سمجھانے آئی تھی۔ تم تو نا مجھ سے ہی لڑنے لگیں۔"

"میں سب سمجھتی ہوں چاچی۔" سیکندہ نے کہا۔ "آپ خود سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنے بچے کو بھی سمجھائیں۔ آپ لوگ ثناب کو اکیلی نہ سمجھیں۔ صرف ہم ہی نہیں پورا گاؤں اس کے ساتھ ہے۔"

"اچھا بیٹی۔" چوہدری ثناب نے ہاتھ دھوئے کرسی سے اٹھ گئی۔

کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ثناب عجیب سی نظروں سے سیکندہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ سیکندہ چوہدری کو ایسی کھری کھری باتیں سنا دے گی۔ سیکندہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "تم اپنے آپ کو اکیلی مت سمجھو۔ گاؤں والے بھی سب سمجھتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ تم ایسی باتوں سے بالکل مت گھبراتا۔"

"میں کیوں گھبرانے لگی ہوں ابھی۔" ثناب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ میرے ساتھ ہیں تو مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

سیکندہ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ زمرس اور عذرہ بھی اپنے اپنے کاموں میں لگی ہوئی تھیں۔

اس رات کھانے کے بعد وہ ایک بار پھر نیلے والے کھنڈروں کے تہہ خانے میں خزانہ کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

"میرا خیال ہے پہلے ایک دو ہیرے کسی جوہری کو دکھا کر ان کی قیمت معلوم کی جائے۔" سیکندہ نے کہا۔

"نور پور میں تو کوئی ایسا جوہری نہیں جو ان کی قیمت لگا سکے۔ بہر حال میں کل صبح ایک دو ہیرے لے جاؤں گا اور کرم الہی کو دکھا کر بات کروں گا۔ نور پور میں سب سے

شربت ملی تھی۔

”بیٹھیں ٹالک جی۔ آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں۔“ کرم اٹھی نے کہا اور پھر ایک ملازم کو آواز دے کر بولا۔ ”اوئے اکو۔ جا بھٹری بوٹھیں لے کر آ۔۔۔“

ٹایاب اور سکندر شوکیس کے سامنے خوبصورت ریو الونگ مشول نما کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کرم اٹھی ان عورتوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ان کے سامنے شوکیس پر زورات کے چار پانچ سیٹ کھلے ہوئے تھے۔ وہ ایک سیٹ پسند کر چکی تھیں اور اب قیت پر کچھ بات ہو رہی تھی۔ پالا خر چندرہ منٹ میں معاملہ طے ہو گیا اور ان عورتوں کے جانے کے بعد کرم اٹھی سکندر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جی ٹالک جی!“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کوئی سیٹ دکھاؤں یا انگوٹھی وغیرہ خریدنی ہے؟“

”آج تو میں کچھ خریدنے یا دیکھنے نہیں بلکہ دکھانے آیا ہوں۔“ سکندر نے کہا اور جب سے دونوں ہیرے نکال کر شوکیس پر رکھ دیئے۔

کرم اٹھی نے ایک ہیرا اٹھالیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر دوسرا ہیرا اٹھالیا اور اسے بھی توجہ سے دیکھنے لگا۔ آخر میں اس نے دونوں ہیرے شوکیس پر رکھ دیئے اور سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ ہیرے کہاں سے لئے ٹالک جی۔“

”چوری کے نہیں ہیں چاچا کرم اٹھی۔“ سکندر نے جواب دیا۔

”اوہو۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے ٹالک جی۔“ کرم اٹھی بولا۔ ”تو یہ تو یہ جی۔ آپ چوری کیوں کرنے لگے۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی ٹایاب چیز دیکھی ہے۔ کہاں سے لے آپ کو؟“

”یہ تو اس کے ہیں۔“ سکندر نے ٹایاب کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کا اپنا نام ٹایاب ہے تو اس کے ہیرے بھی ٹایاب ہی ہوں گے۔ دیئے ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

”میں نے تو پہلے ہی کہا ہے کہ ٹایاب چیز ہے اور زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے۔“ کرم اٹھی نے جواب دیا۔ ”میری زندگی گزر گئی یہ کاروبار کرتے ہوئے گمراہیے ہیرے کبھی نہیں

دیکھے۔“

”آپ کے خیال میں ان کی کیا قیمت ہوگی۔ کوئی خریدار ہے ان کا۔“ سکندر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹالک جی۔“ کرم اٹھی نے ایک بار پھر ہیرے اٹھا کر ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو پور میں تو ان کا کوئی خریدار نہیں ہو سکتا اور نہ ہی میاں ان کی قیمت لگ سکتی ہے۔“

”دیکھئے آپ کے خیال میں ان کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔“ سکندر نے پوچھا۔

”یہ ایک ہیرا۔“ کرم اٹھی نے ایک ہیرا چنگلی میں اٹھالیا۔ ”میرے خیال میں اس ایک ہیرے کی قیمت ڈیڑھ لاکھ سے اوپر ہوگی۔“

”آپ تو شرمناک رہتے ہیں۔“ کرم اٹھی بولا۔ ”وہاں آپ سیٹھ عبداللہ کو یہ ہیرے دکھائیے ان کی صحیح قیمت کے بارے میں وہی اندازہ لگا سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ سکندر نے ہیرے لے کر جبب میں رکھ لئے۔ ”جبب شرمناک ہو گا تو یہ بھی ساتھ لے جاؤں گا۔“

وہ دونوں دکان سے باہر نکل آئے۔

”ٹایاب بہن!“ سکندر گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”ہمارے پاس چودہ ہیرے ہیں۔ دو میری جبب میں اور بارہ گھر میں۔ ایک ہیرے کی قیمت اگر ایک لاکھ بھی لگ لیں تو چودہ لاکھ ہوئے اور اس عام عورتوں سے بھی زیادہ قیمتی ہیروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دوسری چیزیں ان کے علاوہ ہیں۔ اگر میں حساب لگاتا چاہوں تو میری محض جواب دے جائے گی۔

سیدھے سارے الفاظ میں یہ کون گا کہ تم اس وقت دنیا کی سب سے امیر عورت ہو۔“

”سکندر بھائی دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”اگر انسان اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو تو یہ دولت کس کام کی۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو اور ہمیں تمہاری یہی بات پسند آئی ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”لیکن دولت کے بغیر اس دنیا میں رہا بھی تو نہیں جا سکتا سارے کام دولت ہی سے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اس دولت سے تم بہت کچھ کر سکتی ہو لیکن

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دولت وہاں سے نکالی کیسے جائے۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو ہم سب کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔“

جائے گا ان لوگوں کے مشوروں سے ہی لیا جائے گا۔
 سکندر نے تھانے کے سامنے پہنچ کر گاڑی روک لی۔ جب وہ اندر پہنچے تو پتہ چلا کہ
 تھانیدار رائے پر نای گاؤں میں چوری کے ایک کیس کی تفتیش کے لئے گیا ہوا ہے۔
 ”اس حملہ آور کا کوئی سراغ ملا جس نے ٹایپ پر فائرنگ کی تھی؟“ سکندر نے سب
 انسپکٹر سے پوچھا۔

”تفتیش شروع کر دی ہے ملک جی اور آپ کے سوال کا جواب تو انسپکٹر صاحب ہی
 دے سکتے ہیں۔“ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

”تمہارا انسپکٹر بھی بڑا عجیب ہے۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”اتنا اہم کیس چھوڑ کر چوری
 کی تفتیش کرنے چلا گیا۔ لگتا ہے اس کا کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔“

”ملک جی! سب انسپکٹر نے سہمراٹے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک تھانیدار کا بندوبست
 کرنے سے کیا ہو گا۔ یہاں تو آوے کا آرا ہی بگڑا ہوا ہے۔ دیے ایک بات بتاؤں ملک
 جی۔ آپ اس بات کی تسلی کر لیں کہ نہ تو ہاجا کمار کے قتل کا سراغ ملے گا اور نہ ہی
 ٹایپ لابی بی بی پر حملہ کرنے والے موٹر سائیکل سوار کا۔“

”وہ تو مجھے پتہ ہے۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”اسی لئے تو کہا ہے کہ اس کا کوئی
 بندوبست کرنا پڑے گا۔ اچھا ٹھیک ہے میں کل صبح آکر اس سے بات کروں گا۔ اس کو بتا
 دینا کہ میں آیا تھا۔“

وہ دونوں تھانے سے باہر آگئے۔ سب انسپکٹر نے اسے جو کچھ بتایا تھا وہ سکندر کے
 لئے غیر متوقع غیر منظم گیسر تشریف آفر تھا۔ وہ کل ہی تھانیدار کی باتوں سے سمجھ گیا تھا
 کہ وہ اس معاملے میں زیادہ سیریس نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے مخالف پارٹی نے بڑی رقم لگائی
 ہو۔

ملک سکندر کچھ چیزیں بھی خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے گاڑی بازار میں ایک جگہ کمزی کر
 دی اور انجن بند کرتے ہوئے بولا۔

”تم گاڑی میں ہی بیٹھو میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔“

وہ گاڑی سے اتر کر ایک طرف چلا گیا۔ ٹایپ اپنی سیٹ پر بیٹھی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
 ابھی دس نہیں بجے تھے۔ بازاروں میں اچھی خاصی رونق تھی۔ آس پاس کے گاؤں دھماکتوں

”اس کیلئے ہمیں باقاعدہ پلاننگ کرنی پڑے گی اور شاید طویل عرصہ کیلئے مجھے یہاں رہنا
 بھی پڑے۔“ ٹایپ نے کہا۔

”رہنے کو تو ہمارا گھر حاضر ہے، تم رہ ہی ہو۔“ سکندر نے کہا۔

”میں سکندر بھائی۔“ ٹایپ نے کہا۔ ”میں نے محسوس کیا ہے کہ میرے آپ کے
 گھر میں رہنے سے گاؤں کے بعض لوگوں سے آپ کے تعلقات میں کشیدگی آ سکتی ہے۔
 مثلاً آج چوہدرائی اور سیکنڈ ہاؤس کے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں ان سے اندازہ لگایا جا سکتا
 ہے کہ میری وجہ سے آپ دونوں گھرانوں میں جاری سرحد جنگ کوئی اور صورت اختیار نہ کر
 لے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ اپنی رہائش کیلئے کوئی علیحدہ بندوبست کر لوں۔“

”پاکل ہو گئی ہو؟“ سکندر نے اسے گھورا۔ وہ دونوں گاڑی میں آکر بیٹھ گئے اور سکندر
 نے انجن شارت کر کے گاڑی آگے بڑھادی۔

”آپ اسے میرا پاکل پین ہی کہہ لیں۔ میں نے آج اہوازہ لگایا ہے کہ آئے والے
 وقت میں صورتحال بہت زیادہ سنگین ہو جائے گی اور میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ
 لوگوں کو کوئی ناقابل حلانی نقصان پہنچ جائے۔“

”تو پھر کہاں رہو گی؟“ سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

”گاؤں میں کوئی جگہ دیکھ لوں گی۔“ ٹایپ نے جواب دیا۔ ”میں نے سوچا ہے کہ کل
 شہر چلی جاؤں۔ چند روز وہاں رہ کر وہاں کے معاملات سمیٹ لوں اور پھر یہاں آ جاؤں۔
 ڈیڑی سے بھی اس خزانے کے بارے میں کچھ مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔“

”ایک بات بتانا بہن!“ سکندر نے کہا۔ ”کیس ایسا تو نہیں کہ تم اس خزانے کی وجہ
 سے ہم سے علیحدہ ہونا چاہتی ہو۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سکندر بھائی!“ ٹایپ نے چونک کر کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر
 پہلے میں نے کہا تھا کہ میں مادی دولت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ میں نے تو اس خزانے کے
 بارے میں کبھی اس انداز میں سوچا بھی نہیں۔ اگر وہ خزانہ کھنڈروں سے نکال بھی لیا گیا تو
 آپ ہی کی تحویل میں رہے گا۔ جو کچھ بھی ہو گا آپ ہی لوگوں کے مشورے سے ہو گا۔“

اور یہ حقیقت تھی۔ ٹایپ نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا کہ وہ ہی اس نے
 کبھی سکندر کی نیت پر شبہ کیا تھا۔ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ اس خزانے سے جو کام بھی لیا

کل اس پر فائزنگ کی تھی۔ بازار میں رش کی وجہ سے موٹر سائیکل کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔

اسی طرح تیز تیز چلتے ہوئے ٹایاب پیسے میں شرابور ہو گئی لیکن اس نے اپنی رفتار کم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ موٹر سائیکل آگے دائیں طرف سوک پر مڑ گئی تھی۔ ٹایاب اب باقاعدہ دوڑ رہی تھی۔ لوگ اسی طرح اسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ پاگل ہو گئی ہو لیکن وہ لوگوں کی نظروں کی پردا کے بغیر دوڑتی رہی اور موٹر پر پہنچ کر رک گئی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

یہ بھی پرہجوم بازار تھا اور پھر تقریباً تین گز آگے ایچ کی ایک دکان کے سامنے وہ موٹر سائیکل کھڑی دیکھ کر اچھل پڑی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے چلتے گئی۔

دکان کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ نیلی فیض والا وہ آدمی دکان کے اندر کھڑا دو آدمیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ اس نے تو ٹایاب کو نہیں دیکھا تھا لیکن سامنے کھڑے ہوئے ایک آدمی نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے وہ ٹایاب کو دیکھ کر چوک گیا ہو۔ اس نے مڑ کر دھیمے لیپے میں نیلی فیض والے سے کہہ کہا۔ نیلی فیض والے نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ چند سیکنڈ وہیں کھڑا دو آدمیوں سے باتیں کرتا رہا، پھر دکان سے باہر آگیا۔ جیسے ہی موٹر سائیکل کے قریب پہنچا ٹایاب اس کے سامنے آگئی اور کھڑکی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ٹایاب بات ہے لی بی! تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہی ہو۔" نیلی فیض والا بولا۔ "میرا خیال ہے تم مجھے اتنی جلدی نہیں بھول سکتے۔" ٹایاب نے کہا۔ "ابھی تو اس واقعہ کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ میں نے جس پیمانہ لیا ہے۔ مجھ پر فائزنگ کرسہ کے بعد تم اسی موٹر سائیکل پر کھیتوں میں فرار ہوئے تھے لیکن اب میں جس بھاگنے کا موقع نہیں دوں گی۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔" نیلی فیض والے نے کہا۔ "تم مجھ پر بلاوجہ الزام لگا رہی ہو۔ اس سے پہلے تو میں نے تمہیں کبھی دیکھا بھی نہیں۔"

لیکن ٹایاب نے پیچ پیچ کر لوگوں کو جمع کر لیا تھا۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے لی بی۔" ایک آدمی نے پوچھا۔

سے آنے والے لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔

دھننا۔ ٹایاب چونک گئی۔ اس کے چہرے پر کسی چیز کا عکس پڑا۔ ایک لمحہ کو اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی سنری چیز کی چمک پڑی ہو۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ گاڑی کے کچھل طرف سے آنے والی ایک موٹر سائیکل قریب سے گزر کر آگے نکلی تھی اور موٹر سائیکل کے پنڈل پر لگا ہوا آئینہ دھوپ میں چمک اٹھا تھا جس کا عکس اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ ٹایاب نے اس موٹر سائیکل کی طرف دیکھا اور بھرا جھل پڑی۔ موٹر سائیکل کے آئینے کے ساتھ سجاوٹ کیلئے سنری بینوں کی جھار سی بندھی ہوئی تھی اور وہ چمک اسی جھار کی تھی۔

ٹایاب کے دماغ میں جھماکے ہونے لگے۔ کل اس پر سٹلے کے بعد وہ موٹر سائیکل سوار جب کھیتوں میں فرار ہو رہا تھا تو ٹایاب کے چہرے پر ایسی ہی چمک پڑی تھی۔ اس نے آگے جاتی ہوئی موٹر سائیکل کی طرف دیکھا۔ وہ کافی دور نکل چکی تھی۔ ٹایاب بڑی بھرتی سے سرک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگئی لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کے منہ سے کمرہ سانس نکل گیا۔ سکندر شاہد بے خیالی میں جاہلی نکال کر اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ ٹایاب دردناک کھول کر نیچے اتر آئی۔ گاڑی کے قریب ہی ایک خزانچے والا کھڑا تھا۔

"خزانچے والے۔" ٹایاب اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "یہ گاڑی والا جب آئے تو اسے کتنا بیس رک کر میرا انتظار کرے۔"

"جس جاتا ہو جی۔ یہ ملک جی کی گاڑی ہے۔" خزانچے والے نے جواب دیا۔ "انہیں کتنا بیس رک کر میرا انتظار کریں۔" ٹایاب نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

وہ موٹر سائیکل کافی دور نکل چکی تھی۔ ٹایاب دوڑنے والے انداز میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلتی رہی۔ رش کی وجہ سے اسے آگے بڑھنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ اسے کئی مرتبہ لوگوں کو دھکے دے کر راستے سے ہٹانا پڑا تھا۔ لوگ گھور گھور کر اسے دیکھ رہے تھے۔

ٹایاب کی نظریں تقریباً چالیس گز آگے موٹر سائیکل سوار پر جمی ہوئی تھیں۔ نیلی فیض جیسے اس کی نظروں سے گز کر رہ گئی تھی۔ ٹایاب کو یقین تھا کہ یہ وہی آدمی ہے جس نے

”وہی“ کل جس نے مجھ پر گولیاں چلائی تھیں۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”اس کو موڑ سائیکل پر یہاں سے گزرتے دیکھ کر میں اس کے پیچھے چلی تھی اور بالاخر اسے پکڑ لیا۔ لوگ اسے قاتل لے کر گئے ہیں۔ جلدی چلیں سکندر بھائی!“

”چلو۔ گاڑی میں بیٹھو۔“ سکندر نے کہا اور ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور اکیشن میں چالی لگا کر انجن شارت کرنے لگا۔ اس دوران ٹایاب دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ چکی تھی۔

ملک سکندر نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سڑک پر بھوم کی وجہ سے گاڑی موڑ کر واپس لے جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ گاڑی کو سیدھا آگے لیتا چلا گیا اور بائیں طرف کی ایک گلی میں موڑ دیا۔ دو گلیاں محوم کر وہ گاڑی کو پھر سڑک پر لے آیا اور اس کا رخ قاتل کی طرف موڑ دیا۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ قاتل پہنچ گئے۔ دو پولیس والے پر آمد سے ایک دبلے پتلے سے نوجوان کی پٹائی کر رہے تھے۔ اسے جیب تراشی کے الزام میں پکڑ کر لایا گیا تھا۔ وہ دو دہائی بھی ایک بیچ پر بیٹھے ہوئے تھے جن میں سے ایک کی جیب سے اس جیب کترے نے پیسے نکالے تھے۔

قتلیدار ابھی تک راستے پور سے واپس نہیں آیا تھا۔ البتہ سب انسپکٹر موجود تھا۔ سکندر نے قاتل میں داخل ہوتے ہوئے گیت پر کمرے سنتری سے پوچھا تھا کہ کچھ لوگ کسی کو یہاں لے کر آئے ہیں یا نہیں۔ سنتری نے نفی میں سر ہلادیا تھا۔

”خیر یہ ملک گئی۔ آپ واپس آگئے۔“ سب انسپکٹر نے انہیں دیکھ کر پوچھا۔

”اشرف صاحب!“ سکندر بولا۔ ”ٹایاب نے اس بندے کو پہچان لیا ہے جس نے کل فائرنگ کر کے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”وہ کہاں ہے وہ؟“ سب انسپکٹر اشرف چونک گیا۔

”میں نے اسے بازار میں دیکھ کر پکڑ لیا تھا۔ میرے شوہر چمانے پر کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے اور جب میں نے لوگوں کو بتایا کہ وہ کون ہے تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ اسے قاتل لے کر رہے ہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ وہ یہاں پہنچ گئے ہوں گے۔“ ٹایاب نے بتایا۔

”ابھی تک تو یہاں کوئی نہیں پہنچا۔“ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”لیکن آپ نے

”اس آدمی نے کل مجھ پر فائرنگ کی تھی۔ میں بال بال بچ گئی تھی اور یہ اسی موڑ سائیکل پر فرار ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے خلاف قاتل میں رپورٹ کھسوا رکھی ہے۔ اسے قاتل لے چلو۔“

”ہل اوسے“ بھوم میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر بے تکلفی سے نیلی فیض والے کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

ایسے موقع پر لوگوں کی زیادہ ہمدردی عورت کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اس وقت بھی لوگ ٹایاب ہی کی حمایت کر رہے تھے۔ دو آدمیوں نے نیلی فیض والے کو ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

”چلیں بی بی۔ آپ چلیں۔ ہم اس کو قاتل لے کر جا رہے ہیں۔“ ایک آدمی نے کہا۔ وہ لوگ نیلی فیض والے کو دھکے دیتے ہوئے چلے گئے۔ ٹایاب بھی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کچھ اور لوگ بھی بھوم کی صورت میں ساتھ چل رہے تھے۔

موڑ پر بائیں طرف مڑنے کے بجائے وہ لوگ سیدھے چلے رہے تو ٹایاب بولی۔ ”اس طرف کہاں جا رہے ہو تم لوگ۔“ قاتل اس طرف ہے۔“

”اس طرف قریب کا راستہ ہے بی بی۔“ ایک آدمی نے جواب دیا۔

”میری گاڑی اس طرف کھڑی ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”اچھا۔ تم لوگ اسے لے کر قاتل پہنچ میں اپنی گاڑی لے کر آ رہی ہو۔“

”آپ آرام سے آجائیے بی بی۔ یہ اب کہیں نہیں جائے گا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ وہ لوگ آگے نکل گئے۔ ٹایاب بائیں طرف بازار میں مڑ گئی اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلے گئی۔ وہ چند منٹ بعد ہی کار کے قریب پہنچ گئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ سکندر گاڑی کے قریب کھڑا تھا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چونک گیا۔

”کیا بات ہے۔ کہاں چلی گئی تھی تم؟“ سکندر نے پوچھا۔

”میں نے اسے پکڑ لیا ہے۔ وہ لوگ اسے قاتل لے کر گئے ہیں۔“ ٹایاب نے بے ربط شخص پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کسے پکڑ لیا ہے؟“ سکندر کے لیے میں حیرت تھی۔

پکڑا تھا۔ کار سے اترتے ہوئے ٹایاب کے دل کی دھڑکن جڑ ہو گئی۔ وہ متحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ موٹر سائیکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ اسے یاد تھا کہ جب لوگ اس آوی کو پکڑ کر لے جا رہے تھے تو موٹر سائیکل وہیں کھڑی تھی۔ سکندر اور سب انسپکٹر اشرف بھی بیچے اتر آئے۔ پولیس کی جیب بھی ان کے پیچھے آ کر رک گئی تھی اور اس میں بیٹھے ہوئے تینوں پولیس اہلکار بھی بیچے اتر چکے تھے۔

”اس دکان سے پکڑا تھا میں نے اسے۔“ ٹایاب نے بتایا۔ ”لوگ جب اسے لے کر گئے تھے تو اس کی موٹر سائیکل یہاں کھڑی تھی لیکن اب وہ موٹر سائیکل نہیں ہے۔“ پولیس کو دیکھ کر لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دونوں کانشیل لوگوں کو وہاں سے ہٹا رہے تھے۔ اناج کی دکان کا مالک سب انسپکٹر کو دیکھ کر باہر آ گیا۔ وہ اوجیر عمر آوی تھا۔ پیٹ سے حماد بڑھا ہوا تھا۔ گلتا تھا اس نے پیٹ پر کوئی مٹکا باندھ رکھا ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر گرجھوٹی سے سب انسپکٹر سے ہاتھ ملایا تھا۔

”کیا حال ہے مرنی۔“ سب انسپکٹر بولا۔ ”کون تھا وہ جسے اس بی بی نے یہاں سے پکڑا تھا؟“

”مجھے تو پتہ نہیں جی۔“ میں تو بینک گیا ہوا تھا۔ مرنے جواب دیا۔ ”جو کچھ ہوا میرے بعد ہی ہوا ہے۔ اوسے مدینے۔“ اس نے ایک ملازم کو آواز دی۔ ”کیا ہوا تھا یہاں۔ وہ کون تھا؟“

دور کھڑا ہوا صدقات ان کے قریب آ گیا۔ پہلے اس نے سب انسپکٹر کو سلام کیا، پھر بولا۔ ”وہ گھو تھا جی۔ کبھی کبھی فور پر آتا ہے۔“

”کون گھو۔ کہاں رہتا ہے؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔ ”محمد گھر کا رہنے والا ہے جی۔“ مدینے نے جواب دیا۔ ”میری بہن وہاں رہتی ہے۔ میں مینے میں ایک آدھ بار دھلا چلا جاتا ہوں۔ گھو تو محمد محمد کا بہت مشہور بدعاش ہے۔ کبھی کبھی اس طرف بھی آ جاتا ہے۔ کل بھی میں نے اسے بازار میں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ دو ساتھی پہلے سے یہاں کھڑے تھے۔ وہ یہاں کوئی سلمان خریدنے آئے تھے۔ گھو کو شاید پہلے سے پتہ تھا کہ وہ یہاں ہوں گے، اسی لئے وہ بھی آ گیا تھا۔ وہ یہاں کھڑا ان سے باتیں کر رہا تھا کہ یہ بی بی آئی اور اس کے شور مچانے پر لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔“

اسے پکڑا کیسے؟“

”اس کی موٹر سائیکل سے۔“ ٹایاب نے جواب دیا اور پھر اسے تفصیل بتانے لگی۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے لوگ ابھی تک اس شخص کو لے کر نہیں پہنچے تھے۔ ٹایاب کو اب تشویش ہونے لگی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ شخص اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگ تو نہیں گیا تھا؟

دس منٹ اور گزر گئے لیکن وہ لوگ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

”بی بی۔ آپ نے اسے کہاں دیکھا تھا اور کن لوگوں نے پکڑا تھا اسے؟“ سب انسپکٹر اشرف نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے پر بھی اب تشویش کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔

”مجھے بازار کا نام تو معلوم نہیں لیکن اس سڑک کے موڑ پر ایک دکان کا نام یاد ہے۔ راجہ نشور۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”اس سڑک پر چند گز آگے اناج کی ایک دکان ہے میں نے اسی دکان پر اسے پکڑا تھا۔ لوگ اسے پکڑ کر ایک گی کی طرف لے کر آئے تھے اور میں بازار کی طرف آگئی تھی کیونکہ گاڑی بازار میں کھڑی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ ہم سے پہلے پہنچ گئے ہوں گے۔“

”مجھے تو کوئی گویا لگ رہی ہے۔“ سب انسپکٹر بولا۔ ”کتنے آوی تھے اس کے ساتھ؟“ ”پہلے تو پانچ چھ آوی تھے لیکن کئی میں داخل ہوتے ہوئے صرف دو آوی رہ گئے تھے جنہوں نے اسے پکڑ رکھا تھا۔ انہی میں سے ایک نے دوسرے آدمیوں کو ساتھ آنے سے منع کر دیا تھا۔“ ٹایاب نے بتایا۔

”میرے ساتھ آئیے۔“ سب انسپکٹر اشرف کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹایاب اور سکندر نے بھی اپنی کرسیاں چھوڑ دیں۔ سب انسپکٹر نے ایک اسے ایس آئی اور دو کانشیلوں کو بھی اپنے ساتھ آنے کو کہا اور دروازے سے باہر آ گیا۔ تھانے کے سامنے پولیس کی ایک جیب کھڑی تھی۔ اسے ایس آئی اور دونوں کانشیل جیب میں بیٹھ گئے۔ سب انسپکٹر کار میں سکندر کے ساتھ بیٹھ گیا اور ٹایاب پچھل سیٹ پر۔ سکندر نے انجین شارت کر کے کار کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ جیب بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ لوگ اناج کی اس دکان پر پہنچ گئے جہاں ٹایاب نے اس آوی کو

گا۔ ”سب انسپکٹر نے کہا اور ملک سکندر سے ہاتھ ملا کر اپنی جیب کی طرف بڑھ گیا۔

ٹایاب اور سکندر بھی اپنی گاڑی میں آگئے اور کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ بازاروں سے نکل کر ہائی وے پر آ گئے۔

”مددیتے نے بتایا تھا کہ گھو مگر کا رہنے والا ہے۔“ سکندر نے ٹایاب کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”میں بھی مگر مگر جاتا رہتا ہوں۔ وہاں کے دو تین چہرہ دیوں سے میری دوستی ہے لیکن پہلے میں نے گھو کا نام بھی نہیں سنا۔“

”پہلے آپ اس قسم کے حالات سے دوچار بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”اس قسم کے لوگوں سے واسطہ تو اسی وقت پڑتا ہے جب آدمی اس طرح کے حالات سے دوچار ہوتا ہے۔“

”ہاں، تم قلم کبھی ہو۔“ سکندر نے کہا۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گھو کو تم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ اس نے ہمیں قتل کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟“ سکندر بولا۔

”آپ بھی واقعی زمرے پینڈو ہیں سکندر بھائی!“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس قسم کے کام کرانے کے بد معاشرہ ہی سے لے جاتے ہیں اور بد معاشرہ بھی ایسے منتخب کئے جاتے ہیں جنہیں اس علاقے کا کوئی آدمی پہچانتا نہ ہو۔ یہ تو اتفاق ہے کہ مددہ اپنی بہن کے ہاں مگر مگر آتا جاتا رہتا ہے۔ اس نے گھو کو مگر مگر میں دیکھا ہو گا۔ اس لئے پہچان لیا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ سکندر نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی اے کرنے کے بعد بھی میں پینڈو ہی ہوں۔“

ٹایاب نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

گاڑی اور ہائی وے سے گاؤں کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ گاؤں سے ذرا پہلے ٹایاب نے گاڑی روک لی اور بائیں طرف دیکھنے لگی جہاں تقریباً دو سو گز آگے وہ جنگلیاں نظر آ رہی تھیں جہاں کل وہ بوڑھا گیا تھا۔

”ان جنگلیوں میں کون رہتا ہے؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”سنگیوں کے پانچ چھ گھر ہیں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو۔“ سکندر بولا۔

”اس کی موٹر سائیکل کہاں ہے؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”اس کے ایک دوست نے واپس آ کر کہا تھا کہ گھو کو تھامے پھنسا دیا ہے اور تھاندار نے اس کی موٹر سائیکل منگوائی ہے۔ وہ موٹر سائیکل لے کر چلا گیا۔“ مددیتے نے بتایا۔

”اس کے دوستوں کو جانتے ہو۔ کون تھے وہ؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”انہیں میں نہیں جانتا جی۔“ مددیتے نے جواب دیا۔

”موٹر سائیکل کا نمبر تو میں نے دیکھا نہیں جی لیکن وہ بوڑھا موٹر سائیکل تھی۔“ مددیتے نے بتایا۔

اس کی باتوں سے ٹایاب کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گھو نامی اس شخص کے دوست چالاکی سے اسے نکال لے گئے تھے۔ ٹایاب کو یاد آ رہا تھا کہ لوگ جب اس شخص کو لے کر چلے تھے تو وہ دونوں آدمی بھی ساتھ تھے جن کے ساتھ ٹایاب نے اسے بائیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یقیناً یہی ہوا ہو گا کہ کبھی میں داخل ہونے کے بعد ان دونوں نے گھو کو ہانپوں سے پکڑ لیا ہو گا اور باقی لوگوں کو واپس کر دیا ہو گا۔ ان میں سے ایک تو گھو کو لے کر چلا گیا اور دوسرا واپس آ کر اس کی موٹر سائیکل بھی لے گیا۔

”وہ آدمی کتنی دیر پہلے موٹر سائیکل لے گیا تھا؟“ سب انسپکٹر نے مددیتے سے پوچھا۔

”میںں مجتبیٰ صفت ہو گئے ہیں جی۔“ مددیتے نے جواب دیا۔

مگر مگر وہاں سے تقریباً پینتیس میل دور ایک اور بڑا قصبہ تھا۔ وہ علاقہ اگرچہ اس تھانے کی حدود میں نہیں تھا لیکن نور پور سے تقریباً بائیس میل تک تو اس تھانے کی حدود تھیں۔

”ملک جی۔“ سب انسپکٹر سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ مگر جاپیے جی! میں تھانے سے ہو کر ان کے تقاب میں جاتا ہوں۔ ویسے اب اس کی شناخت ہو گئی ہے۔ وہ بچ کر نہیں جاسکے گا۔ دیے لی بی۔“ وہ ٹایاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”کہا آپ کو یقین ہے کہ یہ وہی آدمی تھا۔“

”اب تو سو فیصد یقین ہو گیا ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”مگر وہ نہ ہوتا تو اس طرح دھوکا دے کر فرار نہ ہوتا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ لوگ مگر جاپیے۔ اگر وہ پکڑا گیا تو میں آپ کو اطلاع پہنچا دوں

کڑی کڑی چپٹے گئی۔

ملک سکندر جمونپڑیوں کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹایاب کو جمونپڑیوں سے باہر آتے ہوئے دیکھا تو انجی شارت کر دیا لیکن پھر اچانک ہی ٹایاب کو چپٹے دیکھ کر اچھل پڑا۔ اس نے بڑی جلدت میں دروازہ کھولا اور انجی چلا چھوڑ کر گاڑی سے اتر آیا۔

”کیا ہوا ٹایاب۔ کیا بات ہے۔ کیوں چپ رہی ہو؟“ وہ گھنڈی پر تیز چلے ہوئے چنچا۔

ٹایاب اب بھی چپ رہی تھی۔ اس کی نظریں اس سیاہ ناگ پر جمی ہوئی تھیں جو ایک بار پھر اس کے سامنے پہنچ پھلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

سکندر دوڑتا ہوا قریب پہنچ گیا اور پھر ناگ کو دیکھ کر وہ بھی رک گیا۔ سیاہ ناگ نے کٹھنی بدلی اور پھر دیکھتی ہی دیکھتے رہنکٹا ہوا اکیتوں میں غائب ہو گیا۔

”اوہ!“ سکندر کے منہ سے نکلا۔ ”تم اس سانپ سے ڈر گئی تھیں۔ میرا خیال ہے سانپ تو اب تم سے ڈرنے لگے ہیں۔ تم کیوں ڈر گئیں؟“

”سکندر بھائی۔“ ٹایاب نے گمراہ سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سانپ میرے رشتہ دار نہیں ہیں۔“

”ارے بھئی۔ میرا مطلب ہے اس سترے سانپ سے تمہاری دوستی ہو گئی ہے نا۔ اس کی وجہ سے دوسرے سانپ بھی تمہارے مطیع ہو گئے ہیں۔ میں نے اس روز کھنڈروں کے نیچے والے قبر خانے میں دیکھا تھا۔ سانپ تمہارے آگے پیچھے پھر رہے تھے لیکن۔“

”لیکن سکندر بھائی ضروری نہیں ہے کہ یہ سانپ بھی اسی قبیلے کا ہو۔“ ٹایاب نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔ ”یہ تو اس طرح میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا جیسے ڈسے بغیر نہیں مانے گا۔“

”اچھا اب چلو۔ تیز دھوپ میں کھڑے کھڑے تمہارا دماغ چلپلا ہو جائے گا۔“ سکندر نے کہا۔

”میرا دماغ تو دیے ہی چلپلا ہو رہا ہے۔“ ٹایاب نے اس کے پیچھے پیچھے گھنڈی پر چلے ہوئے کہا۔ ”آج کل کچھ ایسے عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں کہ دماغ نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”وہ پراسرار بوڑھا کل انہی جگہوں میں گیا تھا۔“ ٹایاب نے کہا اور پھر دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ ”آپ چند منٹ یہاں رکے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ سکندر کے جواب کا انتظار کے بغیر گاڑی سے اتر کر کیمت میں گھر کر تیز قدموں سے گھنڈی پر چلے گئی۔

وہ تقریباً پانچ منٹ میں ان جگہوں میں پہنچ گئی۔ جگہوں کے ساتھ دو تین ساتباں بھی بنے ہوئے تھے۔ تین چار عورتیں ان ساتباؤں کے نیچے بیٹھی چٹائیاں اور ٹوکریاں بن رہی تھیں۔ چند ننگے دھڑنگ بچے بھی کھیل رہے تھے۔ ٹایاب کو دیکھ کر وہ عورتیں اٹھ کر کڑی ہو گئیں۔

”سلام چھوٹی بی بی۔“

”سلام۔“ ٹایاب نے جواب دیا اور پھر ان عورتوں سے اس بوڑھے کے بارے میں پوچھنے لگی۔

”یہاں تو ایسا کوئی بندہ نہیں رہتا جی۔“ ایک عورت نے جواب دیا۔

”کل میں نے اسے گاڑی سے وہاں اتارا تھا اور وہ اسی طرف آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں رہتا ہے۔“ ٹایاب نے ایک بار پھر بوڑھے کا تفصیلی حلیہ دہرا دیا۔

”میں چھوٹی بی بی!“ اس مرتبہ ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ ”یہاں تو اس طے کا کوئی بندہ نہیں رہتا اور نہ ہی کل یہاں ایسا کوئی بندہ آیا تھا۔“

ٹایاب کا دماغ گھوم گیا۔ کل وہ بوڑھا انہی جمونپڑیوں کی طرف آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ یہیں رہتا ہے لیکن ان عورتوں نے تو اسے پہچانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

ٹایاب چند لمحوں کے لیے کڑی رہی پھر جگہوں سے نکل کر گھنڈی پر واپس چلے گئی۔ اس نے تقریباً آدھا راستہ طے کیا تھا کہ ٹھک کر رک گئی۔ اس کے دو تین گمراہ آگے گھنڈی پر ایک سیاہ ناگ پہن اٹھا۔ بیٹھا تھا۔

ٹایاب دھشت زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور گٹا تھا جیسے ناگ بھی براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہو اور پھر وہ ناگ رہنکٹا ہوا ٹایاب کی طرف بڑھنے لگا۔

اس خوفناک سیاہ ناگ کو اپنی طرف آنا دیکھ کر ٹایاب کے منہ سے بے اختیار چچ نکل گئی۔ اس نے بھانکا چلا کر اس کے پیر جیسے زمین سے چپک کر رہ گئے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر

”نہیں ہیں۔ تمہاری سیلیاں مذاق اڑائیں گی۔“ ثایاب نے کہا۔
 ”زخم باہمی نے اپنا ایک جوڑا آپ کیلئے تیار کر رکھا ہے بس آپ جلدی سے کپڑے بدلیں تو ہم چلیں۔“ عذرہ نے کہا۔

”اچھا بھئی۔ تیار ہو جاتی ہوں۔“ ثایاب نے گمراہ سانس لیتے ہوئے کہا اور پھر تقریباً ایک گھنٹے بعد جب ثایاب تیار ہو کر کمرے سے نکل تو سیکینہ بھی اسے دیکھتی رہ گئی۔ ثایاب یوں بھی بہت حسین تھی۔ میک اپ اور ہماری جوڑے میں اس کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ تینوں نامرہ کے گھر پہنچ گئیں۔ لگتا تھا جیسے پورا گاؤں وہاں جمع ہو گیا تھا۔ عورتوں نے ثایاب کو گھیر لیا۔ کل کی فزکس کے واقعے کا بھی سب کو پتہ چل گیا تھا۔ عورتیں اس کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں اور پھر کسی طرف سے یہ بات سننے میں آئی کہ ثایاب عورت نہیں، ناگن ہے جس نے انسان کا روپ دھار رکھا ہے۔ ثایاب سمجھ گئی تھی کہ یہ بات کس نے پھیلائی تھی۔ اس کا ایک ہی دشمن تھا، چوہدری سعادت۔ چوہدری گمرانے کا اگرچہ کوئی فرد اس شادی میں شریک نہیں تھا لیکن ان سے تعلق رکھنے والے لوگ تو موجود تھے اور یہ بات انہی میں سے کسی نے پھیلائی تھی۔

اور پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے کچھ دیر کے لئے محفل میں بد مزگی پیدا ہو گئی۔ وہ مجبول ساندوی اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ ذہنی طور پر ایب نارمل تھا۔ کوئی کام دھندہ نہیں کرنا تھا۔ سارا دن گاؤں میں ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اسے ”اللہ لوگ“ کہتے تھے۔

اللہ لوگ، بنو بچو، بنو بچی کی آوازیں لگتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں مور اٹھا رکھا تھا۔ وہ ثایاب کے سامنے آ کر رک گیا۔

”سامنے کہاں گھمے چلے آ رہے ہو۔ یہ کس کا مور پکڑ لائے ہو۔“ ایک عورت نے کہا۔ ”چلو بھاگو یہاں سے۔۔۔ باہر جاؤ۔“

”یہ مور اس کے لئے لایا ہوا ہے۔“ سامنے اللہ لوگ نے سر سے ثایاب کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ناگن ہے نا۔۔۔ پتلی۔۔۔ مور سے ڈرتی ہے۔ اب ان دونوں کی لڑائی ہو گی۔ بڑا مزہ آئے گا۔“

”گھبرائو نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ سکندر نے کہا۔ وہ دونوں کھیت سے نکل کر گاڑی کے قریب آ گئے تھے۔ ”دوپے میرا خیال ہے کہ تم ان جمونیزوں میں اس بوڑھے کے بارے میں پوچھنے گئی تھیں۔ میں تو ان تمام لوگوں کو جانتا ہوں یہاں تو اس طرح کا کوئی بوڑھا نہیں رہتا جس کے بارے میں تم نے کل بتایا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی کے گھر پر رہے آیا ہو۔“

”میں سکندر بھائی۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ ”نہ تو وہ بوڑھا یہاں رہتا ہے اور نہ کسی کے گھر پر رہتا بن کر آیا تھا۔ بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ کل اس بوڑھے کو میں نے اسی جگہ پر گاڑی سے اتارا تھا اور وہ اسی گھنٹہ بڑی پر سے ہوتا ہوا ان جمونیزوں میں گیا تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جمونیزوں میں رہنے والوں میں سے کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ ان عورتوں کا کہنا ہے کہ کل اس ملنے کا کوئی بوڑھا اس طرف آیا ہی نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں ہو رہا ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”چوہدریوں والے محاملات کی وجہ سے تم پریشان ہو۔ تمہارا ذہن اپ سیٹ ہو رہا ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مسئلہ تو مزید پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔“ ثایاب نے گمراہ سانس لیتے ہوئے کہا۔ سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور پھر چند ہی منٹ بعد وہ گاؤں پہنچ چکے تھے۔

گاؤں میں بڑی رونق تھی۔ ایک کسان کی بیٹی کی شادی تھی۔ اس کے تعلقات سب سے تھے اور اس نے بہت سے لوگوں کو بیٹی کی شادی پر مدعو کر رکھا تھا۔ نامرہ، عذرہ کی سہیلی تھی۔ ان کا سارا گھر اس شادی میں مدعو تھا۔ ثایاب جب گھر پہنچی تو عذرہ اور زکس تیار تھیں۔ عذرہ تو صبح سے کئی جگہ نامرہ کے گھر کے لگا چکی تھی۔ وہ ثایاب کو دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔

”ثایاب بائی! آپ نے اتنی دیر لگا دی۔ آپ کو پتہ تھا نامرہ کی شادی پر جانا ہے۔ میں بچے بارات آنے والی ہے۔ ابھی دو بج رہے ہیں۔ آپ جلدی سے تیار ہو جائیے۔“

”اچھا بھئی تیار ہو جاتی ہوں مگر میرے پاس شادی میں پہننے والے ذرق برق کپڑے

سے پہلے کہ بات بڑھ جاتی، سکندر نے صورتحال کو سنیںال لیا۔

”نامرہ بٹی کی ذہنی رخصت ہو جانے دو، پھر بات کر لیتے ہیں چوہدریوں سے۔“ اس نے کہا۔ ”میں اس موقع پر کوئی جھگڑا نہیں چاہتا۔ بارات والے پروہنے کیا کہیں گے۔ بس اب ختم کرو بات کو۔“

اور اس طرح بات واقعی طور پر ٹل گئی۔ پانچ بجے کے قریب بارات رخصت ہو گئی اور اس کے بعد بیکے کی تلاش شروع ہو گئی اور بالاخر اسے مویشیوں کے باڑے سے پکڑ لیا گیا۔ سب لوگ ابھی تک شادی والے گھر میں ہی جمع تھے۔ ماسٹر محمد علی بھی موجود تھا۔

”کیوں آئے گے۔“ آخر کہیں ہی نکلا تھا۔ ”ماسٹر محمد علی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا حرکت کی تھی تو نے۔“ مہمانوں کے سامنے کیا عزت رہ گئی ہماری۔ ٹایاب بٹی بھی تو مہمان ہے ہماری۔ وہ کیا سوچتی ہو گی۔ آئے کم ذات۔ ٹایاب نے اگر چوہدریوں سے حصار لگایا ہے تو وہ اس کی فکر کے ہیں۔ وہ ان کی بسو ہے۔ ان کا آپس میں جھگڑا ہے تو چلنے دو۔ مگر تو ذات ہو کر ان کی برابری کر رہا ہے۔ اپنی اوقات بھول گیا ہے کیا۔ بتا تو نے ایسا کیوں کیا؟ میری بات کا جواب دے دو نہ تجھے اس پتیل کے درخت کی سب سے اونچی شاخ سے الٹا ٹانگ دیں گے۔ بتا تو نے ایسا کیوں کیا؟“

”مجھے معاف کر دو ماسٹر جی۔“ بیکے نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”معافی کے بارے میں تو بعد میں سوچیں گے۔ پہلے یہ بتا کس کے کہنے پر ایسا کیا تو نے۔“ ماسٹر محمد علی نے کہا۔

”کس کے کہنے پر نہیں جی۔“ بیکے نے کہا۔ ”وہ جی میں نے لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ چھوٹی بی بی انسان نہیں، ناگن ہے۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ سانپ مور سے ڈرتا ہے۔ جہاں مور ہو وہاں سانپ نہیں ہوتا۔ میں نے آڑے آنے کیلئے سائیں اللہ لوگ کو وہ مور دیا تھا اور اسے کہا تھا کہ چھوٹی بی بی کو جا کر دے دے۔ مگر اس نے دور سے ہی پیمیک دیا۔ مجھے معاف کر دو ماسٹر جی۔ آئندہ ایسی کوئی غلطی نہیں ہو گی جی۔“

”تو نے کس کے کہنے پر ایسا کیا تھا؟ سچ بتا۔“ ماسٹر محمد علی نے اس کے منہ پر زور دار تھپڑ رسید کر دیا۔

”وہ۔۔ وہ جی۔۔ میں نے خود ہی۔۔“

سائیں کی بات سن کر ایک لمحہ کو سناٹا سا چھا گیا۔ ٹایاب کے چہرے پر بھی ایک رنگ سے آکر گزر گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ سائیں کو یہ باتیں کس کا کسی نے بھیجا ہو گا اور پھر سائیں نے اچانک ہی ہاتھوں میں پکڑے ہوئے مور کو ٹایاب کی طرف اچھال دیا۔ مور ٹایاب کے اوپر گرا، وہ لڑکھار کر پیچھے ہٹ گئی۔

دو تین لڑکیاں چیخنے لگیں۔ عورتوں کے شور سے مور بدحواس ہو کر ادھر ادھر اچھلنے لگا اور پھر راستہ پا کر ایک طرف بھاگ گیا۔ شور سن کر دو تین آدمی بھی وہاں پہنچ گئے۔

”کیا ہوا لڑکیاں! کیوں چیخ رہی ہو۔“ ناصرو کے چاچا ماسٹر علی محمد نے چیخ کر پوچھا۔ ”چاچا، مور۔“ ایک لڑکی نے جواب دیا۔ ”سائیں اللہ لوگ نے چھوٹی بی بی پر مور پھینک دیا تھا، کہتا ہے یہ ناگن ہے۔ مور سے اس کی لڑائی ہو گی تو مرنا آئے گا۔“

ماسٹر علی محمد بھی ایک لمحہ کو سناٹے میں گیا۔ اس نے ٹایاب کی طرف دیکھا جو اس وقت تک اپنی کیفیت پر قابو پا چکا تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ماسٹر علی محمد کو بھی صورتحال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ جس رات چوہدری سعادت نے اپنی حویلی میں لوگوں کی دعوت کی تھی اس رات ماسٹر علی محمد بھی وہاں موجود تھا اور اس محفل میں سنہری ناگ کو ٹایاب کے ساتھ دیکھ کر چوہدری سعادت نے کہا تھا کہ ٹایاب انسان نہیں ناگن ہے۔ ماسٹر علی محمد جانتا تھا کہ سانپ اور مور میں انہی دشمنی ہے جس علاقے میں مور ہوتا ہے وہاں دور دور تک سانپ نہیں ہوتا اور اس وقت بھری محفل میں چوہدری سعادت نے سائیں اللہ لوگ کے ذریعہ جو حرکت کی تھی اس کا مطلب بھی وہ سمجھ گیا تھا۔

یہ بات باہر مردوں میں بھی پہنچ گئی۔ ایک آدمی نے سائیں اللہ لوگ کو پکڑ لیا اور اس کے منہ پر دو تین تھپڑ رسید کرتے ہوئے بولا۔

”جیس چھوٹی بی بی پر مور پھینکے کو کس نے کہا تھا؟“

”بیکے نے۔“ سائیں اللہ لوگ نے دوتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس نے مجھے دو روپے دیئے تھے۔“

بگا، چوہدری سعادت کا مزارع تھا۔ لوگوں کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ حرکت کس کی تھی۔ کئی آدمی غصے میں آگئے اور وہ کھل کر چوہدری سعادت کو گالیاں دینے لگے لیکن اس

”اس کے بارے میں تو میں نے سوچ لیا ہے۔“ سکندر نے جواب دیا اور پھر بگے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم اپنا یوینا بستر سینو اور آج رات ہی اس گاؤں سے نکل جاؤ۔ اگر کل صبح تم اس گاؤں میں نظر آئے تو چوڑی اویڑوں گا۔“

”مجھے معاف کر دو ملک جی۔“ بگے کو کڑوا نے لگا۔ ”چھوٹا چوہری مجھے کیس بھی جین سے نہیں رہنے دے گا۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔“

”کل جی ٹھیک کہتے ہیں۔“ ہدایت اللہ بولا۔ ”تم صبح ہونے سے پہلے پہلے گاؤں چھوڑ دو۔ اگر کل صبح تم گاؤں کے آس پاس بھی نظر آئے تو ہم تمہیں مار دیں گے۔“

”میں کئے کئے بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گا ملک جی! مجھے معاف کر دو۔“ بگے کو کڑوا نے ہونے سکندر کے پیروں پر گر گیا۔

”چل بھاگ جا اب یہاں سے۔“ سکندر نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”کل صبح مجھے گاؤں میں نظر نہ آنا سمجھے۔“

بگے ایک ایک کے سامنے ہاتھ جوڑ کر منہیں کرتا رہا مگر سب کا فیصلہ یہی تھا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے گاؤں چھوڑ دے۔ بالآخر آنسو بہانا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

چوہری امانت علی کو بھی پیغام بھیج دیا گیا کہ وہ رات آٹھ بجے چوہال پہنچ جائے۔

سکندر گھر آگیا۔ ثانیاب وغیرہ بھی چند منٹ پہلے ہی واپس آئی تھیں۔ سکندر کے گھر پہنچتے ہی آج کے مسئلے پر بحث شروع ہو گئی۔

”اب تو انا ہو گئی ہے۔“ سکندر کہہ رہا تھا۔ ”آج بڑے چوہری کو چوہال میں بلایا ہے۔ سب لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر اس نے سفارت کو ان حرکتوں سے نہ روکا تو ان کا حق پانی بند کر دیا جائے گا۔“

”ہو گیا حق پانی بند۔“ سیکنے بولی۔ اس کے لمبے میں ہلکا سا طعنے تھا۔ ”آپ چوہریوں کو بھی جانتے ہیں اور گاؤں والوں کو بھی۔ چوہریوں کا حق پانی بند کر کے یہ لوگ خود کہاں جا رہے ہیں؟“

”اب وقت بدل گیا ہے سیکنے بی بی!“ سکندر نے کہا۔ ”گاؤں کے لوگوں کو بھی اب تھوڑی بہت عقل آگئی ہے۔ وہ جان گئے ہیں کہ بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار ان کا خون چوس رہے ہیں۔ کل تک گاؤں والوں کی زبانیں بند تھیں لیکن آج وہ کھل کر

”بچ جاتا اوسے۔۔۔“ سکندر نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ ”بچ جاتا ورنہ تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔“ اس نے ایک ہاتھ اس کے گلے پر جما دیا۔

”بب۔ بتاتا ہوں ملک جی۔ بب۔ بتاتا ہوں۔“ بگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ اس کے منہ سے گھنٹی گھنٹی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ”وہ۔ وہ مجھے مار دیں گے جی۔“

”اگر نہیں بتائے گا تو میں تجھے مار دوں گا۔“ سکندر غرایا۔ ”جلدی بتا۔“

”بب۔ بتاتا ہوں جی۔“ بگے نے اب بھی ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ وہ خوف سے قہر قہر کانپنے لگا تھا۔ ”چھوٹے چوہری نے کہا تھا جی۔ میری خود تو بہت نہیں ہوئی تھی جی۔ میں نے وہ مور سائیں اللہ لوگ کو دے دیا تھا۔“

”سن لیا گاؤں والوں۔“ سکندر بگے کو چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”چھوٹا چوہری ثانیاب بی بی کے خلاف جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ سب آپ لوگ دیکھتے رہے ہیں اور آج کی یہ نئی حرکت بھی آپ لوگوں نے دیکھ لی۔ اس نے مہمانوں کے سامنے سب کو ذلیل کیا ہے۔ بارات والے کیا سوچتے ہوں گے۔ اس گاؤں کی بو بیٹیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ اب آپ لوگوں بتائیں اس کا کیا حل تلاش کیا جائے۔“

”چھوٹے چوہری کو اپنی دولت کا غرور ہے۔“ ایک طرف کھڑے ہوئے ہدایت اللہ نے کہا۔ ”میری نظروں میں اس کا ایک ہی حل ہے۔“

”وہ کیا۔“ ماسٹر محمد علی نے پوچھا۔

”آج رات ہم بڑے چوہری صاحب سے بات کرتے ہیں۔ اگر اس نے اپنے بیٹے کے گلے میں پنہ نہ ڈالا تو ہم اس کا حق پانی بند کر دیں گے۔“

”پہلے وہ کوئی تمہارے ساتھ بیٹھ کر حق پانی پیتا ہے۔“ کرم الہی نے کہا۔

”اسے ہماری کیا پروا ہے۔ وہ تو جاگیردار ہے۔ ہمیں اپنا غلام بھگتا ہے۔ حق پانی بند کر دینے سے کیا ہو گا؟“

”ہدایت اللہ ٹھیک کہتا ہے۔“ ماسٹر محمد علی نے کہا۔ ”آج رات بڑے چوہری صاحب کو چوہال میں بلا لو۔ اس کا ہمارے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ سی لیکن سوشل پائیکٹ بہت بڑی بات ہوتی ہے اور ملک جی۔“ وہ سکندر کی طرف گھوم گیا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے۔“ اس کا اشارہ بگے کی طرف تھا۔

گاؤں سے نکل کر وہ کیتوں میں آگئی۔ آج اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ اس طرف وہ پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ کیتوں میں کام کرتے ہوئے لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک جگہ رگ مچی اور کیتوں کے بیچ میں ایک اونچے بے پر ایک پرانی سی عمارت کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کوئی پرانی حویلی تھی جو غالباً ٹوٹ چھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ حویلی کے آس پاس ٹاٹلی اور پتیل کے درختوں کی بہتات تھی لیکن اس طرف کسی ذی روح کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

ٹایاب دو تین کیتوں کا فاصلہ طے کر کے ایک بار چمڑک گئی۔ وہاں ایک کھیت میں پانی لگا ہوا تھا اور ایک مزارع چھاؤڑے سے کھیت کی منظر نمیک کر رہا تھا تاکہ پانی باہر نہ نکل سکے۔ اس نے ٹایاب کو دیکھ کر سلام کیا۔

”چھوٹی بی بی۔ اتنی گرمی میں کہاں گھوم رہی ہیں۔“ مزارع نے کہا۔

”یونہی ذرا گھومنے کو نکل آئی تھی۔ یہ زمین کسی کی ہے؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”آپ ہی کی ہے جی۔“ مزارع نے جواب دیا۔ ”آپ کو اپنی زمینوں کا پوری طرح پتہ نہیں ہے جی۔ کئی مریض زمین ہے۔ ایک بات کہوں چھوٹی بی بی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر جواب کا انتظار کے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”جب آپ اپنا حصہ لیں تو دوسروں کی زمینیں لیں۔ یہ بہت اچھی زمین ہے۔“

ٹایاب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ چوہدریوں کا مزارع ہے۔ اس کی باتوں سے بھی ٹایاب کو اندازہ ہو گیا کہ چوہدریوں کے تمام مزارع ان سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ یقیناً یہی تھی کہ انہیں ناجائز طور پر تنگ کیا جاتا تھا۔ وہ چوہدریوں کے ظلم و ستم کا شکار تھے۔ جب سے انہیں پتہ چلا تھا کہ ٹایاب نے زمین کے بھارے کیلئے مقدمہ دائر کر رکھا ہے، ان میں سے بیشتر دہے لفظوں میں اور بعض کھل کر اس کی حمایت کرنے لگے تھے۔ وہ لوگ شاید یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ٹایاب زمین میں اپنا حصہ لے لے گی تو وہ لوگ بھی اس کے پاس آ جائیں گے۔

”وہ عمارت کسی ہے۔ وہاں کون رہتا ہے؟“ ٹایاب نے بے پر واقع اس عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ پرانی حویلی ہے چھوٹی بی بی۔“ مزارع نے جواب دیا۔ ”خالی پڑی ہے۔ سنا ہے

چوہدریوں کے خلاف بول رہے ہیں۔“

”سعادت نے ابھی تک جو کچھ بھی کیا ہے، ٹایاب کے خلاف ہی کیا ہے۔ جس روز اس نے گاؤں کے کسی ایک آدمی کے خلاف کوئی کارروائی کی، اس روز سب کی زبانیں پھر بند ہو جائیں گی۔“

”اب وہ کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔“ ٹایاب نے ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”گاؤں والے میری حمایت میں بول رہے ہیں، اگر سعادت نے کسی کے خلاف کچھ کیا تو میں بھی خاموش نہیں رہ سکوں گی۔ میں ہر قیمت پر گاؤں والوں کا ساتھ دوں گی۔“

”مجھے تو تمہاری ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔“ سیکندہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ”تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو پہلے ہی دن یہ گاؤں چھوڑ کر بھاگ چکا ہوتا مگر تم عورت ہو کر جس طرح ان چوہدریوں کے سامنے ڈٹ گئی وہ واقعی قابلِ داد ہے۔“

”اگر مجھے آپ لوگوں کا سارا نہ ملتا تو شاید میں بھی بھاگ ہی چکی ہوتی۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”دیے بھائی اب وہ وقت نہیں رہا کہ عورت خاموشی سے مرد کے مظالم سہتی رہے۔ عورت اگر بہت سے کام لے تو ظالم سے ظالم مرد کو بھی اپنے قدموں پر جھکا سکتی ہے۔“

”بھائی جان!“ ٹرگس نے سکندر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بوشیار ہو جائے۔ عورتوں کا اتحاد قائم ہو رہا ہے۔“

”اس معاملے میں تو میں بھی عورتوں کے ساتھ ہوں۔“ سکندر نے جواب دیا۔

”ڈر مئے۔“ ٹرگس نے قہقہہ لگایا اور پھر قہقہوں میں مہنگو ختم ہو گئی۔

رات کے کھانے کے بعد سکندر تو چوپال چلا گیا اور ٹایاب ٹرگس کے ساتھ گھر کے کام کرنے لگی۔

اس رات ٹایاب جلدی سو گئی اور صبح اس کی آنکھ بھی جلدی کھل گئی۔ سکندر اور ملک صاحب سب معمول کیتوں پر جا چکے تھے۔ ناشتہ کے بعد ٹایاب کچھ دیر تک تو سیکندہ اور ٹرگس کے ساتھ کام کرتی رہی، پھر اس نے کپڑے تبدیل کئے اور باہر جانے کیلئے تیار ہو گئی۔

نایاب مسکرا رہی تھی۔ حویلی کے بارے میں یہ باتیں اس کیلئے ایک دلچسپ انکشاف کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑی مزارع کی باتیں سنتی رہی پھر آگے چل پڑی۔ حویلی کے بارے میں اس کا تجسس بڑھ گیا تھا۔ وہ اسے اندر سے دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس مزارع کے سامنے وہ اس طرف جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ کھیتوں میں چلتی ہوئی دور نکل گئی اور پھر اسے ایک طویل پتھر کاٹ کر حویلی کے پچھلی طرف آنا پڑا تھا۔ چپکسی ہوئی دھوپ میں دور سے حویلی کی عمارت بہت پر اسرار لگ رہی تھی۔ نایاب کھیتوں میں پھونڈنڈی پر چلتی ہوئی حویلی کی طرف بڑھتی رہی۔ دیکھے اس نے اس مزارع کی باتوں پر بالکل یقین نہیں کیا تھا۔ وہ حویلی گاؤں سے تقریباً دو فرلانگ دور تھی۔ ہو سکتا ہے گاؤں سے دور ہونے کی وجہ سے چوہدری فیملی نے وہ حویلی چھوڑ دی ہو۔ وہ حویلی چونکہ پچاس ساٹھ سال سے خالی پڑی تھی اس لئے اس کے بارے میں ایسی باتیں مشہور ہو گئی تھیں۔ اگر ان باتوں میں کوئی حقیقت ہوتی تو ملک صاحب کے گھر والے اس کا کوئی تذکرہ ضرور کرتے۔

نایاب کھیتوں سے نکل کر درختوں کے نیچے آ گئی۔ گرمی سے اس کا برا حال ہو رہا تھا لیکن درختوں کے سامنے ہی اسے بڑا سکون ملا۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑی رہی اور پھر بے پرواہی سے چڑھنے لگی۔ حویلی کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ چھانک کی طرف آ گئی۔ حویلی کا چھانک بہت اونچا اور کشادہ تھا۔ میاں سے دو باغی پھلو بہ پھلو بڑی آسانی سے گزر سکتے تھے۔ چھانک کا ایک پٹ غائب تھا اور دوسرا پٹ دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ بہت موٹی کھڑکی کا اور مضبوط چھانک تھا جس پر خوبصورت مینا کاری کی گئی تھی۔ نایاب کچھ دیر تک اس چھانک کو دیکھتی رہی، پھر اندر داخل ہو گئی۔

دست و دھنیں صحن خود در بھانڈیوں سے پڑا تھا۔ میاں پر دھوپ کی چمک آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ نایاب کچھ دیر وہاں کھڑی رہی اور پھر بھانڈیوں سے بچتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ حویلی کی دیواریں بہت موٹی اور اونچی تھیں لیکن انہیں طرف والی دیوار کیسں کہیں سے ٹوٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ نایاب بھانڈیوں کے پرلی طرف سے حویلی کی عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ جب یہ عمارت تعمیر ہوئی ہوگی تو بہت شاندار رہی ہو گی۔ اس کی شان و شوکت کا اندازہ اب بھی ہو رہا تھا۔

وہ بھانڈیوں کے درمیان سے نکل کر وسیع و عریض برآمدے میں آ گئی اور ادھر ادھر

چوہدریوں کا خاندان پہلے اسی حویلی میں رہتا تھا۔ لیکن بڑے چوہدری کے باپ کے زمانے میں وہ لوگ یہ حویلی چھوڑ کر گاؤں میں آ گئے۔

”کیوں؟“ نایاب نے پوچھا۔

”بڑے چوہدری صاحب کے باپ کے زمانے میں اس حویلی میں ایک قتل ہو گیا تھا جی۔“ مزارع نے جواب دیا۔ ”وہ کوئی عورت تھی جی۔ سنا ہے اس کی روح اب بھی اسی حویلی میں رہتی ہے اور اس سے ڈر کر ہی چوہدری نے یہ حویلی چھوڑ دی تھی۔ اب یہ حویلی ویران پڑی ہے۔ کوئی اس طرف نہیں جاتا۔“

”تمہارا مطلب ہے جس عورت کو قتل کیا گیا تھا اس کی روح اب بھی اس حویلی میں رہتی ہے۔ کون تھی وہ عورت؟“ نایاب نے پوچھا۔

”پتہ نہیں جی۔ میں تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو معلوم ہے، وہ کون تھی۔ لیکن سنا ہے اس عورت کو بڑے چوہدری کے باپ نے قتل کیا تھا اور وہ خود بھی جبریتاً موت مرا تھا۔“ مزارع نے جواب دیا۔

”میں جا کر دیکھوں ذرا۔ کیسی ہے وہ حویلی؟“ نایاب بولی۔

”نالی بی جی۔“ مزارع جلدی سے بولا۔ ”آپ اس طرف مت جائیے۔ وہ دو آدمیوں کی جان لے چکی ہے جی۔“

”اوہ۔ کیا واقعی؟“ نایاب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں بی بی جی۔“ مزارع نے جواب دیا۔ ”سنا ہے جب وہ عورت اس حویلی میں قتل ہوئی تھی تو اس کے تین بیٹے بعد بڑے چوہدری کا بھائی، جس کی عمر اس وقت دس گیارہ سال تھی، حویلی کے ایک کمرے میں مردہ پایا گیا تھا جیسے اس کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔ جب اس کی لاش ملی تو حویلی میں کسی عورت کے قتلوں کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ اس کے دو بیٹے بعد اس گھر کی ایک لڑکی کی لاش بھی اسی حالت میں ملی تھی۔ ان دو واقعات سے ڈر کر ہی چوہدریوں نے وہ حویلی چھوڑ دی تھی اور پھر یہ تو میری آنکھوں کے سامنے کا واقعہ ہے۔ بڑے چوہدری کا منجھلا بیٹا چوہدری رفاقت اس حویلی میں چلا گیا تھا اور پھر اس کی بھی لاش ہی ملی تھی۔ بڑا لڑکپن جوان تھا جی۔ وہ۔۔۔ اس کے بعد تو لوگوں نے ڈر کے مارے اس حویلی کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ آپ بھی اس طرف مت جائیے چھوٹی بی بی۔“

آواز سے کھلا ہو اور پھر دھڑکی بگنی سی آواز سے بند ہو گیا ہو۔ اس نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن تمام دروازے بند تھے۔

نایاب مڑ کر آگے بڑھنے لگی اور پھر دائیں طرف ایک دروازے کے سامنے اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ اس نے دروازہ کھولنے کیلئے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ دروازہ چرچاہٹ کی بگنی سی آواز سے خود بخود کھل گیا۔ نایاب اچھل پڑی اور پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے قریب سے گزر کر کمرے سے باہر نکلا ہو۔ اس نے کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز بھی سنتی تھی اور اپنے ہاتھوں اور چہرے پر بگنی سی ہوا کا کراؤ بھی محسوس کیا تھا۔

نایاب کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے مڑ کر راباداری میں دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے اپنے پورے جسم میں چوہنیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک دروازے میں کھڑی رہی اور پھر اندر داخل ہو گئی۔

وہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ فرش پر کئی کئی انچ دھول جمی ہوئی تھی۔ عقی دیوار میں واقع روشن دان سے بہت مدد مہم سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ نیم تاریک ماحول بہت پر اسرار اثر دے رہا تھا۔ نایاب ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کمرے میں دائیں طرف ایک دروازہ دیکھ کر نایاب آگے بڑھ گئی۔

دروازہ بند تھا۔ نایاب نے ایک ہنٹ پر ہاتھ رکھا اور اسے آہستہ آہستہ مخالف سمت میں دبا دیا۔ دروازہ چرچاہٹ کی بگنی سی آواز سے کھلتا چلا گیا۔ نیک ہی لمحہ عقب سے ایک آواز سن کر نایاب اچھل پڑی۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا لیکن کوئی نہیں تھا۔ البتہ وہ آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہماری قدموں کی آواز تھی۔ لگتا تھا جیسے کوئی آدھی راباداری میں چل رہا ہو۔

نایاب کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا۔ شاید کسی نے اسے حویلی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ چوہدری سعادت کا آوی ہو اور اس نے سعادت کو اطلاع دیدی ہو۔ سعادت اس کی جان کا دشمن تھا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھانے کیلئے حویلی میں آ گیا تھا۔ وہ اسے قتل بھی کر سکتا تھا یا کوئی اور ناقابلِ غمانی انسان پھانسا سکتا تھا۔ اگر وہ اسے قتل کر کے یہاں پھینک جائے تو کسی کو اس کی لاش

دیکھنے لگی۔ برآمدے کے کمرابی دروازے پر بھی خوبصورت مینا کاری تھی۔ نایاب کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی، پھر اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ آہستہ مخالف سمت میں دھکیلنے لگی۔ دروازہ چرچاہٹ کی بگنی سی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ یہ دروازہ دوسرے ہنٹ کا تھا۔ نایاب نے ایک ہنٹ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تھا لیکن دوسرا ہنٹ بھی خود بخود کھلتا چلا گیا تھا لیکن نایاب نے شاید خیال نہیں کیا تھا۔ وہ چند لمحوں کو رکے، پھر اندر داخل ہو گئی۔ یہ ایک کشادہ راباداری تھی۔ فرش پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ وہ تین قدم چلنے کے بعد وہ ٹھنڈک کر رک گئی۔ اس نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دروازہ چرچاہٹ کی بگنی سی آواز کے ساتھ بند ہو گیا تھا۔ نایاب نے اگرچہ مزارع کی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا لیکن اس دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور دروازہ بند ہوا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا لیکن اس نے یہی سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ دروازہ شاید ہوا سے بند ہو گیا تھا۔ وہ مڑ کر واپس آگئی اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی لیکن دروازہ نہیں کھلے دیتے تھی۔ لیکن دروازہ اس سے مس نہیں ہوا۔

نایاب کے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش ترک کر دی اور مڑ کر راباداری میں دیکھنے لگی۔ کھڑکی کے دروازے کے اوپر روشن دان تھا۔ جس سے ٹھوڑی روشنی اندر آ رہی تھی لیکن وہ روشنی راباداری کی تاریکی دور کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔

نایاب چند لمحوں وہاں کھڑی رہی، پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اب وہ دل میں ہلکا سا خوف محسوس کرنے لگی تھی۔

اس راباداری کو ہی دیکھ کر نایاب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ حویلی اندر سے بہت بڑی تھی۔ تقریباً پندرہ گز آگے یہ راباداری دائیں بائیں کی ایک اور کشادہ راباداری میں مڑ گئی تھی۔ نایاب وہاں ایک سینکڑوں رکی اور پھر بائیں طرف مڑ گئی۔

چند گز آگے دائیں طرف ایک اور راباداری تھی۔ نایاب اس طرف مڑی ہی تھی کہ ٹھنڈک کر رک گئی۔ اس کے کانوں میں ایسی آواز سنائی دی تھی جیسے کوئی دروازہ چرچاہٹ کی

ایک لاش پڑی تھی۔ ایک عورت کی لاش۔ جس کے سینے میں خنجر پیوست تھا اور خون بکھرا ہوا تھا۔ لاش کے نیچے ہلکے پر بچھا ہوا سفید کھس بھی خون میں تر ہو رہا تھا۔

ٹایاب دروازے کے قریب کھڑی پہلی پہلی سی نظروں سے اس لاش کو دیکھنے لگی۔ اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی ہلکے کے قریب آگئی۔ کمرے کا ماحول نیم تاریک ہونے کے باوجود اسے لاش اور کمرے میں پڑی ہوئی کچھ اور چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

وہ کسی جوان عورت کی لاش تھی۔ ٹایاب کے اندازے کے مطابق اس کی عمر بیچیس اور تیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں جن میں خوف جیسے منجھد ہو کر رہ گیا تھا۔ ٹایاب ڈرتے ڈرتے ہلکے کے کچھ اور قریب آگئی اور جھک کر لاش کو دیکھنے لگی۔ اس کے جسم پر بجا بجا زخم تھے جیسے خنجر سے بے در پے وار کئے گئے ہوں اور آخر میں خنجر گھیر دل کے مقام پر سینے میں گھونپ دیا گیا ہو۔ ٹایاب کو یوں محسوس ہوا جیسے زخموں سے خون اب بھی رس رہا ہو۔ اس نے جھک کر سینے پر رتنے والے خون کو اٹھائی سے چھو کر دیکھا۔ گرم گرم خون تھا۔ ٹایاب ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔ ٹایاب کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس عورت کو کچھ دیر پہلے ہی قتل کیا گیا تھا۔

دھننا "اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ جب اس نے بیرونی کمرے کا راہداری والا دروازہ کھولا تھا تو اسے یوں لگتا جیسے کوئی اس کے قریب سے گزرا ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا بھی تھا لیکن کوئی اسے نظر نہیں آیا تھا اور اب اسے خیال آ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے قریب سے گزرنے والا بڑی جگت میں سامنے والے کمرے کے دروازے میں گھس گیا ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھا وہی اس عورت کا قاتل ہو سکتا ہے اور وہ حویلی سے فرار نہیں ہوا تھا۔ بعد میں راہداری میں قدموں کی آواز اسی کی تھی اور اس نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ ٹایاب اس سے چھپنے کیلئے اس کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اس شخص نے باہر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

ٹایاب متحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ گرد آلود فرش پر ایسے نشان واضح

بھی نہیں ملے گی۔ ٹایاب بزدل نہیں تھی لیکن بجا ہمدردی کا مظاہرہ بھی خود کشی کے مترادف تھا۔ ہو سکتا ہے چہرہ پر سعادت اکیلانہ ہو۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہو۔ وہ ایک دو آدمیوں کا مقابلہ تو کر سکتی تھی لیکن آدمی اگر زیادہ ہوتے تو اس دیران حویلی سے باہر اس کی چپیں بھی کسی کو سنائی نہیں دیں گی۔

اس کے کانوں سے قدموں کی آواز اب بھی ٹکرا رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اندرونی کمرہ میں ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ چھپ سکتی تھی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس دروازے کے دوسری طرف کیا ہے۔

قدموں کی آواز قریب آگئی تھی۔ ٹایاب نے باہر والے دروازے کی طرف دیکھا اور مڑ کر تیزی سے اندرونی دروازے میں داخل ہو گئی۔ ٹھیک اسی لمحہ باہر سے کسی اور دروازے کے کھٹکنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

ٹایاب دروازے کے بھڑے ہوئے پٹ کے پیچھے کھڑی ہو کر بیرونی دروازے کی طرف جھانکنے لگی۔ قدموں کی آواز بیرونی دروازے کے قریب آکر رک گئی تھی۔ ٹایاب دروازے کے پٹ سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ چپک گئی۔ اس کمرے میں اتنی کمری تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ دیوار جس سے وہ ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی تھی برف کی طرح ٹھنڈی تھی۔ اس کی کمر ٹھنڈی جا رہی تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تاریکی میں گھورتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کمرے میں کیا ہو سکتا تھا پھر اچانک ہی کمرے کی تاریکی چھٹنے لگی۔ غیر محسوس انداز میں کمرے میں روشنی بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں خشکی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ٹایاب کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ برف خانے میں آگئی ہو۔ وہ آنکھیں بند کئے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی رہی اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو کمرے میں اتنی روشنی اور ہلکی جھمکی تھی کہ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لے سکتی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی رہی اور پھر وہ جیسے ہی بائیں طرف مڑی، اس کی آنکھیں خوف و ہشت سے پھیل گئیں اور منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف پھلی لیکن دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ ٹایاب چپٹے ہوئے دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی لیکن دروازہ جیسے جام ہو کر رہ گیا تھا۔ ٹایاب نے بڑی مشکل سے بیچیں روکیں اور آہستہ آہستہ مڑ کر پیچھے دیکھنے لگی۔ کمرے میں بائیں دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے ہلکے پر

”و۔۔۔“

سرگوشی ڈوب گئی اور کمرہ نسوانی چیخوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ لگتا تھا جیسے کسی عورت کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ غیاب بھی خوفزدہ ہو کر چپ اٹھی۔ نسوانی چیخوں کی آواز میں اسے چرچاہٹ کی آواز سنائی دی جیسے کوئی دروازہ کھلا ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا کرے کا دروازہ چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ غیاب نے ایک نظر لاش کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف دوڑی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ پوری طرح کھول دیا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ دوسرے کمرے سے نکل کر وہ راپداری میں دوڑنے لگی۔ اس نے دوڑتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا جیسے چیخوں کی وہ آوازیں اس کا تعاقب کر رہی ہوں۔

وہ دوڑتی ہوئی بیرونی دروازے کے قریب پہنچی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ یہ دروازہ اس وقت بند ہو گیا تھا جب وہ اندر داخل ہوئی تھی اور اس وقت بھی بند تھا۔ غیاب متوحش نظروں سے نیم آدیک راپداری میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ چیخوں کی آوازیں اب چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور پھر دھتّا۔ ”وہ چونک گئی۔ دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور چھلاک لگا کر باہر آگئی۔ اس کے فوراً ہی بند دروازہ دھڑکی آواز سے بند ہو گیا۔

غیاب بدحواسی میں لوٹھا کر برآمدے میں گر گئی۔ یہ کیفیت تھا کہ اسے کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔ وہ اندر سے آئی تھی اور باہر دھوپ کی چمک میں اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند سیکنڈ گزر گئے اور پھر دھتّا۔ ”اسے سنانے کا احساس ہوا۔ چیخوں کی آوازیں اب سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگی۔ دروازہ بند تھا اور اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ تیز دھوپ میں آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔ وہ چند لمبے آنکھیں پٹ پٹاتی رہی اور اٹھ کر برآمدے سے نیچے آگئی اور پھر بھاڑیوں میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی حویلی کے چھانک کی طرف چلنے لگی۔ چھانک سے باہر آکر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دور دور تک کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ بے سے اتر کر کھیتوں میں گڈنڈی پر دوڑنے لگی۔

طور پر نظر آ رہے تھے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہاں اچھی خاصی دھینگا مٹتی ہوئی ہوگی۔ ممکن ہے اس عورت نے اپنے آپ کو پچانے کیلئے بھرپور مزاحمت کی ہو۔

”میرا نام ہاجرہ ہے۔“

ایک سرسراتی ہوئی سی سرگوشی غیاب کی سماعت سے نکل آئی۔ وہ خوفزدہ ہو کر اچھل پڑی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ لاش کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے اچانک ہی یہ خیال آیا کہ شاید وہ عورت ابھی زندہ ہے اور اسے کچھ بتانا چاہتی ہے۔ اس نے جبکہ کر غور سے عورت کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں دیسے ہی پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور دانت سختی سے بچنے ہوئے تھے۔

”میں اس گاؤں کے موچی نور دین کی بیٹی ہوں۔“

وہ سرسراتی ہوئی سی سرگوشی پھر سنائی دی۔ غیاب ایک بار پھر اچھل پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ لاش کی طرف مڑ گئی۔ لاش کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہونٹ بھی اسی طرح بچنے ہوئے تھے اور آنکھیں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔

”وہ مجھے دھوکے سے لے کر یہاں آیا تھا۔“ وہی سرگوشی غیاب کی سماعت سے نکلائی۔ ”میری ماں حویلی میں کام کرتی تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ میری ماں سیڑھیوں سے گر گئی ہے اور اس نے مجھے بلایا ہے۔ میں اس وقت کھیت میں سرسوں کا ساگ چن رہی تھی۔ میں اس کے کہنے پر حویلی آگئی لیکن یہاں پہنچ کر پہنچ چلا کہ حویلی میں کوئی نہیں ہے۔ اس کے گھر والے نور پور گئے ہوئے ہیں اور میری ماں بھی شاید ان کے ساتھ گئی تھی۔ میں نے واپس جانا چاہا مگر اس نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ دست درازی کرتا رہا اور میں اپنے آپ کو پچانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں چپ رہی تھی لیکن میری پکڑ پکڑنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ مجھے اس کمرے میں لے آیا۔ میں مزاحمت کرتی رہی لیکن اس کے قہقہے میں آگئی۔ وہ اپنی ہوس پوری کر کے باہر جانے لگا تو مجھے اسے ملا لیا۔ میں رکھا ہوا خنجر نظر آگیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر خنجر اٹھا لیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ میرے وار سے اس کا کندھا زخمی ہو گیا لیکن اس نے مجھ سے خنجر چھین لیا اور پے در پے مجھ پر وار کرنے لگا۔ میں چیختی رہی لیکن کوئی میری مدد کو نہیں آیا۔“

”وہ کون تھا؟“ غیاب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کا مقابلہ کوئی نہیں تھا۔

ملک صاحب۔ رسول بخش نے بتایا کہ ملک صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور سکندر انہیں لے کر گاؤں چلا گیا تھا۔

نایاب تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلے گی۔ تیز اور چھلپاتی دھوپ میں اس کا دماغ چلایا ہو رہا تھا۔ وہ پیسے میں شرابور ہو رہی تھی لیکن رکے بغیر چلتی رہی۔ اب اسے یہ پریشانی بھی ہو رہی تھی کہ ملک صاحب کو کیا ہو گیا تھا؟

گاؤں پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ جب وہ چوہلی میں داخل ہوئی تو وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ نایاب کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

ملک صاحب بہتر پر پڑے ہوئے تھے۔ سکندر کے علاوہ کینڈہ، زرمس اور عذرہ بھی موجود تھیں۔ دو عورتیں اور دو آدمی بھی تھے۔ ان میں ایک گاؤں کا ڈاکٹر تھا جو چنگ کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کیا ہوا اگل کو۔ کیا ہو گیا انہیں۔“ نایاب آگے بڑھتی ہوئی پوچھی۔

”غیر ہے بن۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈیرے پر کام کرتے ہوئے اچانک ہی سینے میں درد اٹھا تھا۔ میں انہیں گھر لے آیا۔ یہ اپنے ڈاکٹر صاحب ہیں۔ انہوں نے انجکشن لگا دیا ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔“

سینے میں درد سے نایاب کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ دل کا ہے۔ وہ ملک صاحب کی طرف دیکھنے لگی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر کرب کے تاثرات تھے لیکن کچھ ہی دیر بعد ان کا چہرے پر سکون ہوتا چلا گیا۔ چنگ کے قریب کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈاکٹر نے ایک بار پھر انہیں دیکھا اور سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب پریشانی کی کوئی بات نہیں ملک بی! میں نے انجکشن لگا دیا ہے۔ ابھی دوا بھجوا دوں گا لیکن ایک بات کا خیال رکھئے۔ انہیں اب مکمل آرام کی ضرورت ہے لیکن کل صبح آپ انہیں فور پر ضرور لے جائیے۔ ڈاکٹر رشی کو دکھا دیتے۔ ان معاملات میں لاپرواہی خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔“

”میں انہیں صبح سویرے ہی ڈاکٹر رشی کے پاس لے جاؤں گا۔“ سکندر نے کہا۔ پھر قریب کمرے ہوئے دوسرے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اوسے شہرے تم ڈاکٹر

اس کا سانس پھول گیا۔ بہت دور جا کر وہ ایک درخت کے نیچے رک گئی۔ وہ پیسے میں شرابور ہو رہی تھی۔ اپنے بے ربط تنہا پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تیز چھلپاتی ہوئی دھوپ میں چوہلی ایک بیولے کی طرح نظر آ رہی تھی۔

نایاب بہت دیر بعد اپنے حواس پر قابو پا سکی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر درخت کے نیچے کھڑی گھرے گھرے سانس لیتی رہی۔ ٹھنڈی ہوا کا بڑا خوشگوار اثر ہوا تھا۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ ایک بار پھر اس پر اسرار چوہلی کی طرف دیکھنے لگی۔ چھلپاتی تیز دھوپ سے یوں لگ رہا تھا جیسے چوہلی کے چاروں طرف لاؤ سے دھبہ رہے ہوں۔ لہجیسی اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

چوہلی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ عورت کون تھی جسے چوہلی میں قتل کر دیا گیا تھا اور قتل کی یہ واردات اس کے وہاں پہنچنے سے چند منٹ پہلے ہی ہوئی تھی۔ اس نے راہداری میں قدموں کی آواز ضرور سنی تھی لیکن کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ نایاب سوچ رہی تھی کہ قاتل کون ہو سکتا تھا اور وہ عورت کون تھی؟ اسے گاؤں میں آنے کو کئی روز ہو چکے تھے۔ گاؤں کی سب ہی عورتیں اس سے مل چکی تھیں اور تقریباً سب ہی کو وہ پہچانتی بھی تھی لیکن اس عورت کا چہرہ اس کیلئے بالکل اجنبی تھا۔

اور پھر وہ پر اسرار سرگوشیاں! پہلے تو وہ یہ سمجھی تھی کہ وہ عورت زندہ ہے لیکن وہ واقعی ختم ہو چکی تھی اور وہ پر اسرار سرگوشیاں اسے سنائی دے رہی تھیں۔ ان سرگوشیوں سے یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ اس کا نام ہاجرہ تھا اور وہ گاؤں کے موج کی بیٹی تھی جسے دھوکے سے اس چوہلی میں لا کر اس کی آبروریزی کرنے کے بعد اسے قتل کر دیا گیا تھا لیکن قاتل کون تھا؟ یہ بات ان خوفناک چیزوں کی وجہ سے راز ہی رہ گئی تھی۔

نایاب کا خیال تھا کہ گاؤں والوں کو اس قتل کی اطلاع دینی چاہئے تاکہ پتہ چل سکے کہ ہاجرہ کا قاتل کون ہے؟ یہ سوچ کر وہ کھیتوں میں چمڈھنڈی پر تیزی سے چلے گئی۔

اچانک ہی اسے ایک اور خیال آگیا۔ سب سے پہلے سکندر کو بتانا چاہئے۔ وہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر وہ ایک اور چمڈھنڈی پر چڑھی۔ ملک صاحب کا ڈیرہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ چند منٹ میں وہاں پہنچ گئی۔ لیکن نہ تو سکندر ڈیرے پر موجود تھا اور نہ ہی

”دل کی تکلیف بڑی خطرناک ہوتی ہے سکندر بھائی!“ ٹایاب نے کہا۔ ”اب آپ اگلے کو بالکل کوئی کام نہ کرنے دیں۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”میں نے تو کئی مرتبہ کہا ہے کہ آرام سے گھر بیٹھے رہا کریں لیکن اباجی مانتے ہی نہیں۔“

ٹایاب نے مزید کوئی بات نہیں پوچھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ سکندر کو پرانی حویلی میں اس عورت کے قتل کے بارے میں بتائے یا نہیں، پھر اس نے فی الحال خاموش رہتا ہی بہتر سمجھا۔ یہ لوگ خود اپنی پریشانی میں تھے۔ وہ اس لاش کا قصہ سن کر انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کچھ سکون ہو جائے تو بات کرے گی۔ ویسے بھی اس وقت گھر میں بہت سی عورتیں جمع تھیں۔

اس وقت دوسرے دو بچ رہے تھے۔ اس گھڑی کی وجہ سے ابھی تک کھانا کسی نے نہیں کھایا تھا۔ ٹایاب کو بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی لیکن وہ کھانا مانگتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ مگر کچھ دیر بعد جب سکندر نے اسے باورچی خانے میں بلایا تو اس کی جان میں جان آئی۔

”جہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ یہیں بیٹھ کر کھانا کھا لو۔ میں عذرہ اور نرمس کو بھی یہیں بھیج دیتی ہوں۔“ سکندر نے کہا۔

”آپ بھی تو کھا لیجئے بھائی۔“ ٹایاب نے کہا۔

”تم لوگ کھالو میں بعد میں کھا لوں گی۔“ سکندر کہتے ہوئے باہر چلی گئی۔ چند منٹ بعد نرمس اور عذرہ بھی آئیں۔ باورچی خانہ خاصا کشادہ تھا۔ وہ تینوں بیڑھیوں پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگیں۔

ان کے بعد سکندر اور سکندر نے بھی کچن ہی میں بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ عذرہ، ملک صاحب کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ نرمس اور سکندر کام کاج میں مصروف ہو گئیں اور ٹایاب برآمدے میں سکندر کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔

”سکندر بھائی۔ میں اس وقت ایک عجیب سی صورتحال سے دوچار ہوں۔ میری کچھ باتیں آپ کو بھی اس وقت اس قسم کی کوئی بات کرنی چاہیے یا نہیں۔“ ٹایاب نے سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔

صاحب کے ساتھ جاؤ اور دوا لے آؤ۔ استعمال کا طریقہ بھی لکھ لینا اچھی طرح۔“

”چھاجی۔“ شیرے نے جواب دیا۔

ڈاکٹر چلا گیا۔ ٹایاب نے سکندر اور نرمس وغیرہ کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں۔ وہ ملک صاحب کی طرف دیکھتے تھے۔ اب انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

”اب کسی طبیعت ہے اباجی؟“ سکندر نے آگے جھک کر پوچھا۔

”ٹھیک ہوں بیٹا۔“ ملک صاحب نے جواب دیا۔ ان کی آواز بے حد کمزور تھی۔ ”کیا ہوا تھا۔ یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں؟“

”کچھ نہیں اباجی۔ آپ کی طبیعت خراب ہونے کا سن کر یہ لوگ آ گئے ہیں۔“ سکندر نے کہا۔ پھر سکندر وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جاؤ تم لوگ اپنا کام کرو۔ اور ان سب لوگوں کو بھی بھیج دو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اباجی اب ٹھیک ہیں۔“

سکندر اور نرمس تو باہر نکل گئیں مگر عذرہ وہیں کھڑی رہی۔ ٹایاب بھی ڈاکٹر والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ملک صاحب نے اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ملک صاحب شاید سو گئے تھے۔ سکندر اور ٹایاب کمرے سے باہر آ گئے۔ عذرہ وہیں بیٹھی رہی۔ معن میں اب بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ وہ سکندر سے ملک صاحب کے بارے میں پوچھنے لگے۔ سکندر ان سب کو تسلی دے رہا تھا۔

ٹایاب اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ ملک صاحب کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو گاؤں کے لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ یہ ملک صاحب کا حسن اخلاق تھا۔ انہوں نے سب سے محبت کا سلوک کیا تھا اور انہیں ذرا سی تکلیف ہوئی تھی تو لوگ تڑپ اٹھتے تھے۔

ٹایاب نے سکندر سے پوچھا تو اس نے کہا۔

”بیٹھے بیٹھے اچانک ہی سینے میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ وہ تو کمر آنے پر تیار نہیں تھے۔ میں زبردستی لے آیا اور ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر سیانا آوی ہے۔ وہ فوراً ہی کچھ گیا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر دیر ہو جاتی تو معاملہ بگڑ سکتا تھا۔“

”کیا اگلے کو پہلے بھی کسی ایسی تکلیف ہوئی تھی؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”نہیں۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔“ سکندر نے جواب دیا۔

”اس نے یہی نام بتایا تھا۔“ ٹایاب بولی۔

”لاش نے؟“ سکندر بولا۔

”نہیں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”جب میں اس لاش کے قریب کمزی تھی تو کوئی نساوانی آواز سرگوشیوں میں مجھے بتا رہی تھی کہ میرا نام باجرہ ہے۔ وہ مجھے دھوکے سے حویلی میں لے کر آیا تھا۔ میں اپنے چہرے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ اپنے گھٹاؤ نے مقدمہ میں کامیاب ہو گیا۔ میں بیچتی رہی لیکن میری مدد کو نہیں آیا۔ مجھے طاہرے میں رکھا ہوا خنجر مل گیا۔ میں نے خنجر سے اس پر وار کیا۔ اس کا کندھا زخمی ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر مجھ سے خنجر چھین لیا اور مجھ پر پے در پے حملے کرنے لگا۔“ ٹایاب چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ کھیت میں سرسوں کا ساگ توڑ رہی تھی کہ اس نے آکر کہا کہ میری ماں بیڑیوں سے گر پڑی ہے اور مجھے بلایا ہے۔ میں اس کے ساتھ حویلی میں آ گئی اور تب مجھے پتہ چلا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ اس کے گھر والے نور پور گئے ہوئے تھے اور میری ماں بھی ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔“

”ٹایاب۔“ سکندر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو تم مجھے سزا سی سال پرانی کہانی سنا رہی ہو اور اس کے باوجود تم۔“

”سکندر بھائی۔“ ٹایاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”نہ تو مجھے کوئی دہم ہوا ہے اور نہ ہی کوئی خراب دیکھا ہے۔ جب میں حویلی میں تھی تو کچھ پر اسرار باتیں ضرور ہوئی تھیں لیکن وہ لاش میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور اس کے جسم سے بننے والے خون کو چھو کر دیکھا تھا۔ گرم گرم اور تازہ خون۔“

”کیا نام بتایا تھا تم نے۔ باجرہ اور نور دین موہی؟“ سکندر بولا۔

”جی ہاں۔“ یہی نام بتائے تھے۔“ ٹایاب نے کہا۔

”ہمارے گاؤں میں دو موہی ہیں۔ ایک کا نام حسین بخش اور دوسرے کا غلام محمد گانا۔ نور دین گاسے کا دادا تھا اور باجرہ اس کی بیٹی۔ ان دونوں کو مرے ہوئے سزا سی سال ہو چکے ہیں۔ یہ حتم ہے کہانی سنا ہے نا یہ۔ جی ہی پرانی ہے۔ ہمیں شاید ابھی تک اس پرانی حویلی کے بارے میں کسی نے کچھ بتایا نہیں۔“

”مجھے تھوڑا بہت آج ہی معلوم ہوا ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”میرے سرچوہدری

”کوئی خاص بات ہے۔“ سکندر نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”میں آج کھیتوں میں گھومتی ہوئی بیٹے والی پرانی حویلی کی

طرف چلی گئی تھی۔“

سکندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ تو آسیب زدہ حویلی ہے۔ ہمیں کسی نے

اس طرف جاتے ہوئے روکا نہیں؟“

”کھیتوں میں کام کرنے والے ایک مزارع نے مجھے اس طرف جانے سے منع کیا تھا

لیکن تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں حویلی کے اندر چلی گئی۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔

”تمہارا یہ تجسّس کسی روز ہمیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔“ سکندر بولا۔

”آئندہ اس حویلی کی طرف مت جانا۔ عرصہ سے دیران پڑی ہے۔ وہاں آبیوں نے ڈیرہ

بمبار رکھا ہے۔ گاؤں کے لوگ تو اس کے قریب بھی نہیں جاتے۔“

”میں حویلی کے اندر گھومی ہوں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”مجھے وہاں کوئی آسیب نظر نہیں

آیا۔ البتہ۔۔۔ وہ کتے کتے رک گئی۔“

”البتہ کیا؟“ سکندر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔

”کیا۔؟“ سکندر اچھل پڑا۔

”کسی نے ایک عورت کو حویلی میں لے جا کر قتل کر دیا ہے۔ میں نے اس کی لاش

اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ بلکہ اس سے بننے والے خون کو بھی چھو کر دیکھا تھا۔ میرا

خیال ہے میرے وہاں جانے سے چند منٹ پہلے کسی نے اسے قتل کیا تھا۔“ ٹایاب نے کہا۔

”تم دھوپ میں پھرتی رہی ہو۔ میرا خیال ہے تمہارے دماغ پر گرمی کا اثر ہو گیا ہے۔

جاؤ گئے کے نیچے بیٹھ کر سر پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔“ سکندر نے کہا۔

”میرے دماغ پر گرمی کا اثر نہیں ہوا سکندر بھائی!“ ٹایاب نے کہا۔ ”میں نے اپنی

آنکھوں سے اس لاش کو دیکھا ہے۔ اس عورت کا نام باجرہ تھا۔ وہ گاؤں کے موہی نور دین

کی بیٹی ہے۔ آپ میرے ساتھ چل کر لاش تو دیکھ لیں پھر پولیس کو اطلاع دی جائے۔“

”باجرہ۔ نور دین موہی۔“ سکندر ہیرا کر رہ گیا۔ ”یہ تم کیسے کہہ رہی ہو؟“ وہ ابھی

ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

گھاٹ اُتار دیا۔ باجرہ کی روح اب بھی حویلی میں بھٹک رہی ہے۔ وہ چوہدری صداقت کے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کو موت کے گھاٹ اُتار چکی ہے لیکن شاید اس کا انتقام پورا نہیں ہوا۔ اس حویلی کی طرف کوئی نہیں جاتا۔ تم نے حویلی میں جو لاش دیکھی تھی وہ لاش نہیں تھی۔ بلکہ۔۔۔

”نہیں سکندر بھائی۔“ ٹایاب نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ لاش ہی تھی۔ آپ یقین کیجئے وہ لاش تھی۔ آپ خود میرے ساتھ چل کر دیکھ لیجئے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں تاکہ تمہاری تسلی ہو جائے لیکن پہلے میں ابا جان کو دیکھ لوں۔“

”بارج بھی لے لیجئے۔ حویلی کے اندر بہت اندھیرا ہے۔ ٹایاب نے کہا۔

سکندر ملک صاحب کے کمرے میں آ گیا۔ وہ سو رہے تھے۔ سکندر چند لمحے کھڑا باپ کے چہرے کو دیکھتا رہا، پھر اس کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں گھر گیا۔

”کیکنہ۔“ اس نے چند منٹ بعد باہر آ کر کہا۔ ”میں ٹایاب کے ساتھ جا رہا ہوں۔ خداخواستہ ابا جان کو کوئی تکلیف ہو تو فوراً ڈاکٹر کو بلا لیتا۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟ جلدی آ جائے گا۔“ کیکنہ نے کہا۔

”دورا پرانی حویلی تک جا رہا ہوں۔“ سکندر نے جواب دیا۔ ”آج ٹایاب وہاں چلی گئی تھی۔ کبھی ہے اس نے وہاں کسی عورت کی لاش دیکھی ہے، جسے کچھ دیر پہلے قتل کیا گیا ہے۔ میں ذرا اس کی تسلی کراؤں کہ اسے دہم ہو گیا ہے۔“

”آپ کو معلوم ہے وہ حویلی آسیب زدہ ہے۔“ کیکنہ نے کہا۔ ”اگر آپ دونوں میں سے کسی کو کچھ ہو گیا تو؟“

”اوپر کچھ نہیں ہوتا۔“ سکندر نے کہا۔ ”مگر کونسا بھوتوں کا شکار کیجئے جا رہے ہیں۔ جلد آ جائیں گے۔“

پرانی حویلی گاؤں سے کافی دور تھی۔ انہیں وہاں پہنچنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ تیز اور چالچالاتی دھوپ میں چلتے ہوئے ٹایاب کا دماغ چلپٹا ہو گیا تھا۔ سکندر کا کرتا بھی پیسے سے تر ہو کر اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ وہ اپنے پر پہنچ کر درختوں کے نیچے رک گئے۔

امانت علی کے باپ کی جوانی کے دور میں اس حویلی میں کسی عورت کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس عورت کی روح نے انتقام لینے کیلئے پہلے اس کے بیٹے اور پھر بیٹی کو مار ڈالا اور اس کے بعد وہ لوگ حویلی خالی کر کے گاؤں میں منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ حویلی ویران ہو گئی اور وہاں بھوت پریت نے ڈیرے بنالے۔ یہی کہانی تھی؟“

”ہاں۔“ سکندر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”لیکن تمہیں شاید یہ نہیں بتایا گیا کہ حویلی میں قتل ہونے والی عورت نور دین سوہی کی جوان بیٹی باجرہ تھی۔ اس کی موت کے اگلے ہی روز نور دین سوہی نے بھی گلے میں پھندہ ڈال کر خودکشی کر لی۔ وہ غیرت مند آدمی تھا اور اس ذات و رسوائی کو برواشت نہیں کر سکا تھا۔“

”اس لڑکی کو قتل کس نے کیا تھا؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”سننے میں تو یہی آیا ہے کہ چوہدری امانت علی کا باپ چوہدری صداقت علی اس لڑکی کو دھوکے سے حویلی میں لے گیا تھا اور اس کی آہود ریزی کرنے کے بعد اسے قتل کر دیا تھا۔ لیکن یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ چوہدری صداقت نے اس الزام گومانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس روز حویلی میں نہیں تھا۔ اس کے دو تین مزارعوں نے اگرچہ یہ گواہی دی تھی کہ چوہدری اس روز سارا دن ڈیرے پر رہا تھا لیکن کسی نے یہ بات نہیں مانی اور چوہدری کو مورد الزام ٹھہراتے رہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”سنا ہے باجرہ بڑی سوہنی لڑکی تھی۔ وہ اس گاؤں ہی کی نہیں بلکہ پورے علاقے میں سب سے زیادہ حسین تھی۔ وہ تھی تو سوہی کی بیٹی مگر باجرہ کیلئے بڑے بڑے زمینداروں کے گھروں سے رشتے کے پیغام آ رہے تھے۔ مگر نور دین کسی بڑے گھرمیں بیٹی کا رشتہ کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اسے اپنی اوقات کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ محض باجرہ کے حسن کی وجہ سے اس کیلئے بڑے گھروں سے رشتے آ رہے ہیں۔ شادی کے بعد بھی اس کی عزت نہیں ہوگی۔ وہ اپنی برادری میں رشتہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی ایسا لڑکا نہیں تھا جس کے دامن سے وہ اپنی بیٹی کا دل باندھ سکتا۔ بالا خرچ پور میں ایک لڑکے سے اس کا رشتہ ملے ہو گیا۔ وہ شادی کے انتظامات کر رہا تھا کہ اس دوران یہ واقعہ پیش آ گیا۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ چوہدری صداقت بھی باجرہ پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ اس سے شادی تو نہیں کر سکتا تھا البتہ موقع ملے ہی اس نے اپنی ہوس پوری کر لی اور باجرہ کو موت کے

میاں بھی صرف اسی کے قدموں کے نشان تھے۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی اور بالا تر وہ اس دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ سکندر تارچ کی روشنی میں دروازے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹایاب نے دروازہ کھولنے کیلئے جیسے ہی ہاتھ آگے بڑھایا وہ دونوں اچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ دروازہ ہلکی سی چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ خود بخود کھل گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی رخ بڑھتی ٹھنڈی ہوا کا جھوکا ان سے ٹکرایا۔ ٹایاب اور سکندر ایک لمحوہ کو کلاپ اٹھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ٹایاب اندر داخل ہو گئی۔ پہلی مرتبہ جب وہ میاں آئی تھی تو خاصی خوفزدہ تھی لیکن اس وقت سکندر کا ساتھ ہونے کی وجہ سے اس کا خوف بڑی حد تک کم ہو گیا تھا۔

"اوجھ" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہتے ہوئے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ لاش اس کمرے میں ہے۔"

سکندر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے روشنی ڈالتے ہوئے ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ کھول دیا اور مڑ کر ٹایاب کی طرف دیکھنے لگا۔ ٹایاب اتنے کاچھو پکڑ کر اس کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہو گئی۔

کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ سکندر تارچ کی روشنی ادھر ادھر ڈال رہا تھا۔ تارچ کی روشنی کے ساتھ ساتھ ٹایاب کے دیدے بھی گھوم رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔

کہو خالی تھا۔ نہ وہاں پتنگ تھا نہ اس عورت کی لاش۔ ٹایاب کو سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے تارچ سکندر کے ہاتھ سے لے لی اور خود اس کی روشنی ادھر ادھر ڈالتے لگی مگر کمرے کے گرد آلود فرش پر اس کے اپنے جوتوں کے نشانات کے علاوہ ایک تنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ٹایاب کے دماغ میں تیز سنسنیات ہی ہونے لگی۔ پورے جسم پر چوینٹیاں سی رہ گئیں۔ ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ پہنی پہنی سی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سکندر سے کچھ کم سنائی چاہتی تھی کہ کمرہ ایک دم نسوانی چوینٹوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ جیسے کسی عورت کو ذرا کیا جا رہا ہو۔ وہ دونوں اچھل پڑے۔ سکندر نے ٹایاب کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گیا۔

ٹایاب ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ دور کیمڑوں میں کسان کام کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن حویلی کے قریب وجوہ میں کوئی نہیں تھا۔ وہ تقریباً دس منٹ درخت کے نیچے کھڑے رہے پھر حویلی کے چمکاک میں داخل ہو گئے۔

وہ جھانپوں سے بچ کر چلتے ہوئے برآمدے میں آگئے۔ میاں پہنچ کر ٹایاب کے دل کی دھڑکن خود بخود تیز ہو گئی تھی۔ اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ سکندر کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ شاید اندر داخل ہوتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔

ٹایاب نے برآمدے والے دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ باہر اگرچہ آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی تیز دھوپ تھی لیکن اندر کا ماحول نیم تاریک تھا، سکندر نے ہاتھ میں چکیڑی ہوئی تارچ روشن کر لی اور پھر دوسرے ہی لمحوہ اچھل پڑا۔ برآمدے والا دروازہ دھڑکی آواز سے بند ہو گیا تھا۔ اس نے تیز سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر سر جھٹک دیا دروازہ شاید ہوا سے بند ہوا تھا۔

وہ مڑ کر تارچ کی روشنی میں راہداری میں دیکھنے لگا۔ گرد آلود فرش پر ٹایاب کے جوگرز کے نشان تھے۔ یہی جوگرز وہ اس وقت بھی پہنے ہوئے تھی۔

"کہاں دیکھی تھی تم نے وہ لاش؟" سکندر نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آواز سرگوشیانہ تھی۔

"اس طرف۔ وہ کمرہ شاید پچھلی طرف ہے۔" ٹایاب نے جواب دیا۔

سکندر نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ ٹھک کر رک گیا۔ چرچاہٹ کی ہلکی سی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ باہر والا دروازہ بند تھا اور چرچاہٹ کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ پھر شائنا طاری ہو گیا۔

وہ ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے۔ سکندر تارچ کی روشنی میں فرش پر ٹایاب کے قدموں کے نشان دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ ٹایاب بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ بھی اپنے قدموں کے نشان دیکھ رہی تھی۔ پہلے اس نے راہداری میں قدموں کی آواز سنی تھی لیکن اسے گرد آلود فرش پر اپنے علاوہ کسی اور کے قدموں کے نشان دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

باتیں طرف والی راہداری میں مڑنے کے بعد ٹایاب دائیں طرف والی راہداری میں مڑ گئی۔ اس کے خیال میں اس راہداری میں قدموں کے نشان ضرور ہونے چاہئے تھے لیکن

فضا فائزنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ چوہدری سعادت اور بگا کی رانکلوں سے نکلنے والی گولیاں اس بوڑھے کے جسم میں پیوست ہو رہی تھیں جو اچانک ہی ان کے سامنے آگیا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر وہ بوڑھا گولیاں کھا کر نہ تو رکا اور نہ گرا۔ اس کے برعکس وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

ملک سکندر نے چوہدری سعادت کو دیکھتے ہی ٹایپ کو پکڑ کر ایک طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ برآمدے کا ستون اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ دونوں اس کی آڑ میں پناہ لے سکتے۔ وہ گرد آلود فرش پر گرے تھے۔ ٹایپ سکندر کے پیچھے دلی ہوئی تھی۔ سکندر نے گرتے ہوئے خود ہی اپنے آپ کو ٹایپ کے اوپر لادا تھا تاکہ کوئی گولی گئے تو اسے لگے اور ٹایپ محفوظ رہے۔ سکندر کا خیال تھا کہ وہ دونوں ہی گولیوں سے چھلٹی ہو جائیں گے۔ لیکن اس بوڑھے کو درمیان میں آتے دیکھ کر وہ حیرت زدہ سا رہ گیا تھا اور زیادہ حیرت تو اس وقت ہوئی تھی جب وہ بوڑھا لاتعداد گولیاں کھانے کے باوجود آگے بڑھ رہا تھا۔

حویلی کے چھانک میں کھڑے ہوئے چوہدری سعادت اور بگا اندھا دھند فائزنگ کر رہے تھے۔ چوہدری سعادت نے سکندر اور ٹایپ کو برآمدے والے دروازے سے برآمد ہوتے دیکھ کر جب رانکل تانی تھی تو وہ بہت خوش تھا کہ آج یہ دونوں قابو میں آگئے ہیں اور بیچ کر نہیں جا سکیں گے۔ تقریباً "آدھا گھنٹہ پہلے اس کے ایک مزارعے اطلاع دی تھی کہ ٹایپ اور ملک سکندر پرانی حویلی میں گئے ہیں اور وہ بگا کو نے کریمیاں بیچ گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان دونوں کو ختم کر کے لاشیں حویلی کے اندر پھینک دے گا۔ یہ حویلی آسیب زدہ مشہور تھی۔ کوئی اس کے اندر جانے کی جرات نہیں کرے گا۔ ٹایپ کا کانٹا اس کے راستے سے جیشہ سے لے کر نکل جائے گا اور ملک سکندر کو بھی ٹایپ سے ہمدردی کی سزا مل جائے گی۔

وہ راہداری میں بھی دوڑتے رہے۔ چیتوں کی آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سکندر بزدل نہیں تھا لیکن وہ بھی ڈر گیا تھا۔

باہر والا دروازہ کھول کر وہ برآمدے میں آگئے۔ تیز دھوپ میں ان کی آنکھیں چند منیا گئیں۔ چند سیکنڈ بعد ان کی آنکھیں دن کی تیز روشنی سے مانوس ہوئیں تو ٹایپ کو ایک بار پھر سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ حویلی کے چھانک کی طرف دیکھ رہی تھی، جہاں چوہدری سعادت اور بگا کھڑے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں رانکلیں تھیں اور وہ دونوں ان کے نشانوں کی زد پر تھے۔ ٹایپ نے سکندر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

"اب تو تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا بگا!" سعادت نے چیخ کر کہا اور بگے کو اشارہ کیا۔ ان دونوں نے بیک وقت رانکلوں کے ٹرانگٹر دبا دیے اور پھر اچانک ہی وہ پراسرار بوڑھا نبھانے کہاں سے نکل کر ان کے سامنے آگیا۔



نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر برآمدے سے نکل کر پھاٹک کی طرف دوڑے۔ پھاٹک سے باہر نکل کر وہ رک گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ سعادت اور بگاٹھے سے اتر کر کیمٹوں میں پہنچ گئے تھے اور اس طرح دوڑے جا رہے تھے جیسے بنم کی بلائیں ان کا پیچھا کر رہی ہوں اور سکندر کو حیرت اس بات کی تھی کہ ان کے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ حالانکہ اس نے اس بوڑھے کو بھی حویلی کے پھاٹک سے نکل کر ان کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن اب وہ بوڑھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ٹپے پر ٹالی اور پتیل کے درختوں کی بہت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ بوڑھا ان درختوں کی آڑ میں ہو لیکن وہ پراسرار بوڑھا کس بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

ٹایپ بھی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ٹپے سے اترنے لگی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ بوڑھا کیمٹوں کے درختوں کی آڑ میں ہو گا لیکن وہ کس بھی دکھائی نہیں دیا۔ وہ ایک جگہ رک گئی۔ سکندر بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

”یہ تو بڑی حیرت کی بات ہوئی۔“ وہ بولا ”یہ بوڑھا پتہ نہیں کون تھا۔ کہاں سے آیا اور کہاں چلا گیا۔ لیکن اس کی وجہ سے ہماری جان بچ گئی ورنہ چوہدری سعادت اور بگاٹھے آج ہم دونوں کو بھون ہی ڈالتے۔“

”یہ وہی بوڑھا تھا سکندر بھائی۔“ ٹایپ نے کہا۔ ”وہی بوڑھا جسے میں نے اس روز سلیوں کی جگہوں کے قریب کار سے اتارا تھا اور بعد میں مجھے والوں سے معلوم کرنے پر پتہ چلا تھا کہ وہاں اس سٹلے کا کوئی شخص نہیں رہتا۔“

”لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ بوڑھا یہاں کہاں سے آ گیا۔“ سکندر نے کہا۔ ”مجھے تو اس کے اس طرح غائب ہو جانے پر حیرت ہو رہی ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے ایک بار پھر کیمٹوں کی طرف دیکھا۔ چوہدری سعادت اور بگاٹھے بہت دور جا چکے تھے۔ کیمٹوں میں دور دور تک ان دونوں کے علاوہ اور کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”حویلی میں اس عورت کی لاش کے بارے میں تمہاری تسلی ہو گئی نا۔“ سکندر ٹایپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ سب تمہارا دہم ہے۔ یہ آسیب زدہ حویلی ہے۔ اس قسم کی باتیں اکثر سننے میں آتی ہیں اور اسی وجہ سے کوئی شخص اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرتا۔ تم نے حفاظت کی تھی جو اکیلی یہاں آگئی تھیں اور اس سے

چوہدری سعادت کی انگلی رانقل کے ٹرائیگر پر تھی۔ اس نے ملک سکندر کو لٹکارا اور ٹرائیگر دبا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ہی وہ بوڑھا سامنے آ گیا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ وہ بوڑھا کہاں سے نمودار ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے سچا کہ بوڑھے کو درمیان سے ہٹنے کا موقع دے۔ لیکن پھر یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ زندہ بچ جانے والا یہ بوڑھا اس کے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔ اس نے اشارہ کیا اور رانقل کا ٹرائیگر دبا دیا۔

چوہدری سعادت کا خیال تھا کہ پہلی گولی لگتے ہی بوڑھا ڈھیر ہو جائے گا اور انہیں سکندر اور ٹایپ کو بھی نشانہ بنانے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب بوڑھا گولیاں کھا کر بھی آگے بڑھتا رہا۔

سعادت اور بگاٹھے کے نشانے خطا نہیں گئے تھے۔ ان کی رانقلوں سے نکلنے والی تمام گولیاں اس بوڑھے کے جسم میں پیوست ہو رہی تھیں اور اس کے باوجود وہ بوڑھا بھانڈیوں میں جبری سے چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

چوہدری سعادت کی آنکھیں حیرت سے پلپلتی چلی گئیں۔ بوڑھے پر گولیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ مسلسل آگے بڑھتا آ رہا تھا۔ ”سعادت کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ یہ بوڑھا کوئی آسیب تو نہیں۔ اس نے غور سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس نے پہلے کبھی اس بوڑھے کو گاؤں میں یا آس پاس کی کسی ہستی میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ چوہدری ہارنظر کیا تھا۔ یہ خیال اس کے ذہن میں جڑ پکڑنا لگا کہ یہ بوڑھا کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔ باقی الفطرت ہستی ہے جس پر گولیوں کا اثر بھی نہیں ہو رہا۔

اس کے دماغ میں سنسنات ہی ہونے لگی۔ آنکھوں میں اب خوف ابھر آیا تھا۔ بوڑھا ان کے بالکل قریب پہنچ رہا تھا۔ سعادت نے بوڑھے کو رانقل کی زد پر لے کر ایک اور باڑ ماری مگر اس مرتبہ بھی نتیجہ صفر ہی نکلا۔ بوڑھا مسلسل آگے آ رہا تھا۔ ایک انجانہ سا خف سعادت پر غالب آ رہا تھا۔ اس نے بگاٹھے کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا اور دونوں مڑ کر بھاگ نکلے۔

ٹایپ اور سکندر برآمدے کے گرد آلودہ فرش پر پڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ سعادت اور بگاٹھے کو راہ فرار اختیار کرتے دیکھ کر سکندر کے ہونٹوں پر خف ہی مسکراہٹ آگئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹایپ بھی گھبرا سانس لیتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ان دونوں

کون تھی اور اسے کن حالات میں قتل کیا گیا تھا اور اس کا قاتل کون تھا؟“
 ”معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”سب جانتے ہیں کہ گاؤں کے
 موچی نور دین کی بیٹی حارہ کو دھوکے سے اس حویلی میں لا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ ان
 سرکشوں نے ہمیں بھی تو قتل کیا تھا۔“
 ”لیکن قاتل کا نام نہیں تھا تھا۔“ نایاب نے کہا۔ وہ چلتے چلتے رک مکی اور دائیں
 طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت زدہ لمبے میں بولی۔ ”ارے وہ دیکھئے سکندر بھائی۔ وہ بوڑھا
 اس طرف جا رہا ہے۔“

سکندر نے مڑ کر دیکھا۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر کھیتوں میں گھنڈی پر ایک
 بوڑھا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی جس سے چلتے ہوئے وہ سہا لے رہا تھا۔ دور
 سے اس کا چہرہ تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن حلیہ وہی تھا جو سکندر نے کچھ دیر پہلے حویلی کے
 کپڑوں میں دیکھا تھا۔ حویلی میں اس نے بوڑھے کو برق رفتاری سے سعادت کے پیچھے
 دوڑتے ہوئے دیکھا تھا لیکن کھیتوں میں نظر آنے والا وہ بوڑھا لامحی کے سارے بہت
 آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔
 ”لگتا تو وہی ہے لیکن۔۔۔۔“

”آئیے دیکھتے ہیں۔“ نایاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ
 کون ہے اور اس طرح اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا۔“
 سکندر کا جواب سننے سے پہلے ہی نایاب اس طرف مڑ گئی تھی۔ مجبوراً سکندر کو بھی
 اس کے پیچھے جانا پڑا۔ سکندر گھنڈی پر چلتے ہوئے بھی اسی طرح بوڑھے کی طرف دیکھ رہا
 تھا۔ وہ بوڑھا کھیتوں میں چہل کے ایک درخت کے تنے سے ٹک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شاید
 تھک گیا تھا۔ کیونکہ وہ آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ رہا تھا۔

نایاب اور سکندر تقریباً تین منٹ بعد وہاں پہنچے تھے۔ لیکن ان دونوں کو یہ دیکھ کر
 شدید حیرت ہوئی کہ وہ بوڑھا وہاں نہیں تھا۔ سکندر کا دماغ پکڑ گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں
 سے اس بوڑھے کو پتیل درخت کے تنے سے ٹک لگاتے اور پھر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا لیکن
 اب وہ اس طرح غائب تھا جسے اس کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔

نایاب بھی حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ کھیتوں میں پودے بھی زیادہ بڑے

بڑی حفاظت تو مجھ سے ہوئی جو تمہارے ساتھ یہاں چلا آیا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ اس
 بوڑھے کی وجہ سے ہماری جان بچ گئی۔ پتہ نہیں کون تھا وہ خدا کا بندہ۔۔۔۔ بہر حال، چلو۔۔۔۔
 اب واپس چلیں۔“

”کیا آپ کو اس بات پر حیرت نہیں کہ میں اس پر اسرار بوڑھے کی وجہ سے دو مرتبہ
 مرتے مرتے بچی ہوں۔“ نایاب نے کہا۔ ”پہلی مرتبہ اس وقت جب نور پور سے واپس
 آتے ہوئے میں نے اسے کار میں بٹھا لیا تھا اور سامنے لگے ہوئے آئینے میں سانپ کا عکس
 دیکھ کر انیٹرنگ میرے ہاتھ سے چھوٹا تھا اور کار کا رخ مڑانے کی وجہ سے میں گولیوں کی
 زد میں آنے سے بچ گئی تھی۔ اس وقت بھی یہ بوڑھا حیرت انگیز طور پر غائب ہو گیا تھا اور
 آج۔۔۔۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”آج بھی جو کچھ ہوا
 آپ نے دیکھ لیا۔ آج بھی اس کی وجہ سے ہم بچ گئے۔“

”ہم اب تک دوسری باتوں پر غور کرتے رہے ہیں لیکن ایک بات پر دھیان نہیں
 دیا۔“ سکندر بولا۔

”یہ کیا؟“ نایاب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”وہ بوڑھا ہمیں پہچانے کے لئے سامنے آیا تھا اور تمام گولیاں اس کے جسم میں گئی
 تھیں لیکن نہ تو وہ زخمی ہوا اور نہ مرا۔ اس کے جسم سے خون کا ایک قطرہ تک نہیں پڑا
 اور وہ اس طرح چوہدری سعادت کے پیچھے بھاگا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب مجھے شبہ ہی
 نہیں یقین ہو رہا ہے کہ وہ بوڑھا انسان نہیں کوئی بوڑھی چیز ہے۔ کوئی مافوق الفطرت ہستی۔
 جسے قدرت نے دونوں مرتبہ تمہاری مدد کے لئے بھیج دیا تھا۔ بہر حال، اب چلو۔ دیر ہو رہی
 ہے۔ مجھے اپنی ہی طرف سے بھی پریشانی ہے۔“

”لیکن سکندر بھائی وہ لاش۔۔۔۔ میں نے حویلی میں اس لاش کو اپنی آنکھوں سے
 دیکھا تھا اور اس کے جسم سے بننے والے خون کو بھی انگلی کی پور سے چھو کر دیکھا تھا۔ مجھے
 حیرت ہے کہ وہ لاش کہاں غائب ہو گئی۔“

”اب اس لاش کو زمین سے نکال دو۔“ سکندر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ”میں
 نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ حویلی آجیب زدہ ہے اور وہ سب کچھ تمہارا وہم تھا۔“

”لیکن وہ سرگوشیاں۔۔۔۔“ نایاب بولی۔ ”بہر حال۔۔۔۔ میں معلوم کروں گی کہ وہ عورت

روک سکے۔

”چوہدری فیلی والے نہیں روک سکتے لیکن وہاں جو آسیب ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں وہ ہمیں ایک گھنٹہ بھی حویلی میں نہیں سکے دیں گے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم یہاں رات رہنے کی نیت سے آؤ تو اگلے دو صبح ہمیں تمہاری لاش اٹھانی پڑے۔“ سکندر نے کہا۔

”ایسا نہیں ہوگا سکندر بھائی۔“ ثایاب نے کہا۔ ”حویلی کے آسیب مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔“

”تمہارا تو واقعی دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ سکندر بولا۔ ”لیکن میں تمہیں خودکشی کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”میں ابھی فوری طور پر تو اس حویلی میں منتقل نہیں ہو رہی۔“ ثایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دو چار دن بعد پر گرام بتاؤں گی۔“

”اور میرا خیال یہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ جب چوہدریوں کو تمہارے ارادے کا پتہ چلے گا تو وہ حویلی کے چاروں طرف پہرہ بٹھائیں گے اور ہمیں اس کے قریب کبھی نہیں پہنچنے دیں گے۔“

”وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔“ ثایاب نے جواب دیا۔

”آج بھی سعادت ہے جو کچھ کیا وہ تم نے دیکھ لیا۔ اگر وہ پر اسرار یوڑھاچ میں نہ آ جاتا تو ہم ختم ہو چکے ہوتے۔ کل بھی وہ تمہارے خلاف ایسی کارروائی کر سکتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ قسمت ہر مرتبہ تمہارا ساتھ دے۔“ سکندر نے کہا اور چند لمبے خاموشی کے بعد بولا۔ ”آج کے واقعہ کے بعد صورت حال کچھ زیادہ ہی سنگین ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے پولیس کو اس واقعہ کی اطلاع دے دینی چاہیے۔“

”پولیس کو اطلاع دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ ”اب تک کتنے واقعات کی رپورٹ کی جا چکی ہے لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس روز جس شخص نے مجھ پر حملہ کیا تھا میں نے اس کی نشاندہی کر دی تھی اور پولیس کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے لیکن ابھی تک اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اگر پولیس نے اسے پکڑا ہوتا تو اس کی شناخت کے لئے مجھ سے رابطہ ضرور کیا جاتا لیکن اس طرف ابھی تک خاموشی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ شخص نہیں پکڑا

نہیں تھے جس سے یہ سمجھا جاتا کہ وہ یوڑھاکی کیمت میں چلا گیا ہوگا۔

”مجھے اب تمہاری طرف سے ڈر کتنے لگا ہے ثایاب۔“ سکندر بولا۔ ”پتہ نہیں تم کس پکڑ میں پھنسی جا رہی ہو۔ چلو۔۔۔ اب جلدی سے یہاں سے چلو۔“

وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گینڈوڑی پر چلے گئے۔ ثایاب سوچ رہی تھی کہ وہ پر اسرار یوڑھاکی تھا۔ اس روز کار میں بھی اس کی وجہ سے وہ بچ گئی تھی اور آج بھی وہ یوڑھاکی کے اور موت کے بچ میں آ گیا تھا۔ کیا واقعی وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی تھا یا یہ سب کچھ اس کا وہم تھا یا خواب!

”سکندر بھائی۔“ ثایاب نے چلے چلے کہا۔ وہ گاؤں کے قریب پہنچ رہے تھے۔ ”وہ زمین اور حویلی چوہدریوں کی ملکیت ہے نا؟“

”ہاں۔۔۔“ سکندر نے مختصر سا جواب دیا۔

”ان زمینوں میں میرا بھی حصہ ہے جس کے حصول کے لئے میں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ مقدمے کا فیصلہ ہونے میں تو ابھی وقت لگے گا لیکن اس سے پہلے بھی اگر میں چاہوں تو اپنا حق استعمال کر سکتی ہوں۔“

”کیا مطلب۔۔۔ کیا کتنا چاہتی ہو؟“ سکندر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے اگر میں اس حویلی پر قبضہ کرنا چاہوں تو مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“ سکندر نے چمک کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم اس حویلی پر قبضہ کرنا چاہتی ہو۔ اس آسیب زدہ حویلی پر۔۔۔ جس کے بارے میں آج بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے تم اپنی آنکھوں سے بت کچھ دیکھ چکی ہو۔ کیا کرو گی اس پر قبضہ کر کے؟“

”میں یہاں رہائش اختیار کروں گی۔“ ثایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں اس اثیث میں صے وار ہوں۔ جس طرح وہ جائیداد پر قابض ہیں، میں بھی قبضہ کر سکتی ہوں۔ جب مقدمے کا فیصلہ ہوگا تو یہ بھی ملے ہو جائے گا کہ ان لوگوں کو کونسا ہٹا جانیے اور مجھے کونسا۔۔۔ برہماں، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس پرانی حویلی کو ابھی سے اپنے قبضے میں لے لوں۔ چوہدری فیلی والے مجھے نہیں

حویلی کے اندر کے واقعات کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے پورے جسم میں
شناخت سی ہونے لگی تھی۔ صبح جب وہ پہلی مرتبہ حویلی میں داخل ہوئی تھی تو اس نے
کمرے میں وہ لاش اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور اس کے سینے سے بننے والے خون کو
بھی چمکر دیکھا تھا۔ لیکن جب وہ سکندر کے ساتھ حویلی میں داخل ہوئی تو وہاں کچھ نہیں
تھا۔ گرد آلود فرش پر اس کے اپنے قدموں کے علاوہ اور کسی کے بھی نشانات نہیں تھے اور
اس کمرے میں کوئی چیز نہیں تھی۔ نہ لاش، نہ وہ مسمیٰ۔ ٹایاب سوچ رہی تھی کہ وہ سب
کیا تھا جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا! اس کا دہم یا آسیب۔

اور پھر جب وہ ان چیخوں سے خوفزدہ ہو کر حویلی سے باہر نکلے تھے تو چوہدری سعادت
اور بگ کسار کو رانٹیں ملنے لگیں کہ کاپ اٹھی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کی
زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ اس وقت اسے افسوس بھی ہوا تھا کہ اس کے ساتھ
سکندر بھی بلا وجہ مارا جائے گا۔ لیکن پھر وہ سب کچھ ہو گیا جس کا کبھی وہ تصور بھی نہیں
کر سکتی تھی۔ وہ پراسرار بوڑھا بھائیوں سے نکل کر اچانک ہی سامنے آ گیا تھا۔ حالانکہ
بھائیوں اتنی بڑی نہیں تھیں کہ ان میں کوئی چھپ کر بیٹھ سکتا۔ وہ بوڑھا اچانک ہی
بھائیوں سے نمودار ہوا تھا اور سعادت اور بگ کسار کی رانٹوں سے نکلنے والی تمام گولیاں
اس بوڑھے کے جسم پر گئی تھیں۔ لیکن وہ بوڑھا گرنے کے بجائے حیرت انگیز تیز رفتاری
سے ان دونوں کی طرف لپکا تھا۔

بعد میں نہ تو بھائیوں میں کہیں خون نظر آیا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی جگہ نظر آئی تھی
جس کے بارے میں سوچا جاسکتا کہ وہ بوڑھا وہاں چھپ کر بیٹھا ہوگا اور پھر وہ بوڑھا اس
طرح غائب ہو گیا تھا جیسے اس کا سرے سے وجود ہی نہ رہا ہو اور پھر کھیتوں میں نظر آیا تھا
اور جب وہ قریب پہنچے تو وہ پھر غائب ہو گیا۔

وہ پراسرار بوڑھا کون تھا؟ ٹایاب دیر تک سوچتی رہی لیکن کوئی بات اس کی سمجھ
میں نہیں آ سکتی تھی۔

ٹایاب یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ زمزم کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ چند لمے
ٹایاب کی طرف دیکھتی رہی پھر ہلکے کے قریب کرسی پر بیٹھنے ہوئے ہوئی۔

”کیا بات ہے ٹایاب۔ آج تم چپ سی ہو اور سکندر بھائی بھی خاموش ہیں۔ کہاں

گیا۔ یہ مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے آج کے واقعہ کی پولیس کو اطلاع دینے کا کوئی
فائدہ نہیں ہوگا۔“

”تم غلط سوچ رہی ہو۔“ ملک سکندر بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ پولیس کو اطلاع دینا
ضروری ہے تاکہ یہ بات ریکارڈ پر موجود رہے۔ بعد میں اگر ایسی کوئی بات ہو تو اس کا حوالہ
دیا جاسکے۔“

”ہمارے پاس اس واقعہ کا کوئی گواہ بھی نہیں ہے۔ لیکن بحرال آپ کہتے ہیں تو
پولیس میں رپورٹ لکھوا دیجی ہوں۔“ ٹایاب نے کہا۔

وہ دونوں گاؤں میں داخل ہو چکے تھے۔ گلیوں میں لوگوں کی آمدورفت تھی۔ انہوں
نے اپنی گفتگو کا موضوع بدل دیا اور باتیں کرتے ہوئے حویلی پہنچ گئے۔

ملک صلاح الدین کی طبیعت سحر تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔
ایک معمولی سے جھٹکے نے انہیں غموں سے بیدار کر رکھا تھا۔ کمزوری کی وجہ سے وہ برسوں کے بیمار
نظر آ رہے تھے۔ ٹایاب اور سکندر ان کے بید کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”اب کیسی طبیعت ہے انگل آپ کی؟“ ٹایاب نے پوچھا۔ ”ٹھیک ہوں بیٹا۔“ ملک
صاحب نے کمزور سی آواز میں جواب دیا پھر سکندر کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”کہاں چلے گئے
تھے تم لوگ؟“

”تھوڑا سا کام تھا ابا۔“ سکندر نے جواب دیا۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات
جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے آپ کو کئی دفعہ کہا تھا کہ اب آرام کریں، لیکن آپ تو
میری کوئی بات مانتے ہی نہیں۔ اب میں آپ کو کمرے میں نکلنے دوں گا۔ آپ جلدی
سے ٹھیک ہو جائیں، آرام کریں اور اللہ اللہ کریں۔ میں سنبھال لوں گا سارے کام۔“

”آرام سے بیٹھا بھی تو نہیں جاتا بیٹا!“ ملک صاحب نے جواب دیا۔
”لیکن اب یہ طے ہے کہ آپ کوئی کام نہیں کریں گے۔“ سکندر بولا۔

ملک صاحب خاموش رہے۔ اس دوران عذرہ اندر آگئی۔ وہ لوگ کچھ دیر بیٹھے باتیں
کرتے رہے پھر ٹایاب اللہ کر دوسرے کمرے میں آگئی اور بستر پر لیٹ گئی۔ وہ صبحی تھی سی
نظر آ رہی تھی۔ آج کے واقعات پر پہلے تو اس نے سنجیدگی سے توجہ نہیں دی تھی لیکن
اب سوچتے ہوئے وہ واقعی کانپ اٹھ رہی تھی۔

"پھر کیا ہوا پولیس کو اطلاع دی؟" زمرس نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر اس قسم کے تاثرات تھے جیسے وہ ان باتوں سے خاصی سنجی محسوس کر رہی ہو۔
 "نہیں۔" ٹایاب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "کیونکہ وہ لاش وہاں نہیں تھی۔"
 "کیا مطلب؟" زمرس اچھل پڑی۔

"سکندر بھائی نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ میرا واپس تھا۔" ٹایاب نے جواب دیا۔ "وہاں لاش کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ کیا اسراغ بھی نہیں ملا جس سے ثابت ہوتا کہ میرے علاوہ حویلی میں کوئی اور بھی داخل ہوا تھا۔ حویلی کے گرد آلود فرش پر صرف میرے ہی قدموں کے نشان تھے۔"

"وہ حویلی آسیب زدہ ہے۔ شکر کر دیج کر آگئیں۔ اگر ہمیں کچھ ہو جاتا تو کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ بھائی جان نے تو ہمیں خوب ڈانٹا ہوگا۔" زمرس نے کہا۔
 "ہاں ڈانٹا تو تھا۔" ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے میں ڈری بالکل نہیں ہوں اور ہمیں یہ سن کر یقیناً حیرت ہوگی کہ میں پندرہ روز بعد اسی حویلی میں نکل ہونے والی ہوں۔"

"کیا کیا کیا؟" زمرس اچھل پڑی۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔"
 "میرا دماغ کیوں خراب ہونے لگا۔" ٹایاب بدستور مسکرا رہی تھی۔ "ارے بھئی ان زمینوں پر میرا بھی حق ہے اور وہ حویلی اسی زمین پر ہے۔ بیکار پڑی ہے۔ کیوں نہ اسے صاف کر کے استعمال کے قابل بنایا جائے۔"
 "میرا خیال ہے تم واقعی بالکل ہو گئی ہو۔" زمرس نے کہا۔ "اس حویلی میں جن بھوت رچے ہیں وہ پہلے ہی روز تمہارا گلا گھونٹ دیں گے۔"
 "اچھا۔ ایک بات بتاؤ۔" ٹایاب بولی۔ "تم نے نور دین نامی موچی کے بارے میں سنا ہے کبھی؟"

"نہیں۔" زمرس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
 "عاجزہ نامی کسی لڑکی کے بارے میں جسے قتل کر دیا گیا تھا؟" ٹایاب نے پوچھا۔
 "نہیں۔" زمرس نے اس مرتبہ بھی نفی میں سر ہلا دیا۔
 "میں بتاتی ہوں۔" ٹایاب نے کہا۔ "نور دین تمہارے دادا کے زمانے میں اس گاؤں

گئے تھے تم لوگ؟ کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟"
 "خاص بات!" ٹایاب اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "اب تو ہر بات خاص ہی ہوگی۔"

"اچھا۔ آج کی خاص بات بتا دو۔ کہاں گئے تھے تم لوگ؟" زمرس نے پوچھا۔
 "پرانی حویلی۔" ٹایاب نے جواب دیا۔
 "پرانی حویلی!" زمرس اچھل پڑی۔ "وہ حویلی تو آسیب زدہ ہے۔ لوگ تو اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ تم لوگ وہاں کیوں گئے تھے؟"
 "بات دراصل یہ ہے کہ آج صبح میں اس حویلی میں چلی گئی تھی۔" ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "وہاں کچھ ایسی چیزیں نظر آئیں جنہیں میں حقیقت سمجھی۔ میں نے سکندر بھائی کو بتایا تو وہ میرا خزانہ اڑانے لگے۔ میں انہیں مجبور کر کے اپنے ساتھ لے گئی تھی تاکہ میں نے حویلی میں جو کچھ دیکھا تھا انہیں بھی دکھا سکوں۔"
 "کیا دیکھا تھا تم نے؟" زمرس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
 "ایک خوبصورت لڑکی کی لاش جسے بڑی بیدردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔" ٹایاب نے جواب دیا۔

"لاش!" زمرس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔
 "ہاں۔" ٹایاب بولی۔ "بہت حسین لڑکی تھی وہ۔ لگتا تھا جیسے اسے میرے وہاں پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے قتل کیا گیا ہو۔ اس کے سینے سے گرم گرم خون بہہ رہا تھا۔ میں نے چھو کر دیکھا تھا اور پھر وہ پراسرار سرگوشیاں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ "مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لڑکی میرے کان میں سرگوشیاں کر رہی ہو۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ کون ہے۔ اسے کس طرح قتل کیا گیا اور پھر مجھے عجیب سی چٹخیں سنائی دیں جیسے کسی عورت کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ میں ڈر کر وہاں سے بھاگ آئی۔ میرا خیال تھا کہ کسی نے لڑکی کو زبردستی اغوا کیا تھا اور اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد اسے قتل کر کے پھینک دیا تھا۔ میں تو اسی وقت سکندر بھائی کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی لیکن انکل کی طبیعت خراب ہو گئی اور جب انکل کی طبیعت سنبھلی تو میں سکندر بھائی کو مجبور کر کے اپنے ساتھ لے گئی تاکہ لاش انہیں دکھا کر فوراً پور پولیس کو اطلاع دی جائے۔"

کا موچی تھا اور حارہ اس کی جوان اور بہت حسین بیٹی تھی جسے دھوکے سے اس حویلی میں لے جا کر بے آہود کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا تھا۔ میں نے آج صبح جولا ش دیکھی تھی وہ اسی حارہ کی تھی۔

”میں بھائی جان سے کہتی ہوں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ مجھے اب تمہاری دماغی صحت پر شبہ ہونے لگا ہے۔“ زمرس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں پاگل نہیں ہوں۔“ ٹایاب مسکرائی۔ ”موقع ملے تو سکندر بھائی سے پوچھ لیٹا۔ انہوں نے بھی ان دونوں کے بارے میں سن رکھا ہے۔ بلکہ بستر ہوگا کہ انکل جب ٹھیک ہو جائیں تو ان سے پوچھتا۔ انہوں نے حارہ اور نور دین موچی کو ضرور دیکھا ہوگا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب انکل چودہ پندرہ برس کے ہوں گے۔“

”میں نے تو آج تک کوئی ایسی بات سنی نہیں اور تم نے یہاں آتے ہی گڑے مروے بھی اکھاڑ ڈالے۔“ زمرس نے اسے گھورا۔

”ہاں..... اسے محض اتفاق سمجھ لو۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”یہ چند باتیں مجھے محض اتفاق سے ہی معلوم ہوئی ہیں۔ میں ان کے بارے میں تحقیقات کا ارادہ رکھتی ہوں اور مجھے توقع ہے کہ کچھ اور گڑے مروے اکھڑیں گے اور مزید سنسنی خیز انکشافات ہوں گے۔“

”کیوں اپنے آپ کر ان پکڑوں میں پھنسا رہی ہو ٹایاب!“ زمرس نے کہا۔ ”تم تو یہاں اپنی جائیداد کے تحفے کے سلسلے میں آئی تھیں۔ میرا مشورہ ہے کہ کسی اور جگہ میں پڑنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پکڑوں میں پڑ کر کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔“

”میں خود ان پکڑوں میں نہیں پڑنا چاہتی لیکن میں محسوس کر رہی ہوں کہ کوئی پراسرار اور نادیدہ قوت مجھے آگے دھکیل رہی ہے۔ نہانے مجھے یہ احساس کیوں ہو رہا ہے کہ کوئی پراسرار قوت مجھ سے کوئی اہم کام لینا چاہتی ہے اور میں پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی۔“ ٹایاب نے کہا۔

زمرس کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سکندر دروازے میں داخل ہوا۔

”ٹایاب بن۔ ایک منٹ ذرا میرا ساتھ آؤ۔“ اس نے کہا۔ ٹایاب اٹھ کر کمرے

سے باہر آگئی۔

”کیا بات ہے سکندر بھائی؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے سکندر کی طرف دیکھا۔

”نور پور سے ایک سپاہی آیا ہے۔ قہانیدار نے تمہیں کسی کی شناخت کے لئے بلایا ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”تم تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”میں ابھی چند منٹ میں تیار ہو جاتی ہوں۔“ ٹایاب نے کہا۔

اس کا لباس بہت میلادور ہوا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور سکندر کے ساتھ حویلی سے باہر آگئی۔ اس وقت چھ بجتے والے تھے۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔

ملک سکندر نے گاڑی نکال لی۔ نور پور سے پولیس کانسٹیبل سائیکل پر آیا تھا۔ سائیکل کار کی وگی میں فوٹس کر کانسٹیبل کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا گیا۔ ٹایاب اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ ملک سکندر گاڑی کو گاڑوں کی گلیوں سے نکال کر ہائی وے کی طرف جانے والی سڑک پر لے آیا۔

ملک سکندر نے راستے میں کانسٹیبل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بات کو جان رہا۔ اس لئے سکندر نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔

میں پچھلی منٹ میں وہ نور پور قہانے پہنچ گئے۔ قہانیدار موجود تھا اور سب انسپکٹر اشرف بھی۔ وہ ٹایاب اور سکندر کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”تینے لی لی۔“ چیمپے۔ قہانے دار نے ملک سکندر سے ہاتھ ملا کر ٹایاب کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کل آپ نے قاتلانہ حملے کی رپورٹ لکھوائی تھی اور اس کے بعد ایک آدمی کی نشاندہی بھی کی تھی۔“

”لی ہاں۔“ قہانیدار نے سر ہلا دیا۔ ”مکو اور اس کے دو ساتھیوں کو قلع پور کے قریب قازنگ کے جادے کے بعد پکڑ لیا گیا تھا۔ گھوم گئے سے زخمی ہو گیا تھا۔ لیکن برسر حال پوچھ گچھ کے دوران اس نے کچھ انکشافات کئے تھے۔“

”لئے تھے کیا مطلب؟“ ٹایاب چونک گئی۔

”میں نے بتایا کہ وہ پولیس مقابلے میں گولی لگنے سے زخمی ہو گیا تھا۔“ قہانیدار نے کہا۔ ”پوچھ گچھ کے دوران اس کی حالت بگڑ گئی۔ اسے اسپتال لے جایا گیا لیکن وہ جانبر نہ

ٹایاب کی بات سن کر تھانیدار چونک گیا۔

"آپ پر حملہ کب ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"آج دوپہر اس وقت سکندر بھائی بھی میرے ساتھ تھے۔" ٹایاب نے جواب دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "چلے سکندر بھائی۔ کوئی فائدہ نہیں میاں آنے کا۔"

"میں آپ کو ایک مشورہ دوں گا ٹایاب بی بی۔" تھانیدار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چوہدری فیملی سے آپ کی مقدسے بازی ہو رہی ہے۔ بات معمولی نہیں، کروڑوں کی جائیداد کا معاملہ ہے اور وہ اس سے آسانی سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ ایسی صورت حال میں آپ کو ان لوگوں سے دور رہنا چاہئے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک آپ کے مقدسے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ اس دوران میاں رہنا آپ کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ مخالف پائلٹی آپ کو کوئی نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔"

"اس مشورے کا شہریہ تھانیدار صاحب! اس مرتبہ ٹایاب کے بجائے ملک سکندر نے لب کشائی کی تھی۔" میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایک بات آپ بھی ذہن میں رکھیں تھانیدار جی! ملک فیملی اتنی گنتی گزری اور کمزور نہیں ہے کہ اپنی اور اپنے مسلمانوں کی حفاظت نہ کر سکے۔ آپ تو اپنے دل کی بات کہہ دی۔ لیکن ایک بات آپ بھی یاد رکھیں کہ اگر کوئی ایسی دیکھی بات ہو گئی تو اس کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہوگی۔"

"آپ میرا مطلب غلط سمجھ رہے ہیں ملک جی۔" تھانیدار بولا۔ "میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ پولیس چوس چوس گئے تو ٹایاب بی بی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ آپ تو جانتے ہیں زمینداروں کی دشمنیاں کیسی ہوتی ہیں۔ ٹایاب بی بی کو احتیاط کرنی چاہئے۔ مقدسے کا فیصلہ ہونے تک یہ ان لوگوں سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے۔"

"مقدسے بازی کا یہ مطلب تو نہیں کہ کوئی اپنا گھر چھوڑ کر بھاگ جائے۔" ٹایاب نے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ جانتے ہیں میں چوہدری فیملی کی ہو ہوں۔ میرے شوہر نے مجھے طلاق نہیں دی تھی، ان کا انتقال ہوا تھا۔ اس طرح میں اس جائیداد میں اپنے شوہر کے حصے کی وارث ہوں۔ جس کے لئے میں نے مقدمہ کر رکھا ہے۔ جس

ہو سکا۔ اس کی لاش ہسپتال میں پڑی ہے۔ آپ کو اس لئے زحمت دینی ہے کہ اس کی شناخت کر سکیں کہ یہ وہی آدمی تھا یا کوئی اور۔"

"کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ اس نے مزید کیا افکاشات کئے تھے؟" ٹایاب نے

پوچھا۔

"مکمل فوج پور کا ایک نامی گرامی بد معاش تھا۔" تھانیدار نے جواب دیا۔ "اس کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس سے آپ کا کوئی سروکار نہیں لیکن آپ کے لئے دلچسپ اطلاع یہ ہے کہ جو شخص پولیس کی حراست سے فرار ہوا تھا اور بعد میں اس کی لاش ریلوے اسٹیشن کے بیت الخلاء میں ملی تھی، اسے بھی گھومنے سے قتل کیا تھا۔"

"کس کے کہنے پر؟" ٹایاب نے پوچھا۔

"مگھو یہ نہیں بتا سکا۔" تھانیدار نے کہا۔ "اس سے میرا اگلا سوال یہی تھا لیکن اس وقت اس کی حالت بگڑ گئی تھی اور وہ مزید کسی بات کا جواب نہیں دے سکا تھا۔"

"کیا اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کس کے اشارے پر کیا تھا؟" ٹایاب نے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا کہ اس کی حالت بگڑ گئی تھی اور ہم اس سے کچھ نہیں پوچھ سکے۔" تھانیدار نے جواب دیا۔

"حیرت ہے۔" ٹایاب نے کہا۔ "آپ اس سے اس کے دیگر جرائم کے بارے میں تو تفصیل سے پوچھتے رہے لیکن آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ اس شخص کو قتل کیا تھا اور مجھ پر قاتلانہ حملہ کس کے اشارے پر کیا گیا تھا۔"

"پولیس کا تفتیش کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے بی بی۔" تھانیدار نے کہا۔ "میں سمجھ گئی آپ کا تفتیش کا طریقہ کار۔" ٹایاب نے کہا۔ "آج دوپہر مجھ پر ایک

بار پھر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور یہ حملہ خود چوہدری سعادت نے کیا تھا۔ اس کے ساتھ بگا کمار بھی تھا۔ اگر ایک حیرت انگیز واقعہ درمنا نہ ہوتا تو میں اور ملک سکندر ان کی گولیوں کا نشانہ بن چکے ہوتے۔ یہ میں آپ کو اس لئے بتا رہی ہوں کہ آپ کے علم میں رہے۔ رپورٹ اس لئے نہیں لکھوا رہی ہوں کہ آپ کا تفتیش کا اپنا طریقہ کار ہے۔ اس سے آپ کو تو فائدہ پہنچ سکتا ہے کسی اور کو نہیں۔ اس لئے سب کچھ بیان ہے۔"

ہسپتال کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ دو ہی راہداریاں تھیں۔ وہ ایک راہداری سے گزر کر پچھلی طرف آگئے۔ مردہ خانہ پچھلی طرف تھا۔ سب انیسٹر نے ہسپتال کے ایک کارندے کو ساتھ لے لیا تھا۔

مردہ خانہ ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل تھا۔ کمرے کا اینٹریڈیشن خراب تھا۔ لاش کھڑی کی ایک میز پر پڑی ہوئی تھی جس کے دائیں بائیں برف کے ٹکڑے رکے ہوئے تھے۔ چھتے کی ہوا سے برف پگھل رہی تھی اور پانی میز سے نچ کر فرش پر بہ رہا تھا۔ لاش میلی سی سفید چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سب انیسٹر اشرف نے آگے بڑھ کر لاش کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ یہ ایسی گھونٹی شخص کی لاش تھی۔ جسے ٹایب نے بازار میں دیکھ کر شناخت کیا تھا اور جو دھوکا دے کر فرار ہو گیا تھا۔ اس کے دائیں رخسار پر زخم تھا اور اوپر کا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا۔ ٹایب نے چادر کا ٹکڑا پکڑ کر اسے نیچے کھینچ دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ کانپ اٹھی۔

لاش برہنہ تھی اور سینے پر زخم کے بے شمار نشانات تھے جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ مرنے سے پہلے اس شخص پر بے پناہ تشدد کیا گیا تھا اور یقینی طور پر اس کی موت بھی تشددی سے واقع ہوئی تھی۔

”تھاپے میں اسے گولی کہاں لگی تھی؟“ ٹایب نے سب انیسٹر اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ٹانگ پر۔“ سب انیسٹر نے جواب دیا۔
”لیکن اس کی یہ حالت۔“ ٹایب بولی۔ ”ٹانگ پر گولی لگنے سے کوئی آدمی مرنا نہیں ہے۔ اسے تھانے میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔“

”تو باقی جی جی کی طریم کی زبان کھلوانے کے لئے ہاتھوں کو حرکت تو دینا پڑتی ہے۔“ بات کرتے ہوئے سب انیسٹر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی ”اور ہمارے قاتیلار صاحب تو طریم کو اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک اس کی زبان کھلوانے لیں۔“

”اوہ۔“ ٹایب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ سب انیسٹر اشرف کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اس نے دیکھتے چھپے نظروں میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔

طریم یہ لوگ اس جائیداد کو استعمال کر رہے ہیں اسی طرح مجھے بھی حق حاصل ہے۔ اس زمین پر ایک حویلی ہے جو پرانی حویلی کے نام سے مشہور ہے۔ میں وہ حویلی اپنے قبضے میں لے کر چند روز بعد وہاں منتقل ہو رہی ہوں۔“

”پرانی حویلی میں!“ قاتیلار چونک گیا۔ ”لیکن وہ تو آسیب زدہ حویلی ہے۔ وہاں آپ کے ساتھ۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے۔“ ٹایب نے اس کی بات کاٹ دیکھی۔ ”میں نے آپ کو اطلاع دیدی ہے۔ اس حوالے سے اگر کوئی گڑبگ ہوئی تو اس کی ذمہ داری بھی آپ پر ہوگی۔ چلے سکندر بھائی!“ ٹایب نے آخری الفاظ سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

”ٹایب بی بی!“ قاتیلار بولا۔ ”بہتر ہوتا کہ آپ ہسپتال جا کر اس لاش کو شناخت کر لیتیں تاکہ ہم حقیقت کو آگے بڑھا سکیں۔“

”ٹھیک ہے میں اسے دیکھ لیتی ہوں لیکن“ ٹایب نے جان بوجھ کر جملہ اور حورا چھوڑ دیا۔

”کچھ نہیں۔ آپ چلے ہمارے ساتھ۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔
”ملک جی۔ آپ ہسپتال چلے۔ میں اپنی جیب پر آ رہا ہوں۔“ قاتیلار نے سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ٹایب اور سکندر باہر آکر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے اور پھر انہیں ہسپتال پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ہسپتال کی خوبصورت عمارت جیسے سے باہر تھی۔ اس کے ارد گرد درختوں کی بہتات تھی۔ بڑا صاف ستھرا ماحول تھا۔

وہ دونوں گاڑی سے اتر کر برآمدے کے قریب کھڑے ہو گئے اور پھر تقریباً ”آوے گئے بعد پولیس کی جب گیٹ میں داخل ہو کر ان کی کار کے قریب رک گئی۔ جیب سے اترنے والا انیسٹر نہیں۔ سب انیسٹر اشرف تھا۔ وہ جیب سے اتر کر ان کے قریب آ گیا۔
”کیوں سبھی اشرف صاحب! قاتیلار کیوں نہیں آیا؟“ ملک سکندر نے اس کے قریب آنے پر کہا۔

”تھانے میں ایک کہیں آ گیا تھا ملک جی۔ آپ لوگ میرے ساتھ آئیے۔“ سب انیسٹر اشرف کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

سے آپ لوگوں کو کوئی تکلیف ہو۔ بس دو چار دن کی بات ہے پھر میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”نہیں نہیں۔ ٹایاب بہن۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ سیکندہ جلدی سے بولی۔ ”میں تو اس کم بخت کو کوس رہی ہوں جس نے تمہاری زندگی میں بھی انگارے بھر دیے ہیں۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی سبھی۔“

”آپ یہ تو پوچھیں کہ یہ جانا کہاں چاہتی ہے۔“ زمر نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔ ”یہ بی بی پرانی حویلی کی صفائی کروا کر وہاں شفٹ ہونے کا پروگرام بنا رہی ہے۔“

”ہائے رہا۔“ سیکندہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا لڑکی۔ وہ آسیب زندہ حویلی ہے۔ وہاں تو کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ تمہاری تو قسمت اچھی ہے جو تم بچ کر آگئیں۔ نہیں بھئی۔ میں تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گی۔“

”وہاں کوئی آسیب یا بدروح نہیں ہے۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر کوئی ایسی چیز ہے بھی تو مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ ڈر اور خوف تو ان لوگوں کو ہوتا ہے جنہوں نے انسانیت سے ناپ تول کر ظلم اور بربریت کو اپنا شیوہ بنا لیا ہو۔“ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے گئی۔ ”بوسوں پہلے وہاں ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کو ہوس کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس لڑکی کی روح اب بھی اس دیران حویلی میں بھگ رہی ہے۔ وہ اس خاندان سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ گاؤں والے جانتے ہیں کہ صرف اسی خاندان کے دو افراد اس حویلی میں موت کے گھاٹ اتارے ہیں۔ اس کے بعد بہت سے لوگ اس حویلی میں گئے ہوں گے اور میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہو گا۔ وہاں موت صرف اسی خاندان کے لوگوں کے لئے ہے۔ یہ نانا کہ میرا تعلق بھی اس خاندان سے ہے جڑ چکا ہے لیکن مجھے اس حویلی میں بسکنے والی روح سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں اس کی دوست بن کر رہوں گی۔“

”یہ بد رو صبح کسی کی دوست نہیں ہوتی۔“ سیکندہ نے کہا اور پھر جیسے کچھ یاد آنے پر بولی۔ ”اوہ.... اس کا مطلب ہے کہ سعادت نے گاؤں والوں کو جو بتایا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے وہ بوڑھا۔“

سب انہی کے ہمارے لاش کے اوپر تک پہنچ دی۔ ٹایاب نے اس کی شناخت کر لی تھی۔ ہسپتال سے باہر اگر سب انہی کے اس کا شکر یہ ادا کیا اور اپنی جیب کی طرف بڑھ گیا۔ ٹایاب اور سکندر بھی اپنی گاڑی میں آگئے۔

جب وہ گاؤں پہنچے تو رات کے نو بج رہے تھے۔ اس وقت گاؤں کی دو عورتیں سیکندہ کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ عورتیں چلی گئیں تو سیکندہ نے بتایا کہ گاؤں میں ٹایاب کے بارے میں ایک اور افواہ پھیل چکی ہے۔

”اور وہ افواہ کیا ہے؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”چوہدری سعادت اپنے ایک کارندے کے ساتھ آج پرانی حویلی کی طرف چلا گیا تھا۔ ان دونوں کے پاس رانٹھیں تھیں۔ انہوں نے حویلی سے ٹایاب کو برآمد ہوتے دیکھا تو اسے بد روح سمجھ کر اس پر گولیاں برسادیں لیکن ایک بوڑھا آدمی پتہ نہیں کہاں سے نکل کر سامنے آگیا اور تمام گولیاں اس بوڑھے کے جسم پر لگیں۔ لیکن اس بوڑھے پر گولیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ چوہدری سعادت اور اس کا کارندہ خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلے اور جب مڑ کر دیکھا تو وہ بوڑھا غائب تھا۔“

”واہ۔“ ٹایاب مسکرائی۔ چوہدری سعادت نے گاؤں والوں کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور اس وقت میرے ساتھ سکندر بھائی بھی تھے۔“

”کیا.....؟“ سیکندہ اچھیل پڑی۔

”ہاں۔“ ٹایاب بولی۔ ”اس نے بد روح والی کہانی اس لئے گھڑی ہے کہ اس پر کوئی الزام نہ آئے۔“

”لیکن اب اس کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔“ سکندر نے کہا۔ ”بہت لحاظ ہو چکا۔ اب مزید لحاظ کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال لیا جائے۔“

”آپ اس پرانی حویلی میں کیا لینے گئے تھے؟“ سیکندہ نے سکندر کو گھورا۔

”ٹایاب نے وہاں ایک لڑکی کی لاش دیکھی تھی اور وہ سکندر بھائی کو وہ لاش دکھانے کے لئے ساتھ لے گئی تھی۔“ قرب کھڑی ہوئی زمر نے کہا۔

”یا اللہ... ہم کس پکڑ میں پھنس گئے ہیں۔“ سیکندہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”آپ پریشان نہ ہوں سیکندہ بھابی۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ

”اب ختم کرو یہ باتیں اور کھانا لگا لو۔ دس بج رہے ہیں اور مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ سکندر نے سیکینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ ”اور سنو! اباجی کو ان باتوں کی بھگ بھی نہیں پڑنی چاہئے۔“

”ہم تو کچھ نہیں جانتیں گے لیکن باہر سے کسی نے اگر کچھ بتا دیا تو؟“ زمرس نے کہا۔

”تم لوگ اس بات کا خیال رکھنا کہ کوئی بھی شخص ان کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کر سکے جس سے ان کی طبیعت خراب ہو جائے۔“ سکندر نے کہا۔

”چھ۔ خیال رکھیں گے۔“ سیکینہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں کھانا لگا لوں۔ آؤ لڑکیا! میری کچھ مدد کرو۔“

اور پھر اس کے دس پندرہ منٹ بعد وہ سب اکٹھے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

تیرھویں سلسلہ

صبح کا ناشتہ ٹایاب نے ملک صاحب کے پاس بیٹھ کر کیا تھا۔ ملک صاحب بڑی حد تک سنبھل گئے تھے۔ وہ بیڈ کی پشت سے کھٹے کے سارے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ٹایاب ان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس دوران ڈاکٹر بھی آگیا۔ اس نے ملک صاحب کو چیک کیا۔ بی بی پی وغیرہ لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”بہت خوب ملک بی! آپ تو ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔ بی بی بھی نارمل ہے۔ اب آپ کو صرف آرام کی ضرورت ہے اور یہ دوائیں آپ جاری رکھئے۔ ان میں تاخیر نہیں ہونا چاہئے۔“

ڈاکٹر رحمن تقریباً دو سال سے اس گاؤں میں تھا۔ وہ ایم بی بی ایس تھا۔ پہلے وہ نور پور میں کسی اور ڈاکٹر کے ساتھ مل کر پریکٹس کرتا تھا۔ اس گاؤں میں کوئی ڈاکٹر وغیرہ نہیں تھا۔ لوگوں کو علاج معالجے کے لئے نور پور جانا پڑتا تھا۔ رات کو کوئی ایرجنسی ہوتی تو نور پور بھی نہیں پہنچا جاسکتا تھا۔ پھر ایک روز ملک صاحب ہی ڈاکٹر رحمن کو گاؤں لے آئے تھے۔ یہاں اسے بہت سی تسمیوں دی گئیں۔ رہائش کے لئے وسیع و عریض مکان، جس کے ایک بڑے کمرے میں کلینک بنا دیا گیا تھا۔ ملک صاحب اپنی جیب سے تین ہزار روپیہ مینڈ

”شاید یہ آپ ٹھیک سمجھ رہی ہیں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”سکندر بھائی بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ جب سعادت اور اس کے کارندے سے ہم پر فائزنگ کی تھی تو ہمارے بیچ میں اچانک ہی وہ بوڑھا آگیا تھا۔ ساری گولیاں اس کے جسم پر لگی تھیں لیکن اسے کچھ نہیں ہوا تھا البتہ سعادت اور اس کا ساتھی خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلے تھے۔ وہی بوڑھا ایک بار پہلے بھی مجھے بچا چکا ہے۔ میں نے سکندر بھائی کو بتایا تھا۔“

”وہ بوڑھا کون تھا؟“ سیکینہ نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نہیں جانتی وہ کون ہے۔ لیکن اندازہ لگا سکتی ہوں کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔“

ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کون ہو سکتا ہے؟“ سیکینہ بولی۔

”ساتھ ستر سال پہلے اس حویلی میں گاؤں کے موچی نور دین کی بیٹی کو قتل کیا گیا تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اس واقعے کے بارے میں جانتے ہیں۔“ ٹایاب نے کہا۔

”جوان بیٹی کے اس طرح قتل ہو جانے پر بوڑھے باپ نے خودکشی کر لی تھی اور مجھے یقین ہے وہ بوڑھا دراصل نور دین کی روح ہے۔ جو مجھے کسی خاص سمت میں لے جانا چاہتا ہے۔ میں نے حویلی میں جب اس لڑکی کی لاش دیکھی تھی تو پر اسرار سرگوشیوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے اور اسے کتنی حالات میں قتل کیا گیا تھا۔ وہ دراصل ہاجرہ ثانی اس لڑکی کی روح تھی جو مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا رہی تھی۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں اس حویلی ہی میں رہوں گی۔“

”مجھے تو تم سے خوف آنے لگا ہے ٹایاب۔“ سیکینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں بھابھی۔ میں کوئی بدروح نہیں ہوں۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ میں واقعی تم سے ڈرنے لگی ہوں۔“ سیکینہ بولی۔ ”پہلے وہ سنرا سانپ اور اب یہ روحیں۔ اللہ جانے یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں تو ہر وقت تمہاری سلامتی کی دعاں مانگتی رہتی ہوں۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“ ٹایاب نے کہا۔

ساتھ دینے کو تیار ہوئے تھے۔ پرانی حویلی کی طرف روانہ ہوگئی۔ یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی کہ چھوٹی بی بی پرانی حویلی پر قبضہ کرنے جا رہی ہے۔ گاؤں کے لوگ خوفزدہ تھے۔ پہلا خوف تو یہ تھا کہ چوہدریوں کی طرف سے مزاحمت ہوگی اور اس طرح خون خرابہ ہوگا اور دوسرا خوف یہ تھا کہ اگر چوہدریوں کی طرف سے مزاحمت نہ بھی ہوئی تو حویلی کے آسیب مزاحمت کریں گے۔ برسوں سے اس حویلی کی طرف کوئی نہیں گیا تھا اور اب نایاب وہاں قبضہ کرنے جا رہی تھی۔ وہاں رہنے والے آسیب کسی کی مداخلت پسند نہیں کریں گے۔ گاؤں کے لوگوں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ ساتھ ستر سال پہلے اس حویلی میں چوہدری خاندان کے دو افراد پر اسرار طور پر ہلاک ہو گئے تھے۔ اس زمانے کے جو لوگ اب بھی زندہ تھے وہ تو ان واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔ ان پر اسرار ہلاکتوں کے بعد ہی چوہدری خاندان نے وہ حویلی خالی کر دی تھی۔ گاؤں کے لوگوں کو یہ خوف تھا کہ حویلی کے آسیب اس مداخلت بچا پر نایاب اور اس کے ساتھ جانے والوں میں سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔

نایاب کے ساتھ جتنے بھی آدمی تھے وہ سب مسلح تھے۔ کسی نے لامبھی اٹھا رکھی تھی۔ کسی کے پاس کلڈری تھی اور ایک آدمی کے پاس زنگ آلود گنوار تھی۔ ایک آدمی ایسا تھا جس کے پاس بارہ بور کی ڈبل ہیل بندوق تھی۔

گاؤں کے لوگوں کے غداشات اپنی جگہ لیکن نایاب بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھی۔ اس کے دل میں بھی ایسے ہی غداشات تھے۔ سب سے زیادہ خطرہ اسے چوہدریوں کی طرف سے تھا۔ اسے امید ہی نہیں تھی بلکہ یقین تھا کہ چوہدری سعادت اس کا راستہ روکے گا اور کسی بھی قیمت پر اسے حویلی پر قبضہ نہیں کرنے دے گا اور نایاب سوچ رہی تھی کہ اگر وہ حویلی پر قابض ہو گئی تو اس کے لئے بہت سی آسائیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کا راستہ کھل جائے گا اور اسے مزید بڑھ پھیلانے کا موقع مل جائے گا اور اس طرح گاؤں کے بہت سے لوگ بھی عملی طور پر اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔

گاؤں کے لوگوں کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ نایاب پرانی حویلی پر قبضہ کرنے جا رہی ہے۔ بہت سے لوگ جلوس کی صورت میں اس کے ساتھ چل پڑے تھے۔ بچے سب سے آگے آگے تھے۔ لیکن گاؤں کے باہر نمر کے قریب وہ سب لوگ رک گئے۔ نایاب کے ساتھ

ڈاکٹر رحمن کو دیتے تھے۔ تقریباً اتنی ہی رقم چوہدریوں سے بھی مل جاتی تھی۔ گاؤں کے بعض دوسرے زمیندار بھی پر سیمینے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ اناج، دانہ اور سبزیاں وغیرہ انک مل جاتی تھیں۔ اتنا کچھ تو ڈاکٹر رحمن شرمیں رہ کر بھی نہیں کما سکتا تھا۔ دو تین مہینے تو وہ اکیلا ہی رہا پھر بیوی بچوں کو بھی لے آیا۔ گاؤں میں ڈاکٹر کی موجودگی کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ گاؤں والوں کو اب نور پور جانے کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ آدھی رات کو بھی کسی کو تکلیف ہوتی تو اطلاع ملنے پر ڈاکٹر رحمن فوراً ہی پہنچ جاتا۔ ڈاکٹر رحمن کا گاؤں والوں کو بہت فائدہ تھا۔ اگر یہ موجود نہ ہوتا تو ملک صاحب کی طبیعت زیادہ بگڑ سکتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر رحمن سے انہیں فوراً ہی ٹیلمنٹ مل گیا تھا جس سے ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد بھی نایاب کافی دیر تک ملک صاحب کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ پھر اٹھ کر باہر آگئی۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ حویلی سے نکل آئی۔ نایاب اس روز گاؤں کے ہر اس شخص کے گھر میں جی جانے لگا۔ "وقتاً فوقتاً" اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں ان لوگوں کو عہدیدہ دیا کہ وہ پرانی حویلی کو اپنے قبضے میں لینا چاہتی ہے۔ اگر چوہدریوں کی طرف سے کوئی مزاحمت ہوئی تو وہ اس کا ساتھ دیں گے یا نہیں۔

"چوہدریوں کے خلاف تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ چھوٹی بی بی۔" برکت نامی ایک کسان نے کہا۔ "ہم تو اب تمہیں اس گھر کی بوجھتے ہیں اور تمہارا حق بنتا ہے لیکن۔۔۔ اس حویلی میں تو بد روحمیں رہتی ہیں۔ ان کے خلاف کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ لوگ تو ڈر کے مارے اس حویلی کے قریب سے بھی نہیں گزرتے۔"

"وہاں کوئی بد روحمیں نہیں ہیں۔" نایاب نے کہا۔ "میں دو مرتبہ اس حویلی میں جا چکی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

دن بھر گاؤں میں گھومنے کے بعد نایاب کو اپنے مقصد میں باؤسی نہیں ہوئی تھی۔ چھ سات آدمی اس کے ساتھ حویلی میں جانے کو تیار ہو گئے تھے۔ یہ خبر چوہدریوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ لیکن ان کی طرف سے کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہوا۔

اور پھر دوسرے دن صبح سویرے ہی نایاب ان چھ سات آدمیوں کو لے کر، جو اس کا

چند منٹ بعد ہی گھوڑا ان سے چند گز آگے رک گیا۔

”ٹایاب بی بی۔“ بگے نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بڑے چوہدری صاحب نے کہا ہے کہ آپ حویلی کا رخ کرنے کے بجائے واپس چلی جائیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ اس وقت کوئی بد مزگی پیدا ہو۔“

”اگر میں واپس نہ جاؤں تو؟“ ٹایاب نے اسے گھورا۔

”تو پھر آپ کو روکا جائے گا۔“ بگے نے کہتے ہوئے جب سے ہتھول نکال لیا۔

”تم اپنی اوقات میں رہو گے۔“ قیوم نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”جانتے نہیں کس سے ہٹ کر رہے ہو۔“

”جانتا ہوں۔ اس لئے تو اب تک کچھ کیا نہیں۔ درنہ تم لوگ جانتے ہو کہ میں بات بعد میں کرتا ہوں اور باتوں کو حرکت پہلے دیتا ہوں۔“

”ایک کوشش تو تم پہلے بھی کر چکے ہو۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”میری اس کوشش کا انہماک تم نے دیکھ لیا تھا۔ اب بھی کوشش کر دیکھو۔“ اس نے اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی قدم آگے بڑھا دیا۔

”رک جاؤ۔ ٹایاب بی بی درنہ میں گولی چلا دوں گا۔“ بگہ چیخا۔ اس نے ہتھول والا ہاتھ آگے بڑھا لیا تھا۔

اور پھر اچانک ہی وہ ہوا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ وہ پراسرار بوڑھا نمبلے کماں سے غوردار ہو کر آگے آگیا تھا۔ لگتا جیسے وہ شروع ہی سے ان میں شامل رہا تھا اور اب آگے بڑھ آیا تھا۔

بوڑھے کو دیکھ کر بگے کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ گھوڑا بھی اچانک ہی بدک اٹھا۔ بگے کے ایک ہاتھ میں ہتھول تھا اور دوسرے ہاتھ میں لگام۔ وہ گھوڑے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن گھوڑا بری طرح ہلک رہا تھا۔ وہ زور زور سے جھٹاتا ہوا پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ بگہ گھوڑے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ گھوڑا بری طرح ہل رہا تھا اور جب وہ مڑ کر بھاگا تو بگہ اس پر قابو نہیں رکھ سکا اور نیچے گر گیا۔ اس نے سنبھل کر دیکھا۔ وہ بوڑھا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

بگے نے کیے بعد دیکرے تین گولیاں چلا دیں۔ تینوں گولیاں بوڑھے کے جسم پر

مرف وہی چھ سات آدمی رہ گئے تھے جو اس کی لئے سر دھڑکی پڑی لگانے کو تیار ہو کر نکلے تھے۔

وہ کھیتوں میں پکڑ پکڑی ہر ایک قہار کی صورت میں چل رہے تھے۔ ٹایاب سب سے آگے تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھری تھی جو راستے میں اس نے ٹالی کے ایک درخت سے توڑ لی تھی۔ ٹایاب کے پیچھے قیوم تھا۔ لہا تڑپتے یہ نوجوان گاؤں کے اعلیٰ کا بیٹا تھا۔ اس کی عمر پچیس چھیس سال رہی ہوگی۔ بڑا گھبرو جوان تھا۔ نوٹھ برش ٹائپ کی بھاری مونچھوں نے اس کے چہرے کو بڑا بارعب بنا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاشی تھی۔ وہ چوہدری حسن دین کی زمینوں سے نکل کر چوہدری امانت علی کی اراضی میں داخل ہو گئے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کارندے مڑ مڑ کر حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ وہ لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلتے رہے۔ حویلی اب دور سے نظر آنے لگی تھی۔ وہ لوگ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، ٹایاب کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ وہ دو مرتبہ اس حویلی میں جا چکی تھی۔ اسے اگرچہ کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن دونوں مرتبہ کچھ پراسرار اور حیرت انگیز قسم کے واقعات پیش آئے تھے۔ پہلی مرتبہ جب وہ لڑکی کی لاش کے قریب کھڑی تھی تو اسے وہ پراسرار سرگوشیاں سنائی دی تھیں اور دوسری مرتبہ اس پراسرار بوڑھے نے اسے چوہدری سعادت اور بگے کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچایا تھا۔ ان باتوں سے ٹایاب اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ حویلی میں رہنے والی روح اور وہ پراسرار بوڑھا جو اس کے خیال میں نور دین موچی کی روح تھی، اس سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

وہ لوگ ابھی حویلی سے دور ہی تھے کہ ایک گھڑ سوار کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ٹایاب رک گئی۔ اس کے پیچھے آنے والے لوگ بھی رک گئے۔ ٹایاب اس گھڑ سوار کی طرف دیکھنے لگی جو ابھی تین چار کھیت دور تھا۔ وہ کھیتوں میں گھوم کر سامنے کے رخ پر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا جیسے وہ ان کا راستہ روکنا چاہتا ہو۔ ٹایاب غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چوہدری سعادت ہوگا۔ لیکن گھوڑا ذرا قریب آیا تو پتہ چلا کہ وہ سعادت نہیں بگہ تھا۔

”نہیں چھوٹی بی بی۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم یہاں آکر آپ کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔“ قیوم نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو سمجھانے لگا کہ وہ بزدلی کا مظاہرہ نہ کریں۔ مگر دیلا اور فقیر حسین نہیں مانے اور واپس چلے گئے۔

نایاب کے ساتھ اب پانچ آدمی رہ گئے تھے۔ وہ لوگ حویلی کی طرف چلنے لگے۔ بے پرہیزگارہ تھیل کے ایک درخت کے نیچے رک گئے۔ وہ سب عجیب سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ہر طرف وہ کا عالم طاری تھا۔ ہوا بند تھی اور درختوں کا ایک پتا تک ہلکا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔

نایاب بھی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ہوا بند ہونے کے وجہ سے فضا پر گھٹن سی طاری تھی۔ سینے سے تر قیض نایاب کے جسم سے چپکی ہوئی تھی اور ہستا ہوا پھینک یوں لگ رہا تھا جیسے جسم پر کینچروں سے لپکتا رہے ہوں۔

وہ لوگ گھوم کر حویلی کے چھانک کی طرف آگئے۔ چھانک میں داخل ہوتے ہوئے نایاب کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی تھی۔ اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان سب کے چروں پر خوف نمایاں تھا۔

نایاب انہیں اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ خشک جھانڈیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ جھانڈیوں میں چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ قیوم وغیرہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے ہتھیار اس طرح سنبھال رکھے تھے جیسے کسی ناممکن صورتحال کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔

برآمدے میں پہنچ کر وہ رک گئے۔ ہوا اب بھی بند تھی لیکن یہاں گھٹن کا احساس زیادہ نہیں تھا۔ نایاب نے قیوم وغیرہ کی طرف دیکھا۔ وہ سب خوفزدہ سی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں ایک دو کی کیفیت تو ایسی تھی جیسے کسی بھی لمحہ بھاگ کھڑے ہوں گے۔

نایاب دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کے اوپر والے کھنڈے کی زنجیر بھی ہوئی تھی۔ نایاب کو یاد تھا کہ اس روز جب وہ سکندر کے ساتھ حویلی سے باہر نکلے تھے تو ان میں سے کسی نے بھی کھنڈہ نہیں لگایا تھا۔

لگیں لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

خوف و دہشت سے ہٹنے کے چرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ وہ اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ بوڑھا اپنے تلے قدم اٹھاتا ہوا اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ بگاہری طرح خوفزدہ تھا۔ ہسٹل بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں گر گیا تھا۔ وہ گھوم کھا کر گرا۔ کئی قلابازیاں کھائیں۔ پھر سنبھل کر پیچھے دیکھا اور ایک بار پھر بھاگ کھڑا ہوا۔

نایاب کے پیچھے کھڑے ہوئے قیوم اور اس کے ساتھی یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چروں پر خوف کے تاثرات بھی تھے۔ انہیں حیرت اس بات پر بھی تھی کہ وہ بوڑھا ان کے درمیان سے نکل کر گیا تھا۔ بوڑھے کو دیکھ کر گھوڑا بھی بدک گیا تھا اور بگاہری مارے ڈر کے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ مزید برآں ہٹنے کے اس بوڑھے پر تین گولیاں چلائی تھیں مگر بوڑھے پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

بگاہری بھی بھاگا جا رہا تھا۔ بوڑھا اس کے پیچھے تھا اور پھر بگاہری کھیتوں میں بہت دور نکا ہوں سے اوجھل ہو گیا۔ بوڑھا اب بھی گھنڈی پر جاتا ہوا نظر آ رہا تھا اور پھر دفعتاً وہ اس طرح غائب ہو گیا جیسے وہاں میں تحلیل ہو گیا ہو۔

نایاب نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ یوں تو سب ہی کے چروں پر خوف نظر آ رہا تھا۔ لیکن جیلے اور فقیر حسین کی حالت تو بہت خیر ہو رہی تھی۔ وہ دونوں خوف سے تھر تھرا کپ رہے تھے۔

”کیا ہوا تم لوگوں کو..... کس بات سے ڈر رہے ہو؟“ نایاب نے کہا۔

”وہ بڑھا چھوٹی بی بی۔“ فقیر حسین بولا۔ خوف سے اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ ”وہ انسان نہیں ہے۔ وہ تو کوئی بد روح ہے۔“

”لیکن اس نے ہمیں تو کچھ نہیں کہا۔ تم کیوں ڈر رہے ہو۔“ نایاب نے اسے تسلی دی۔

”نہیں چھوٹی بی بی۔ ہم اس حویلی میں نہیں جائیں گے۔ ہم واپس جا رہے ہیں۔“ اس مرتبہ شعلے زبان کھولے۔ اس کی آواز بھی کپکپا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ نایاب نے ساٹ لیپے میں کہا۔ ”تم میں سے جو واپس جانا چاہے چلا جائے۔ اگر کوئی میرے ساتھ جانے کو تیار نہیں تو میں اکیلی جاؤں گی۔“

پچھے چل رہا تھا اور متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ راہداری کے گرد آلود فرش پر قدموں کے کچھ نشان بھی نظر آرہے تھے۔
 ”ہم سے پہلے بھی یہاں کوئی آیا ہے چھوٹی بی بی۔“ قوم نے فرش پر قدموں کے نشانات کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کل میں اور سکندر بھائی یہاں آئے تھے۔ یہ ہمارے ہی قدموں کے نشان ہیں۔“
 ثایب نے کہا۔ ”ڈرو نہیں۔ میرے ساتھ چلتے رہو۔ تم کسی بری نیت سے یہاں نہیں آئے۔ اگر یہاں دھوکا دینا ہے بھی تو وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گی۔“
 وہ دوسری راہداری میں مڑ گئے۔ ابھی دو تین قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ ٹھٹک کر رک گئے۔ کوئی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ خانے میں چرچاہٹ کی یہ آواز بڑی پراسرار تھی۔ قوم کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے اور پھر دھڑکی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔

ثایب بھی سسم گئی تھی۔ وہ تاراج کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر قوم کو اشارہ کرتے ہوئے آگے چلتے گئی۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ دوسری راہداری میں مڑ گئی اور اس کمرے کے سامنے رک گئی جہاں اس روز وہ داخل ہوئی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ ثایب نے جیسے ہی ہاتھ آگے بڑھایا، دروازہ چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

”چھوٹی بی بی۔ اندر کوئی ہے۔“ قوم نے کہا۔ اس کا لبہ کپکپا رہا تھا۔ اس نے لاشی کو حملہ آور انداز میں دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا تھا۔

”نہیں۔ اندر کوئی نہیں ہے۔ دروازہ ہوا سے کھل گیا ہے۔ ڈرو نہیں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“ ثایب نے کہا اور دروازے کو پوری طرح کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ پچھلے دو تجربات سے اگرچہ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ اس حویلی میں رہنے والی روہیں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی لیکن انجانا سا خوف اس کے دل میں بھی تھا۔

قوم بھی اگرچہ خوفزدہ تھا لیکن وہ واقعی بڑی ہمت سے کام لے رہا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اسے کپکپی کا چھ جھٹکا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے بھول کر برف خانے میں آ گیا ہو۔

اندر واسلے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ ثایب نے وہ دروازہ اپنے ہاتھ سے کھولا

ثایب دروازے کے قریب بچ کر رک گئی اور بچوں کے بل کھڑے ہو کر کھڑے کی زنجیر ہٹانے لگی۔ زنجیر کھڑے سے نکل کر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دروازے پر لگی۔ دروازے سے زنجیر کے گھرانے کی آواز اس خانے میں بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ وہ سب اچھل پڑے۔

ثایب بھی اچھل کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اس نے خوفزدہ سی نظروں سی ادھر ادھر دیکھا۔ قوم اور اس کے سامنے ساتھی اپنے اپنے ہتھیار اٹھائے اس طرح تیار کھڑے تھے جیسے ابھی کوئی اندر سے برآمد ہوگا تو وہ اس پر حملہ کر دیں گے۔ ان سب کے چروں پر خوف کے تاثرات بھی نمایاں تھے۔

ثایب دوبارہ دروازے کے قریب آگئی۔ اس نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور دروازے کے ایک ہنٹ کو دھکا دینے لگی۔ دروازہ چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھوٹکا ان کے چروں سے گرایا اور وہ کانپ اٹھے۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا چھوٹی بی بی۔“ قوم بھی لاشی سنبھالتا ہوا آگے بڑھ آیا۔ اس کے باقی ساتھی وہیں کھڑے رہے تھے۔

ثایب نے کندھے پر لگے ہوئے قبیلے سے تاراج نکال لی اور دروازے میں داخل ہو گئی۔ وہ ضرورت کی کچھ چیزیں ساتھ لے کر آئی تھی۔ صبح جب وہ گھر سے نکلے گئی تھی تو سکندر نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اسے آج بڑے ملک صاحب کو نور پور لے جانا تھا تاکہ ڈاکٹر سے ان کا کھل چیک اپ کرایا جاسکے۔ اس نے تو کہا تھا کہ ثایب آج کا پروگرام ملتوی کر دے۔ کل وہ خود اس کے ساتھ جائے گا لیکن ثایب نہیں مانی تھی کہ آج کا کام کل پر چھوڑا جائے۔

حویلی کا برآمدہ مٹھلی رخ پر تھا۔ اس لئے سورج کی روشنی اندر نہیں پہنچ رہی تھی۔ دروازے کے قریب تو دم سا اجالا تھا، اس سے آگے تاریکی تھی۔ ثایب نے قدم اندر رکھتے ہی تاراج روشن کر لیا تھی۔

قوم کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ لاشی سنبھالے ثایب سے ایک قدم

”یہ.... یہ کیا تھا چھوٹی لی لی۔“ قیوم ہلکایا۔
 ”بیرا خیال ہے یہ اس لڑکی کی روح تھی جس کی لاش میں نے اس کمرے میں دیکھی تھی۔“ ٹایاب نے کہا اور پھر چند لمحوں کا خاموشی کے بعد بولی۔ ”میں نے کہا تھا تاکہ اس حویلی میں رہنے والے دو بھی ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔“
 وہ دونوں راہداری میں نکل آئے۔ اسی لمحے کوئی دروازہ چرچہاٹ کی آواز کے ساتھ کھلنے لگا اور پھر دڑے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ قیوم یہ آواز سن کر اچھل پڑا تھا۔
 ”کچھ نہیں ہے۔ ڈرو نہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔“ ٹایاب نے کہا۔
 وہ دونوں حویلی میں گھومنے لگے۔ ٹایاب پہلے دو مرتبہ یہاں آچکی تھی لیکن دونوں مرتبہ وہ اسی کمرے تک گئی تھی۔ پوری حویلی میں گھومنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور اب اس کا حوصلہ کچھ بڑھ گیا تھا۔

اس حویلی میں کئی راہداریاں اور ہر راہداری میں کئی کئی کمرے تھے۔ ٹایاب نے وہ راہداریوں میں گھوم کر تین چار کمرے کھول کر دیکھے۔ تمام کمرے خالی تھے۔ فرش پر کئی کئی اچ کر دی گئیں جو بھی تھیں۔

ایک کمرے میں داخل ہو کر وہ رک گئے۔ قیوم کا حوصلہ بھی اب کچھ بڑھ گیا تھا۔ خوف بڑی حد تک اس کے دل سے نکل گیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں لاشی پکڑے ٹایاب کے قریب کھڑا تھا۔ ٹایاب ٹارچ کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی ایک الماری پر رک گئی۔ الماری دیوار میں بیٹھ ہوئی تھی۔ اس کا ایک پٹ بند تھا اور دوسرا آرمے کے قریب کھلا ہوا تھا۔ ٹایاب الماری کے سامنے آکر رک گئی۔ قیوم بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

ٹایاب نے ٹارچ ہائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور دائیں ہاتھ سے الماری کا خیم وا دروازہ کھول دیا۔ الماری کے اس حصے میں تین شیٹ تھیں۔ تینوں خالی تھیں اور گرد کی مٹیں جی ہوئی تھیں۔ ٹایاب نے دوسرا دروازہ کھولنے کے لئے پینڈل پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ دروازہ جام تھا۔ اس نے زور دار جھٹکا دیا۔ دروازہ کھل گیا اور اس کے ساتھ ہی ٹایاب کے منہ سے خونخاک چچ نکلی۔ قیوم بھی جلد اس کے ساتھ

ٹارچ ٹایاب کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گئی تھی۔ فرش پر پڑی ہوئی ٹارچ کا رخ

اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ ٹایاب ٹارچ کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ گرد آلود فرش پر اس کے اور سکندر کے قدموں کے نشان تھے۔ دیواروں کے کونوں میں مگزیوں کے جالے لٹکے ہوئے تھے اس کے علاوہ کمرے میں ایک تنکا تک نہیں تھا۔

”چھو..... چھوٹی لی لی۔ وہ۔ وہ دیکھیں۔“

قیوم کی پکیکائی ہوئی آواز سن کر ٹایاب اس طرف مڑ گئی۔ کمرے کا وہ کونہ جہاں اس روز اس نے مسمیٰ پر اس لڑکی کی لاش دیکھی تھی، بھی خالی تھا اور وہاں سے چھوٹے چھوٹے چٹکتے ہوئے ذرات اوپر کی طرف اٹھتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ فرش سے اٹھنے والے ان چٹکتے ذرات کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہیں تھی لیکن ان کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ ٹایاب اور قیوم متوحش نظروں سے ان چٹکتے ذرات کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی تعداد میں جیسے جیسے اضافہ ہو رہا تھا، کمرے کی فضا میں سردی بڑھتی جا رہی تھی۔

ان چٹکتے ذرات کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی اور پھر فضا میں رقص کرتے ہوئے وہ چٹکتے ذرات ایک مجسم صورت اختیار کر گئے۔

وہ ایک عورت کا مجسمہ تھا جو زمین سے تقریباً ”ایک فٹ اوپر فضا میں معلق تھا۔ ذرات پتک رہے تھے۔ ٹایاب اور قیوم متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ قیوم لاشی کو اس طرح پکڑے کھڑا تھا۔ جیسے وہ کسی بھی لمحہ روشنی کے اس مجسمے پر حملہ کر دے گا۔ پھر فضا میں معلق وہ مجسمہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔ قیوم نے لاشی اوپر اٹھائی۔

”کوئی حرکت مت کرنا۔“ ٹایاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

قیوم نے لاشی نیچے جھکا لی اور پہلی جگہ سے روشنی کے اس مجسمے کی طرف دیکھنے لگا۔ روشنی کا وہ مجسمہ اس سے دو فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ وہ چند سیکنڈ تک فضا میں معلق رہا پھر ان دونوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے دروازے کی طرف لپکے۔ دوسرے کمرے میں آتے ہی وہ رک گئے۔ وہ چٹکتے ذرات ابھانک ہی غائب ہو گئے تھے۔ ٹایاب بیرونی دروازے کی طرف لپکی۔ راہداری بھی سنسان پڑی تھی۔ وہ چٹکتے ذرات اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے ان کا وجود ہی نہ رہا

الماری کی طرف تھا اور روشنی میں وہ انسانی ڈھانچہ نظر آ رہا تھا جو الماری میں سے ٹایاب کے اوپر گرا تھا۔

ٹایاب پہنی پہنی سی نظروں سے الماری کے سامنے فرش پر پڑے ہوئے اس ڈھانچے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔

قیوم کے چہرے پر بھی بارہ بج رہے تھے۔

وہ انسانی ڈھانچہ مگر کبھر گیا تھا۔ اس کی کھوپڑی سیدھی پڑی تھی جسے دیکھ کر ہی خوف آ رہا تھا۔

”یہ... یہ کون ہے چھوٹی بی بی۔“ قیوم ہکلا یا۔ ”مم۔ میرا مطلب ہے کس کا ڈھانچہ ہے؟“

”ہوگا کوئی مظلوم جسے قتل کر کے اس الماری میں بند کر دیا گیا۔“ ٹایاب نے جواب دیا اور تاراج کی روشنی میں الماری کے اندر دیکھنے لگی۔ الماری کا یہ خاندان اوپر سے نیچے کے رخ پر لہا تھا۔ اس میں کوئی شیت نہیں تھا اور ایک آدمی آسانی سے اس کے اندر کھڑا ہو سکتا تھا۔ الماری کے فرش پر بھی گرد جمی ہوئی تھی۔

ٹایاب ایک بار پھر اسی ڈھانچے کو دیکھنے لگی۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ یہ ڈھانچہ بے لباس تھا۔ اگر دیکھی کسی کو قتل کر کے الماری میں بند کیا گیا ہوتا تو اس کے جسم پر لباس ضرور ہوتا۔ لیکن یہ ڈھانچہ بے لباس تھا جس کا مطلب تھا کہ برہنہ لاش کو الماری میں بند کر دیا گیا تھا۔ الماری اور ڈھانچے کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ شاید برسوں پہلے کی بات ہوگی۔ پچاس سال، ساٹھ سال یا ستر سال پہلے کی۔ لیکن یہ ڈھانچہ کس کا تھا۔ کسی مرز کا یا عورت کا؟

ٹایاب کی آنکھوں کے سامنے اس عورت کی لاش گھوم مچی جو کڑھنہ روز اس نے دوسرے کمرے میں دیکھی تھی۔ وہ لاش بھی برہنہ تھی۔ تو کیا یہ ڈھانچہ بھی اسی عورت کا تھا؟ ایک ڈھانچے کو دیکھ کر اس کی جنس کا اندازہ لگانا ٹایاب کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس کا فیصلہ تو کوئی باہر ہی کر سکتا تھا۔

وہ دونوں کچھ دیر تک اس کمرے میں کھڑے رہے پھر باہر آ گئے۔ قیوم کے دل میں جو خوف ابھرا تھا اس پر اب وہ قابو پا چکا تھا۔ وہ ٹایاب کے ساتھ حویلی کی راہداریوں اور

کمروں میں گھومتا رہا۔ ٹایاب تمام کمروں کے دروازے کھولتی چلی گئی تھی۔

”اب تیس اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہاں ہم لوگوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ ٹایاب نے قیوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب دوسروں کو بھی اندر بلا لیا جائے تاکہ ان کا خوف بھی دور ہو جائے۔“

”میں بلا کر لانا ہوں۔“ قیوم نے کہا۔

اور پھر کچھ دیر بعد دوسرے آدمی بھی اندر آ گئے۔ پہلے تو وہ کچھ دیر تک ڈرے سے رہے پھر رفتہ رفتہ ان کا خوف بھی دور ہونے لگا۔ وہ سب لوگ حویلی میں گھوم پھر کر دیکھتے رہے۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں وغیرہ کھول دی گئی تھیں ان سے تازہ ہوا اور روشنی اندر آنے لگی تھی۔

یہ حویلی دو منزلہ تھی۔ اوپر کی منزل پر جانے کے لئے بیڑھیاں دائیں طرف ایک کشادہ ڈیوڑھی میں تھیں۔ اس ڈیوڑھی سے ایک دروازہ اندر کی طرف بھی کھلتا تھا۔ اس دروازے کو بند کر کے حویلی کے نیچے والے حصہ کو الگ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن وہ دروازہ کھلا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس حویلی میں ایک ہی خاندان کی رہائش تھی اور کینٹوں کی اوپر نیچے آمدورفت تھی۔

ٹایاب اوپر والی منزل پر گئی۔ قیوم اور اپنی بخش بھی اس کے ساتھ تھے۔ اوپر بھی تمام کمرے خالی تھے اور فرش پر گرد کی کئی کئی اونچ تہ جمی ہوئی تھی۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے کھول دیے گئے۔ ہوا اور روشنی کی آمدورفت سے حویلی کی فضا تازہ تر ہو گئی۔

وہ لوگ تقریباً دو گھنٹوں تک حویلی میں رہے۔ ٹایاب حویلی کا جائزہ لیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ رہائش اختیار کرنے کی صورت میں یہاں کیا کچھ کرنا ہوگا۔ اس حویلی میں بجلی نہیں تھی۔ گاؤں کی طرف جانے والی بجلی کی لائن حویلی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ذرا سی بھاگ دوڑ سے کنکشن تو مل سکتا تھا لیکن حویلی میں وانگرن، صفائی اور مرمت وغیرہ کے لئے کئی روز درکار تھے۔ حویلی کی حالت خاصی خستہ تھی اور اس کی مرمت دو چار روز میں نہیں ہو سکتی تھی۔

”چھوٹی بی بی۔ اب بھلیں۔ اب تو یہاں کچھ نہیں ہے۔“ قیوم نے اس کے قریب

اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔
 ”کیوں بھیجی جیلو! اب تو تم لوگوں کو یہاں کوئی ڈر نہیں لگے گا؟“
 ”نہیں قیوسے۔“ انہی بخش نے کہا۔ ”مگنا ہے یہاں رہنے والے بھوت چھوٹی بی بی کو دیکھ کر بھاگ گئے ہیں۔“

”میں ان سے بڑی بھوت ہوں۔“ ٹایاب نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”چلو اب چلیں۔“
 وہ لوگ جھاڑیوں میں چلتے ہوئے چوٹی کے چھانک سے باہر آگئے۔ اس وقت ہوا چل رہی تھی۔ وہ لوگ درختوں کے نیچے آکر رک گئے۔ درختوں کے ٹھنڈے سائے میں چروں سے گرانے والی ہوا بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ وہ لوگ کچھ دیر وہاں کھڑے رہے پھر مے سے اترنے لگے۔

”چھوٹی بی بی۔ وہ دیکھیں۔“ انہی بخش نے رک کر ایک طرف اشارہ کیا۔
 ٹایاب بھی رک کر اس طرف دیکھنے لگی۔ پانچ چھ کیتوں کے فاصلے پر پکا کین کے ایک درخت کے نیچے تین گھڑ سوار کھڑے تھے۔ وہ لوگ اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود ٹایاب نے سفید گھوڑے والے کو پہچان لیا تھا۔ وہ چوہدری سعادت تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر شاید بگا تھا اور تیسرے گھوڑے والے کو وہ نہیں پہچان سکی تھی۔

”یہ لوگ کوئی گزربز نہ کریں چھوٹی بی بی۔“ قیوم نے کہا۔
 ”کوئی گزربز نہیں کرتے۔ میرے ساتھ آؤ تم لوگ۔“ ٹایاب نے کہا اور بچے سے نیچے اترنے لگی۔

وہ تینوں گھڑ سوار پکائن کے درخت کے نیچے کھڑے رہے۔ ٹایاب اور قیوم وغیرہ کیتوں کے درمیان گڈبڈیوں پر چلتے رہے۔ وہ تقریباً ایک کیمت کے فاصلے سے گزر گئے۔ سعادت وغیرہ اب بھی اپنی جگہوں سے نہیں ہلے تھے۔ البتہ وہ تینوں گھڑ سواروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”بھونے چوہدری کے ارادے خطرناک لگتے ہیں چھوٹی بی بی۔“ انہی بخش نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”اب کے خلاف تو وہ شاید کچھ نہ کرے لیکن ہمیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کرے گا۔“

آکر کہا۔
 ”یہاں تو پہلے بھی کچھ نہیں تھا۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”بہر حال“ چلو اب واپس چلیں۔“

ٹایاب نے کروں کی کڑکیاں وغیرہ کھلی رہنے دی تھیں البتہ پھیلی طرف کے دروازے بند کروا دیئے تھے۔ برآمدے میں آکر اس نے وہ دروازہ بھی بند کر دیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ اس وقت دوسرے دوڑی تھی۔ تیز دھوپ میں آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ کافی دیر بعد آنکھیں تیز روشنی سے مانوس ہوئیں تو وہ گہری نظروں سے اوجھڑا دھڑکا جائزہ لینے لگی۔ چوٹی کا صحن بہت وسیع و عریض تھا۔ ہر طرف خشک جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف آم کے دو تین بیڑے تھے۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے وہ بیڑے بھی سوکھ چکے تھے۔ بائیں طرف دیوار کے قریب پتیلی کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ اس کا تاج بھی پھیلا ہوا تھا۔ اس درخت کی چند شاخوں پر کچھ پتے نظر آرہے تھے۔ جبکہ باقی شاخیں سوکھی ہوئی تھیں۔

چوٹی کی چار دیواری خاص اونچی تھی۔ دیواریں کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں جن پر گارے کا پستر تھا جو جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ ایک دو جگہوں سے دیواروں کے اوپر کے کچھ حصے ٹوٹ چکے تھے۔

چوٹی کا گیٹ بہت بڑا تھا۔ اس کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا اور دوسرا بھی اپنی جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ وہ گیٹ مکمل طور پر تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔

”قیوم۔“ وہ مڑ کر قریب کھڑے ہوئے قیوم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”جیسے معلوم ہے میں اس چوٹی میں رہائش اختیار کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن اس سے پہلے اس کی صفائی کی ضرورت ہے۔ چوٹی کی مکمل صفائی اور مرمت میں تو ایک مہینے سے بھی زیادہ کا عرصہ لگے گا۔ لیکن کام شروع کیا جائے گا تو پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔“
 ”آپ ٹھیک کہتی ہیں چھوٹی بی بی۔“ قیوم نے کہا۔ ”کوئی کام شروع کیا جائے تو پورا ہوتا ہے نا۔ جب کام شروع ہی نہ ہو تو پورا کیسے ہوگا۔“

”ہاں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ صفائی وغیرہ کام کل ہی سے شروع کر دیا جائے۔“
 ”ٹھیک ہے بی بی جی۔ میں انہی لوگوں کو لے کر صبح یہاں آجاؤں گا۔“ قیوم نے

آری ہو۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلو۔ میں تمہارے لئے کھانا نکالتی ہوں۔“

”کھانا۔ ہاں بھوک تو لگ رہی ہے۔ تم لوگ کھا چکے کیا؟“ ثایاب بولی۔

”ہاں تھوڑی دیر پہلے ہی کھایا ہے۔“ زمرس کہتے ہوئے اٹھ کر بچن کی طرف چلی گئی۔

ثایاب نے کمرے میں آکر اپنے دھلے ہوئے کپڑے اٹھائے اور غسل خانے میں کمرس گئی۔ جب وہ اپنا علیہ درست کر کے باہر نکلی تو ماسی مہراں وغیرہ جا چکی تھیں۔ ثایاب برآمدے ہی میں سکیئہ کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ زمرس نے کھانا ان کے سامنے لاکر رکھ دیا اور ثایاب ان سے باتیں کرتے ہوئے کھانا کھانے لگی۔



”گمراہ نہیں۔ میں تم لوگوں کے ساتھ ہوں۔ اگر وہ ایسی کوئی حماقت کرے گا تو میں نہٹ لوں گی اس سے۔“ ثایاب نے کہا۔

وہ لوگ گاؤں پہنچ گئے۔ قیوم وغیرہ تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور ثایاب ملک صاحب کی حویلی میں آگئی۔ گاؤں کی تین چار عورتیں بھی حویلی موجود تھیں۔ ثایاب کو دیکھ کر ان سب کے چروں پر رونق سی آگئی۔

شعر ہے چھوٹی بی بی! تم خیریت سے آگئیں۔ ہمیں تو تمہاری طرف سے ڈر لگا ہوا تھا۔“ ماسی مہراں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ڈر کس بات کا ماسی! ثایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی حماز جنگ پر مسمی ہوئی تھی۔“

”ارے بیٹی۔ جیلے اور فقیر حسین ڈر کر واپس آگئے تھے۔ باب انہوں نے گاؤں میں آکر بتایا تھا کہ بگے نے تم لوگوں کا راستہ روکا تھا اور پستول بھی نکال لیا تھا لیکن ایک بوڑھا بابا اچانک بنی کہیں سے آگیا جسے دیکھ کر بگے کا گھوڑا بھی بھڑک کر بھاگ اٹھا اور بگے بھی ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ بوڑھا کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ وہ دونوں قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے پہلے اس بوڑھے کو اپنے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ کوئی بد روح تھی یا کوئی ہوائی چیز۔ اسی لئے تو وہ دونوں ڈر کر واپس بھاگ آئے تھے۔“

”دیکھ بھی نہیں تھا ماسی۔“ ثایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ تو میں نے بگے کو آنکھیں دکھائی تھیں تو وہ ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ میرے ساتھ تو قوم اور اہی بخش وغیرہ بھی تھے۔ وہ سب لوگ خیریت سے اپنے گھروں کو پہنچ گئے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان سے جا کر پوچھ لیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہے اس حویلی میں۔“

”رب تمہیں حیا کی دے بیٹی۔“ ماسی مہراں نے کہا۔ ”ان چوہدروں کی غیرت ہی پتہ نہیں کیوں مر گئی ہے۔“

”بس یہی دعا کرو کہ رب انہیں غیرت دے۔“ ثایاب نے کہا اور پھر زمرس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”انکل کی طبیعت کیسی ہے؟“

”سکندر بھائی انہیں نور پور‘ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔“ زمرس نے جواب دیا۔ ”تمہارا علیہ کیسا ہو رہا ہے۔ جیسے مٹی میں لوٹ کر